اسلامی جمہوریت

مولانا رئیس احمد جعفری

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ، لاہور، پاکستان

اسلامی جمہوریت

تالیف

مولانا سید رئیس احمد جعفری (ندوی)

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ، لاہور

طبع اوّل .. .. .. جون ۱۹۶۸ء

تعداد .. .. .. ایک ہزار

محمد اشرف ڈار (سکریٹری) نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر
ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے لیے شائع کیا

انتساب

ممتاز حسن سابق سکریٹری فنانس حکومت پاکستان کے نام

پیش لفظ

(سیّد محمد ظفر صاحب وزیر قانون حکومت پاکستان کے قلم سے)

سیّد رئیس احمد جعفری کی زیر نظر کتاب جمہوریت کو ایک اعلیٰ اور ارفع انسانی سوسائٹی کی بلندیوں سے دیکھتی ہے یعنی کتاب کا اصل مقصد وہ سوسائٹی ہے جس کے لیے جمہوریت کو وہ ایک ذریعہ اور آلہ سمجھتے ہیں، اور بات بھی یونہی ہونی چاہیے۔ حکومت کیوں قائم ہوتی ہے۔ اس کا جواب بڑی تفصیل سے مفکرین اور ماہرانِ سیاسیات نے دیا ہے۔ "جمہوریت اسلام میں" اس سوال کا جواب ایک اور انداز سے جعفری صاحب نے دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حکومت خدا کے دین کے مطابق سوسائٹی کو بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ اب یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان اصولوں پر معاشرے کی بنیاد قائم کرے، جن سے عوام کی مالی، جسمانی اور روحانی بہبودی حاصل ہو سکے۔

یہی وجہ ہے کہ مصنف نے اسلام میں کسی سکہ بند قسم کے نظام کو جمہوری قرار نہیں دیا۔ کیسا بھی نظام یا طرزِ حکومت ہو لیکن اگر اس میں امت کے خیالات معلوم کرنے اور اس کے مجموعی مشورے سے استفادہ حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہوں — اور احکام دینی کی پابندی شرطِ اوّل ہو تو جمہوریت ہے — سیّد رئیس احمد جعفری اس جمہوریت کو بے معنی سمجھتے ہیں جو صرف حکومت چلانے میں مدد دے لیکن معاشرے کو درست نہ کر سکے۔ چنانچہ ان کے ذہن میں جو سوسائٹی ہے اس کا فرد پاک نہاد، رحم خو، نیک، ناپ تول ٹھیک رکھنے والا، ہمسائے کا ہمدرد، چوری اور زنا سے بھاگنے والا ہوتا ہے اور اس کی انھوں نے بہت سے ایمان افروز مثالیں دی تھیں۔ مثالوں کا یہ مجموعہ کافی مفید اور مناسب ہے۔

اس لحاظ سے زیر نظر کتاب یقیناً لوگوں کے لیے دلچسپ اور فکر آفرین ثابت ہوگی۔ جعفری صاحب نے اس کتاب میں جو مواد پیش کیا ہے اس سے ان کی محنت اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک وقیع کارنامہ ہے اور دوسرے اہلِ علم اور اہل نظر کے لیے دعوتِ فکر بھی۔

اس کتاب کا بنیادی اور افادی باعث یہ ہے کہ معاشرے کا تعلق حکومت اور حکومت کا تعلق معاشرے سے کیا ہونا چاہیے۔ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ مصنف نے اسے خوبی اور اسلامی ذہن کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کر کے وقت کی ایک بڑی ضرورت کی طرف نشاندہی کی ہے۔

سیّد محمد ظفر

راولپنڈی

مورخہ ۹ رمئی ۱۹۶۷

افتتاحیہ

عہدِ حاضر میں جمہوریت کے مداحوں اور ثنا خوانوں کی تعداد حدِ شمار سے خارج ہے۔ جمہوریت کی تائید و تحسین وقت کی ایک ایسی ناگزیر ضرورت بن گئی ہے کہ جن ملکوں میں جمہوریت کو داخل ہونے کی اجازت نہیں، اور جن حکومتوں کا وجود جمہوریت کی نفی ہے، وہ بھی جمہوریت کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

اصل میں جمہوریت کا لفظ اتنا ہمہ پہلو ہے اور اس میں اتنی زیادہ لچک ہے کہ بیک وقت دستۂ گل اور خارِ دامن، دونوں پر نہایت آسانی سے اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے "سیکولرزم" ہے۔ دنیا کی ۹۹ فیصد حکومتوں کا آئین و دستور سیکولر ہے، اور وہاں دستوری طور پر غیر مذہب کی اقلیتوں کو مکمل ترین شہری حقوق و مراعات اور مساوات کی نعمت حاصل ہے، لیکن عملاً شاذ ہی یہ چیز کہیں موجود ہو۔ کسی چیز کا وجود یا عدم وجود صرف قرطاس و قلم کا رہینِ منت نہیں ہوتا، وہ اپنے ساتھ عمل کی میزان اور تائید کا بھی جویا رہتا ہے، اور اس معیار سے اگر جمہوریت کو دیکھیے اور پرکھیے تو ماننا پڑے گا۔ "ہر چند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے"۔!

اس وقت سے کہ جمہوریت کا لفظ ابھی سیاسیات کے لغت میں شامل نہیں ہوا تھا، اور اسے کوئی اصطلاحی حیثیت بھی حاصل نہیں ہوئی تھی، اور اس کا مفہوم و تصور بھی معروف نہیں ہوا تھا، دنیا میں صرف ایک قوم۔

مسلمان ایسی ہے جس نے علمی اور عملی طور پر جمہوریت کا مرقع دنیا کے سامنے پیش کر کے اسے محوِ حیرت کر دیا۔ جب دنیا شہنشاہیت، استعمار اور آمریت کے سوا کسی نظامِ حکومت سے واقف نہ تھی، اسلام نے اپنے ماننے والوں میں جمہوریت کچھ اس طرح راسخ کر دی کہ بعض دینی معاملات تک اس کے حیطے میں آ گئے۔ مثلاً اجماع اور اکثریت کی بالادستی ید اللہ علی الجماعۃ، اور من شذ شذ فی النار کہہ کر قائم کر دی اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم تک پر شوریٰ لازم قرار دیا، اور غیر دینی معاملات پر آپ نے ہمیشہ اس کا احترام فرمایا۔

اُردو زبان میں جمہوریت اور اس سے متعلقہ عنوانات پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں سے اکثر مغربی جمہوریت کی ترجمان اور نقیب ہیں، کچھ کتابیں اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر بھی لکھی گئی ہیں کہ مسلم جمہوریت، یا اسلامی جمہوریت کیا ہے؟ اور کیا ہونی چاہیے؟ اور اسے کس طرح بروئے کار لایا جا سکتا ہے؟ لیکن یہ کتابیں زیادہ تر جماعتی نقطۂ نظر کو ملحوظِ خاطر رکھ کر لکھی گئیں۔ یعنی جس آدمی کا جس سیاسی یا مذہبی جماعت سے تعلق ہوا۔ اس کے مسلک، منہاج، مقصد اور پروگرام کو سامنے رکھ کر کتاب لکھ دی، بعض کتابیں علمی اور تحقیقی اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتیں، لیکن جماعتی مزاج کی آمیزش ان میں بھی نظر آتی ہے۔

میرا کسی جماعت سے تعلق نہیں ہے، نہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اصطلاحی معنوں میں بجائے خود کوئی جماعت ہے۔ یہ ایک خالص علمی اور تحقیقی ادارہ ہے اور دوسرے تمام موثرات وعوامل سے قطع نظر کر کے صرف اور صرف خالص اسلامی نقطۂ نظر کی جستجو میں اس کا قافلۂ فکر ونظر رواں دواں ہے لہٰذا اس موضوع پر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کو سب سے زیادہ حق تھا کہ تحقیق کرے اور جو بات نتھر کر اور نکھر کر سامنے آئے، اسے اہلِ علم ونظر کے سامنے

رکھ دے۔ یہ ذمے داری مجھے سونپی گئی۔ کئی سال کی مسلسل تحقیق و جستجو کے بعد یہ تالیف تیار ہو سکی ہے۔

کسی انسانی کوشش کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہر جہت سے مکمل ہے، اور ہر نقطۂ نظر سے حرف آخر ہے۔ اس میں غلطیاں اور کوتاہیاں ہو سکتی ہیں۔ اگر اصحاب علم و فضل کی طرف سے میری غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی کی گئی تو یقیناً میں اس سے استفادہ کروں گا اور آئندہ ایڈیشن میں ضروری اصلاح و ترمیم کروں گا۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ہ

سید رئیس احمد جعفری
رفیق ادارۂ ثقافت اسلامیہ
کلب روڈ۔ لاہور

۱۰ر جون ۱۹۶۸ء

فہرس

(۱)

حرفِ آغاز

جمہوریت کیا ہے؟

اسلام نے جمہوریت کی کوئی خاص وضع و ہیئت اور کوئی مخصوص نظام و دستور نہ معین کیا ہے نہ مرتب کیا ہے۔ یہ بات اُمّت کی صوابدید پر چھوڑ دی ہے کہ اپنی ضروریات و مقتضیات کے مطابق جس طرح کا نظام چاہے وضع کر کے اسے بروئے کار لے آئے، شرط صرف ایک ہے: اسے کتاب و سنت کا تابع ہونا چاہیئے۔

جمہوریت کی تعریف کیا ہے؟ جمہوریت کی کوئی ایسی تعریف نہیں کی جا سکتی جس پر ساری دنیا متفق ہو، ہر ملک کا نظام جمہوریت کا مدعی ہے، لیکن ہر ملک کا نظام جمہوری منفرد اور جُداگانہ حیثیت کا حامل ہے، امریکہ، انگلستان، فرانس، روس، چین، اطالیہ اور دوسرے بہت سے ممالک جمہوریت کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں، لیکن ہر جگہ کی جمہوریت ایک دوسری سے مختلف اور کہیں کہیں تو متضاد بھی ہے۔ مثلاً صدر جمہوریہ کا انتخاب فرانس میں صرف مرکزی مجلس قانون ساز کرتی ہے۔ یا ایوانِ زیریں اور ایوانِ بالا کے ممبر مشترک طور پر یہ کام انجام دیتے ہیں بھارت میں صوبائی مجالس قانون ساز اور پارلیمنٹ کے ممبر مخلوط اجتماع میں کسی شخص کو منتخب کر لیتے ہیں، امریکہ میں عوامی انتخاب ہوتا ہے یعنی بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر بالواسطہ انتخاب کیا جاتا ہے، اسی طرح رائے دہی کا مسئلہ ہے۔ عام طور پر ہر عاقل و بالغ رائے دینے کا مجاز ہے۔ کہیں تعلیم کی شرط ہے، یا انکم ٹیکس کی، یا عام ٹیکس کی، پھر جس جگہ بھی جو نظام کارفرما ہے وہ قائم اور

مستقل نہیں ہے۔ اس میں ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ تبدیلیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود کسی کی جمہوریت پر حرف تک نہیں آتا۔

اسلام نے چند اصول دے دیئے ہیں۔ انہی پر جمہوریت کی بنیاد و اساس قائم ہے۔ یہ اصول غیر تغیر پذیر ہیں، لیکن ان کی تفصیلات میں تغیر و تبدل امت کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ جب اور جس طرح چاہے ان میں تبدیلی اور ترمیم کر سکتی ہے۔

اگر کسی نظامِ حکومت میں انسانی مساوات غیر مشروط طور پر حاصل ہے عدل و انصاف کے تقاضے پورے کیے جاتے ہیں، عدلیہ پورے طور پر آزاد ہے۔ عوام کی آزادانہ اور رضا کارانہ مرضی کے بغیر کوئی مسندِ حکومت پر متمکن نہیں ہو سکتا، اور عوام کی ناپسندیدگی اور مخالفت کی صورت میں کوئی مسندِ حکومت پر قائم نہیں رہ سکتا، تو بلاشبہ وہ جمہوری نظام ہے، خواہ وہ روس کی طرح شورائیت پر مبنی ہو، یا انگلستان کی طرح قیصریت پر، یا فرانس کی طرح نیم آمریت پر، یا امریکہ کی طرح عوامیت پر!

اسلام نے ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے کوئی مرتب اور دائمی دستور اساسی پیش نہیں کیا ہے، نہ وہ ایسا کر سکتا تھا، نہ یہ اس کے لئے سزاوار تھا جس طرح اجتہاد کا دروازہ کھول کر اس نے چند اصولوں کے ماتحت نئے حالات ماحول اور مقتضیات کے مطابق فتویٰ دینے کی اجازت دے دی ہے۔ بالکل اسی طرح اس نے چند اصولوں کے ماتحت نظامِ سیاست و حکومت مرتب کرنے اور اس میں حسبِ ضرورت ترمیم کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اجماع جس طرح اصولِ فقہ کا ایک مسئلہ ہے، اسی طرح اصولِ سیاست کا بھی ہے!

مَیں نے اس کتاب میں اسلام کے انہی خصوصیات اور اقدار کو پیشِ نظر رکھ کر گفتگو کی ہے کسی خاص نظامِ حکومت کی نہ تائید کی ہے نہ مخالفت، کیونکہ

میرے نزدیک ہر وہ نظام جائز اور برحق ہے جسے اُمّت کی منظوری اور کتاب و سنت کی تائید حاصل ہو۔

جمہوریت کے جو مختلف نظام آج رائج ہیں یہ پہلے نہ تھے، اور کوئی مُدّت گذرتی ہے کہ یہ بھی نہ رہیں گے، دنیا جیسے جیسے آگے بڑھے گی یہ نظام بھی بدلتے جائیں گے، البتہ اصول اٹل ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ لہٰذا میں نے اسلامی جمہوریت کے اصولوں اور قدروں ہی سے بحث کی ہے کہ وہ ہر زمانے میں یکساں رہیں گے، اور وہ اصول نفسیات و ضروریاتِ انسانی پر اس درجہ حاوی اور اس درجہ جامع ہیں کہ آج بھی ان کی روشنی میں انسانیت کا قافلہ صلاح و فلاح کی طرف گامزن ہو سکتا ہے، اور مستقبل میں بھی۔ یہی رہگذار سب سے زیادہ استوار و پائدار ثابت ہوگی۔

مَیں نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی ہے جو کچھ کہا ہے سند کے ساتھ کہا ہے، اور سند بھی وہ ہے جو طعن و ایراد کی زد سے باہر ہے۔ یہ بڑا محنت طلب کام تھا۔ ایک صفحہ لکھنے کے لیے بیسیوں صفحے پڑھنا پڑے ہیں اور ایک ایک سند کی تلاش میں بعض دفعہ سینکڑوں اوراق کھنگالنا پڑے ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ میری یہ محنت سعیٔ رائیگاں نہ ثابت ہو۔

(السیّد) رئیس احمد جعفری (ندوی)

یکم جنوری ۱۹۶۸ء

(۲)

اسلامی سماج

اسلامی جمہوریت کا اصل منبع اور مصدر!

کوئی حکومت اس وقت تک نہ صحیح معنیٰ میں جمہوری کہلائے جانے کی سزاوار ہے نہ مہذب قرار دی جاسکتی ہے، نہ ثبات و استحکام حاصل کرسکتی ہے، نہ عزت اور وقار حاصل کرسکتی ہے، جب تک اس کا معاشرہ (سوسائٹی اور سماج) بے داغ نہ ہو۔

معاشرے میں اگر گھن لگ چکا ہے، بداخلاقی عام ہے، بے راہ روی نے شعار کی صورت اختیار کرلی ہے، آدمیت کا احترام اٹھ چکا ہے۔ امانت و دیانت کا فقدان ہے۔ سچائی اور پاکبازی کا نشان نہیں، چوربازاری، ذخیرہ اندوزی، رشوت اور اخلاقی جرائم و مفاسد معمولاتِ حیات میں داخل ہو چکے ہیں، تو نہ حکومت سرسبز ہوسکتی ہے، نہ قوم فلاح و بہبود کے راستے پر گامزن ہوسکتی ہے۔ سمجھ لینا چاہیے، یہ اب پنپ نہیں سکتی۔ حکومت کی کامیابی جمہوریت کا فروغ اور قوم کا ارتقاء صرف ایک ہی چیز پر موقوف ہے، اور وہ ہے صحت مند سماج، یہ نعمت اگر حاصل ہے، تو سب کچھ حاصل ہے، اور اگر یہ نہیں تو پھر فرشتے بھی آسمان سے اتر کر جمہوریت کا پرچم لہرائیں تو کوئی نفع نہیں حاصل ہوسکتا۔ معاملات ابتر ہی ہوتے چلے جائیں گے اور کوئی تدبیر بھی کارگر نہ ہوگی۔

اصل بات یہ ہے کہ سماج کا اثر ہر طبقے اور حلقے پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ اگر سماج اچھی ہے تو ان لوگوں کو لازماً اچھا بننا پڑے گا جن کے ہاتھ میں نظام

اقتدار و اختیار رہے۔ اور اگر سماج مجموعۂ عیوب و مفاسد ہے تو حکومت کے ارکان و اعضاء بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آئیں گے۔ آخر وہ لوگ جو حکومت کی کرسی پر بیٹھتے ہیں، اسی سماج ہی کے تو فرد ہوتے ہیں۔ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں سماج کے صحیح نمائندے وہی ہوتے ہیں جو رنگِ سماج پر غالب ہے، وہ ان پر غالب تر نظر آئے گا۔ پس کسی حکومت کی کامیابی یا ناکامی اور کسی جمہوریت کے قیام و دوام اور عروج و زوال کا تمام تر انحصار سماج کے صحت مند یا علیل ہونے پر ہے۔

طاہر اور صالح معاشرہ: اسلام نے اس حقیقت کو پہلے ہی سے پیشِ نظر رکھا ہے، اور جتنا زور اس پر دیا ہے کہ حاکم کو صالح اور عادل ہونا چاہیئے۔ اس سے کہیں زیادہ زور اس پر دیا ہے کہ افرادِ قوم کو اخلاقی مفاسد سے پاک ہونا چاہیے۔ ان میں بے غرضی ہونی چاہیے۔ نفع عاجل پر نفع آجل کو مقدم رکھنے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔ دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنے کا شعور ہونا چاہیے، دوسروں کے کام آنے کا جذبہ ہونا چاہیے، طمع سے متنفر اور قناعت کا خوگر ہونا چاہیے، ناجائز وسائل حیات کو ٹھکرا دینے اور حدود و اصول کے اندر رہ کر قوت لایموت تلاش کرنے کی اُمنگ ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں سے جو سوسائٹی مرکب ہوگی وہ طاہر اور صالح ہوگی، اور اس سوسائٹی کے جو نمائندے، کاروبار حکومت سنبھالیں گے ان کی حکومت صحیح معنی میں فلاحی اور مثالی حکومت کہے جانے کی مستحق ہوگی اسلامی جمہوریت کے خدوخال اسلامی معاشرہ کو سامنے رکھے بغیر نمایاں نہیں ہو سکتے۔

یہ عنوان ایک دفتر کا طالب ہے لیکن ہم زیادہ سے زیادہ اختصار سے کام لینے کی کوشش کریں گے۔

حقوق باہمی: حقوق باہمی پر اسلام بہت زیادہ زور دیتا ہے، انفاق فی سبیل اللہ کا اسلام میں بہت بڑا مقام ہے۔ یہ وہ قرض حسنہ ہے جس کا

مقروض خود خدا ہے لیکن وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اس نیک راستے میں بھی انسان اس درجہ آگے بڑھ جائے کہ اپنے متعلقین اور پس ماندگان کے حقوق نظر انداز کر دے۔

حضرت سعد بن وقاص رضؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے ایام میں جبکہ مَیں بیمار تھا، میری عیادت کو تشریف لایا کرتے تھے، مَیں نے عرض کیا،

"یارسول اللہ! میری علالت کی حالت یہ ہے اور مَیں مال دار آدمی ہوں اور میری وارث صرف ایک بیٹی ہے۔ کیا مَیں اپنے مال کا دو تہائی حصہ خیرات کر دوں؟"

فرمایا، "نہیں!"

مَیں نے عرض کیا۔ "ایک تہائی خیرات کر دوں"؟

فرمایا "ہاں"۔

اور ایک تہائی بھی بہت ہے۔ اپنے وارثوں کے لیے مال چھوڑ جانا اس سے بہتر ہے کہ تم انھیں مفلس چھوڑ جاؤ اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں، خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے تم جو کچھ خرچ کرو گے اس کا تمھیں اجر ملے گا، یہاں تک کہ جو لقمہ اپنی بیوی کے منہ میں دو گے اس کا بھی اجر ملے گا!" ؎۱

یعنی متعلقین کے حقوق ادا کرنا، صرف ایک انسانی فریضہ ہی نہیں، ایک ایسا کام ہے جو موجبِ اجر اور موجبِ ثواب بھی ہے جس سماج میں ان نازک ترین پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جاتا ہو اور ان کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہو۔ اس کے اثبات و استحکام کا کوئی سماج مقابلہ کر سکتی ہے؟

رشوت کا سدِّ باب: رشوت سماجی برائیوں میں بد ترین چیز ہے۔ اسے اگر مفاسد کا منبع کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا، کتنی ہی برائیاں اور نقائص

ہیں جو رشوت دینے اور لینے سے پیدا ہوتے ہیں، اس کا اگر سدِ باب ہو جائے تو بہت سے خفیہ اور علانیہ فتنے خود بخود ختم ہو سکتے ہیں اور فلاح و عافیت کا دَور دورہ ہو سکتا ہے۔ سماج اگر صحت مند ہو تو جن لوگوں کو رشوت دی جا سکتی ہے وہ کبھی نہ صرف یہ کہ اس سے گریز کرتے ہیں بلکہ ایک ناقابلِ معافی اور قابلِ تعزیر جرم قرار دیتے ہوئے عبرت انگیز سزا کا نفاذ کرنے میں کبھی تامل نہیں کرتے۔

"عبداللہؓ بن عباس رضؓ کے پاس ایک شخص حاضر ہوا، ایک لاکھ روپیہ پیش کرتے ہوئے اس نے درخواست کی کہ ایلہ کی گورنری اسے تفویض کر دی جائے۔"

عبداللہ رضؓ بن عباسؓ نے اس شخص کو (پہلے تو) سو کوڑے لگوائے، پھر عبرت و تعزیر کے لیئے اسے سُولی پر چڑھا دیا۔[۵]

اگر رشوت دینے والوں کو اس طرح کی سزائیں ملنے لگیں تو کیا اس کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے؟

عفو و کرم کا سلوک: اسلامی سماج میں بدترین دشمنوں تک سے عفو و کرم کا سلوک کیا جاتا ہے:۔

ایک غزوہ سے واپسی پر عبداللہ بن اُبیّ نے جو سردارِ منافقین تھا، کہا:

"اگر ہم مدینہ واپس گئے تو عزت والے ذلت والوں کو باہر نکال دیں گے"

زید بن ارقم رضؓ نے نبی صلعم کو یہ خبر پہنچا دی، عبداللہ بن ابی عذر کرتا ہوا آیا، اور قسمیں کھانے لگا کہ میں نے یہ بات نہیں کہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے سورۂ منافقین میں حضرت زید رضؓ بن ارقم کی تصدیق نازل فرمائی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے حضرت زید رضؓ سے فرمایا: "خوش ہو جا، اللہ نے تیری تصدیق کر دی!"

حضرت عمر رضؓ نے عرض کیا۔ "عباد بن بشیر کو حکم دیجیئے کہ اس بدبخت کی

گردن ماردیں"۔
آپؐ نے فرمایا: "نہیں! لوگ کہیں گے محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں"۔ باہمی جنگ وپیکار اور سب وشتم کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔
جناب عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو برا بھلا کہنا یا گالی دینا فسق ہے، اور مسلمان سے لڑنا فسق ہے!

آجر اور اجیر اسلام میں: آجر اور اجیر یعنی مزدوری دینے والا، اور مزدوری کرنے والا بھی اسلامی سماج کے ناقابلِ شکست اصولوں سے بندھے ہوئے ہیں، اور کوئی بھی اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا، تین آدمیوں کا ذکر ایک حدیث میں مذکور ہے کہ وہ ایک غار میں پھنس گئے، جس کے دہانے پر پتھر آڑے آگیا تھا، تینوں میں سے ہر ایک نے اپنے اعمالِ حسنہ کو شفیع بنا کر خدا سے التجا کی کہ پتھر ہٹ جائے، آخر:۔
تیسرے نے کہا: اے اللہ! میں نے چند لوگوں کو مزدوری پر لگایا تھا اور ان کی اجرت ان کو دے دی تھی، لیکن ایک شخص اپنی مزدوری چھوڑ کر چلا گیا تھا لہٰذا اس کی اجرت میں زراعت کے ذریعے میں نے ترقی دینی شروع کی، یہاں تک کہ اس سے بہت مال جمع ہو گیا، پھر وہ میرے پاس آیا، اور کہا۔
اے بندۂ خدا، میری مزدوری مجھے ادا کر دے۔
میں نے اس سے کہا: میرے پاس اونٹ، بکری اور غلام جو کچھ تو دیکھ رہا ہے، سب تیری اجرت کا ہے"
اس نے مجھ سے کہا "اے خدا کے بندے مجھ سے مذاق نہ کر"!
میں نے کہا۔ "میں تجھ سے مذاق نہیں کرتا، بلکہ جو کچھ کہہ رہا ہوں، درست ہے چنانچہ وہ تمام سامان ہانک کر لے گیا، اور اس میں سے کوئی چیز نہ چھوڑی، اے اللہ! اگر یہ کام میں نے محض تیری خوشنودی و رضامندی حاصل کرنے کے لیے کیا ہے تو تو ہم کو اس مصیبت سے نجات دے۔ جس میں

ہم مبتلا ہیں۔

وہ پتھر بالکل ہٹ گیا، اور تینوں آدمی نکل کر چلے گئے۔[۵]

علم کی عظمت اور اہمیت: ایک اچھا معاشرہ اسی وقت تشکیل پذیر ہو سکتا ہے جب وہ علم کی اہمیت سے آشنا ہو، اور جہالت سے نفور و بیزار ہو۔ اگر علم نہیں ہے تو نہ معاشرے کی بنیاد مستحکم ہو سکتی ہے، نہ اچھی حکومت کا قیام عمل میں آ سکتا ہے۔ چنانچہ حصولِ علم کی ترغیب قدم قدم پر کتاب و سنت میں ملتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے دعا کے جو الفاظ کہلائے گئے ہیں وہ حد درجہ جامع و مانع ہیں، اور ان میں سب کچھ آ گیا ہے۔[۶]

رب زدنی علماً۔ یعنی اے میرے رب، میرے علم میں اضافہ کر

اسی طرح بے جانے بوجھے پیچھے چل پڑنے پر بھی ٹوکا ہے:

لا تقف ما لیس لک بہٖ علم۔ یعنی جس بات کا علم نہیں اس کے پیچھے مت چلو[۷]

بالفاظ دیگر قدم علم کی روشنی میں قدم بڑھاؤ۔

احترام آدمیت: باہمی حقوق و مصالح عامہ کا لحاظ بھی ایک عمدہ معاشرے کے لیے شرط لازم کی حیثیت رکھتا ہے اور اسلام نے اسے بھی پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

"اگر کوئی درخت لگاتا ہے، یا کھیتی بوتا ہے، اور اس میں سے پرند یا انسان یا چوپایہ کھا جاتا ہے، تو اس کے لیے یہ صدقہ ہوتا یعنی اس کے کھا لینے پر درخت لگانے والے کو صدقہ کے برابر ثواب ملتا ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے کسی مکان، زمین، یا

کسی اور چیز کا کرایہ لینے سے منع نہیں فرمایا جمالبتہ یہ فرمایا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو بلا کرایہ کوئی چیز دے دے تو یہ کرایہ لینے سے بہتر ہے۔[۸]

اگر کسی معاشرے میں انسانی جان کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے، تو وہ معاشرہ رو بہ زوال ہے۔ اسلام نے احترامِ آدمیت پر بہت زور دیا ہے اور اس میں مومن اور کافر، فاسق اور مشرک تک کی تمیز روا نہیں رکھی ہے۔ آدمی آدمی سب برابر ہیں، کسی انسان کی زندگی سے کھیلا نہیں جا سکتا خواہ نسل و رنگ اور دین و مذہب اور فکر و عقیدے کے اعتبار سے وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ بغیر اس کے امن و امان قائم نہیں ہو سکتا، سکون و عافیت کی نعمت چھن جائے گی اور تباہی و بربادی کا دَور دَورہ شروع ہو جائے گا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعاًط

یعنی اگر کسی شخص نے کسی ایک انسان کو بھی قتل کر دیا، بجز قاتل یا فسادی کے تو گویا اس نے پوری نوعِ انسانی کو قتل کر ڈالا، اور جس کسی نے ایک انسان کو بھی ہلاکت سے بچا لیا گویا اس نے تمام انسانوں کی زندگی بچا لی۔[۹]

چند اہم نکات: فتنہ و فساد کی بھی اسلامی سماج میں کوئی گنجائش نہیں ہے ارشاد ہوتا ہے:

فاذکروا آلاء اللہ ولا تعثوا فی الارض مفسدین۔

یعنی اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھو، اور زمین پر فساد پھیلانے سے باز آجاؤ۔[۱۰]

مذکورہ ہر دو آیات کے سلسلے میں چند نکتے خاص طور پر غور طلب ہیں:-

قتلِ عمد اور فساد فی الارض کا جرم اگر سرزد ہو تو قتل جائز ہے، لیکن اگر کسی سے یہ جرم سرزد نہیں ہوا پھر بھی اس کی جان لے لی جاتی ہے، تو یہ

ایک شخص واحد کا قتل نہیں، پوری نوع انسانی کا قتل ہے۔ اور اگر کوئی، باحوصلہ شخص ایسے مظلوم کو بچا لیتا ہے اور اسے قتل نہیں ہونے دیتا تو یہ ایک شخص واحد کی زندگی کا بچانا نہیں ہے، بلکہ پوری نوع انسانی کو زندگی کا پیام دینا ہے۔ قرآن کریم کے ان الفاظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس نے احترامِ آدمیت اور خونِ انسان کی حرمت کا کس درجہ خیال رکھا ہے اور اس میں کسی طرح کی تفریق و تمیز گوارا نہیں کی ہے جو سماج اس اصول پر عامل ہو نہ وہ کمزور ہو سکتی ہے نہ رُوبہ زوال۔

دوسری آیت کریمہ میں پہلے یہ تاکید فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو فراموش نہ کرو، انھیں یاد رکھو اور فساد فی الارض سے باز رہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فساد فی الارض اسلام کی نظر میں کس درجہ نامرغوب اور ناقابلِ برداشت چیز ہے۔

احترامِ آدمیت کی مثال اسوۂ رسول سے:

حضرت قیسؓ اور سہیلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی کا جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ آپؐ کو بتایا گیا کہ یہ تو یہودی کا جنازہ ہے، آپؐ نے فرمایا: "کیا وہ انسان نہیں ہے"۔

عدل و دیانت: ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ کے سمع مبارک تک جب یہ بات پہنچائی گئی کہ یہ جنازہ مسلمان کا نہیں، یہودی کا ہے تو آپؐ نے فرمایا: "جب کوئی جنازہ دیکھو کھڑے ہو جایا کرو"۔

ایک اچھا اور مثالی معاشرہ اسی وقت عالمِ وجود میں آسکتا ہے، جب معاملات اور کاروبار میں عدل و دیانت کو پورے طور پر ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ عدل و دیانت، ایفائے عہد سے زیادہ وسیع ہے، اگر کاروبار اور معاملات میں خیانت کا چلن ہے، دغا اور فریب سے کام لیا جاتا ہے تو وہ انحطاط پذیر معاشرہ ہے۔ اس سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسلام میں

کاروباری دیانت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

واوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولاo واوفوا الكيل اذا كلتم وزنوا بالقسطاس المستقيمo ذلك خير واحسن تاويلاo	"یعنی عہد کو پورا کرو، کیونکہ عہد کی پابندی پر قیامت کے دن سوال کیا جائے گا جب کوئی چیز ناپ کر فروخت کرو تو پیمانے کو پورا بھر کے دیا کرو، یہ بہترین طریقہ ہے اور اس کا انجام دین و دنیا میں ہر جگہ اچھا ہے۔"[۱۲]

اگر کوئی دوکاندار اس کی پابندی نہیں کرتا تو وہ خدا کا گنہ گار ہے:-

ويل للمطففين اذا اكتالوا على الناس يستوفون واذا كالوهم او وزنوهم يخسرونo	ان کم دینے والوں پر حیف ہے جو لوگوں سے تو پورا ناپ کر لیتے ہیں پھر جب دیتے ہیں تو کم کر کے۔[۱۳]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"جس نے کاروبار میں دھوکہ دیا وہ میرا پیرو نہیں"۔[۱۴]

نیز فرمایا:

"بائع مشتری جب تک ایک دوسرے سے جُدا نہ ہو جائیں، معاملہ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں پورا اختیار رکھتے ہیں۔ اگر انھوں نے (کاروبار میں مالِ تجارت کے عیوب کے) اخفاء کا طریقہ کیا تو اُن کے معاملۂ بیع کی برکت رخصت ہو جائے گی"۔[۱۵]

امام اعظمؒ کی مثال بھی اگر سامنے رہے تو مضائقہ نہیں، وہ ایک تاجر تھے۔ "انھوں نے کچھ سامان حفص بن عبدالرحمٰن کے پاس کہ شریکِ کاروبار تھے بھیجا، اور کہلا دیا کہ کچھ حصّہ اس مال کا ناقص ہے۔ لہٰذا یہ عیب خریدار کو بتا دیں"۔

حفص نے مال فروخت کر دیا، مگر نقص بتانا بھول گئے اور پوری قیمت وصول کرلی۔

روایت ہے کہ اس کی قیمت تیس یا پینتیس ہزار تھی۔

امام ابو حنیفہ رح نے حفص کو تاکید کی کہ خریدار کو تلاش کریں، لیکن کوشش کے باوجود خریدار کا پتہ نہ چلا، آخر امام اعظم نے حفص سے شرکت ختم کر دی، اور اس رقم کو اپنے پاکیزہ مال میں ملانا گوارا نہ کیا، سارے کا سارا خیرات کر دیا[۱۶]۔

اخوت باہمی: قرض کا معاملہ بھی، ہر انسانی معاشرے میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

اگر ایک شخص کسی کو قرض دیتا ہے تو اسے حق حاصل ہے کہ اپنی دی ہوئی رقم کا تقاضا کرے، اور نہ ملے تو قانونی چارہ جوئی کرے، اسلام اس حق کو تسلیم کرتا ہے، یقیناً قرض دینے والے کو اس کی رقم واپس ملنی چاہیے، اور اگر لیت و لعل سے کام لیا جا رہا ہے تو اس حق کو تسلیم بھی کرتا ہے کہ قانونی چارہ جوئی کر کے اپنی رقم وصول کرلے۔

لیکن یہ حق دینے کے ساتھ قرض دینے والے سے وہ یہ توقع بھی رکھتا ہے کہ مقروض اگر واقعی مجبور ہے تو جب تک اس کے حالات سازگار نہ ہولیں، اسے مہلت دی جائے۔ مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ ترغیب ہے یا حکم، اس اختلاف کو چنداں اہمیت نہیں، ترغیب ہو یا حکم، بہر حال خدا کی طرف سے ہے اس لیے ہر حالت میں واجب التعمیل ہے۔ اللہ نے تعالیٰ فرمایا ہے:

وان کان ذو عسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ ۰ — یعنی اگر مقروض تنگدست ہے تو حالات کے سازگار ہونے تک اسے مہلت دی جائے[۱۷]

اس پر عملدرآمد کا لازمی نتیجہ باہمی رفق و محبت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے:
"اس شخص پر خدا رحم کرے، جو قرض کا تقاضا کرنے میں نرمی سے پیش آتا ہے۔"[۱۸]

نیز آپؐ نے فرمایا: "جو شخص روزِ قیامت کے کرب سے بچنا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ تنگ حال مقروض کو سہولت دے، یا زرِ مطالبہ میں سے کچھ کمی کر دے۔"[۱۹]

نیز ارشاد ہوا: "جس نے تنگ حال مقروض کو مہلت دی، یا (اصل رقم میں سے) کچھ کمی کر دی، اسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن عرش پاک کے سایہ تلے لے گا، یہ وہ دن ہو گا کہ اس روز سوا سایۂ عرش کے کوئی سایہ میسر نہ ہو گا!"[۲۰]

اسلام جو معاشرہ پیدا کرنا چاہتا ہے، اور جس کا نمونہ دنیا دیکھ بھی چکی ہے۔ اس میں ہر چیز پر جس چیز کو مقدم رکھا گیا ہے، وہ انسانیت ہے، مال و زر کی خواہش کسے نہیں ہوتی، یہ خواہش اگر جائز حدود کے اندر ہو تو اسلام اس سے روکتا بھی نہیں، لیکن اگر اس خواہش میں سفاکی، بددیانتی اور دغا شامل ہو جائے تو اس سے روکتا ہے، قرض دی ہوئی رقم واپس لی جا سکتی ہے، لیکن مقروض اگر معذور رہے تو اسے مہلت دینا ہی چاہیے۔ ایسے معاشرے میں اخوت باہمی کا جو مقام ہو گا ظاہر ہے:

حضرت نعمانؓ بن بشیر کہتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تم مومنوں کو ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے اور مہربانی کرنے میں ایسا دیکھو گے، جیسا جسم کو کہ اس کے ایک عضو میں تکلیف پیدا ہونے سے تمام اعضاء بیداری اور بخار میں اس کے شریک ہو جاتے ہیں!"

~~اخوت باہمی کا ایک پہلو حق ہمسائیگی بھی ہے~~ اور اسے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف عطا فرمایا ہے، بلکہ تاکید کی ہے کہ ہمسائے کا حق پورا پورا ادا کیا جائے، اور وہ حق کیا ہے؟ یہ کہ اس کے دکھ سکھ میں شرکت

کی جائے، اپنے امکان و استطاعت کے مطابق اس کی مدد کی جائے، کسی پریشانی میں مبتلا ہو تو اسے رفع کرنے کی کوشش کی جائے، بھوکا ہو تو کھانا کھلایا جائے اور اس کے ساتھ بالکل برادرانہ سلوک کیا جائے، حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ روایت کرتی ہیں کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جبریلؑ مجھے ہمیشہ پڑوسی کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تاکید کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ مجھے یہ خیال ہوا، کہ شاید اسے حقِ وراثت مل جائے گا!"[۱]

بخاری کے اسی باب میں ایک دوسری حدیث، ابو شریحؓ اور ابو ہریرہ رضؓ سے مروی ہے کہ:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا: خدا کی قسم وہ مومن نہیں! خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں!"

عرض کیا گیا: "یا رسول اللہؐ! کون؟"

آپؐ نے فرمایا: "وہ شخص جس سے اس کا ہمسایہ مامون نہ ہو!"

صحیح بخاریؒ کے اسی باب میں حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے مہمان کے بارے میں مروی ہے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کو اذیت نہ پہنچائے، اور جو شخص خدا پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ مہمان کی خاطر داشت کرے، اور جو شخص خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ ہمیشہ اچھی بات کہے، ورنہ خاموش رہے!

جس سماج میں مقروض کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رعایت کی جاتی ہو، بلکہ زرِ اصل میں بھی کمی کر دی جاتی ہو، جس سماج میں اخوتِ عامہ کی کارفرمائی ہو۔ مساوات کا دورہ ہو، پڑوسی کے ساتھ اس درجہ حُسنِ سلوک کیا جاتا ہو کہ اندیشہ ہو چلے

کہ کہیں یہ شریکِ وراثت نہ کر دیا جائے ۔ جس سماج میں ہر شخص ایک دوسرے کے دُکھ درد کا ، اور نشاط و مسرت کا شریک ہو ، جہاں مہمانوں کو سر پہ بٹھایا جاتا ہو ، وہ سماج کتنی بڑی نعمت ہوگی ، اور اس سماج میں سے اُبھر کر جو لوگ حکومت قائم کریں گے ، کیا وہ حکومت بھی مثالی اور فلاحی نہ ہوگی ؟

اسلامی سماج کی بنیاد : حقیقت یہ ہے کہ اسلامی سماج کی بنیاد قائم ہے قناعت پر ، صبر پر ، ایثار پر ، احترام انسانیت پر اور انفاق فی سبیل اللہ پر ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے ، اور جو کچھ فرمایا ہے وہ اس حقیقت کا نہایت شاندار اور دل آویز مرقع ہے ۔ آپؐ کا اسوۂ حسنہ اور اور آپؐ کے جوامع کلم اسی تابندہ حقیقت کی طرف راہنمائی کرتے ہیں ۔

آپؐ کے پاس ایک جماعت حاضر ہوئی جس نے افلاس کے باعث روئی کے کپڑے پہن رکھے تھے ۔

عدیؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی اور کھڑے ہوئے اور اُن پر صدقہ کرنے کی ترغیب دی ، پھر فرمایا :

اے لوگو ! اپنی دولت میں سے کچھ خرچ کرو ، اگرچہ ایک صاع ہو ، نصف صاع ہو ، ایک مٹھی ہو یا مٹھی کا کچھ حصہ ہو ، جس کے ذریعے تم جہنم کی گرمی یا آگ سے اپنے چہرے کو بچا سکو ، اگرچہ ایک کھجور ہو ، یا کھجور کا ایک ٹکڑا ہو ، اگر یہ بھی نہ ملے تو میٹھے بول ہی سہی ، جب تم میں سے کوئی اللہ سے ملے تو وہ پوچھے گا : " کیا میں نے تجھے مال اور اولاد نہ دی تھی ؟ "

وہ کہے گا ، ہاں دی تھی !

وہ پوچھے گا ۔ " اپنے لیے تو نے آگے کیا بھیجا ؟ "

تو وہ اپنے سامنے ، پیچھے ، دائیں ، بائیں دیکھے گا اور جہنم کی گرمی سے اپنے تئیں بچانے کے لیے کچھ نہ پائے گا ۔

اس لیے تمھیں چاہیئے کہ اپنے چہرے کو دوزخ کی حرارت سے بچاؤ ،

اگرچہ کھجور کے ٹکڑے ہی سے ہو سکے، اگر یہ بھی نہ ملے تو میٹھے بول ہی سہی۔ کیونکہ میں تمہارے لیے افلاس اور فاقہ کے باعث کچھ خطرہ نہیں محسوس کرتا، اللہ تعالیٰ دور کرنے والا ہے اور عطا کرنے والا ہے۔ یہاں تک کہ یثرب اور حیرۃ کے درمیان ایک عورت گذرے گی اور اسے کہیں بھی چوروں کا کھٹکا نہیں ہوگا۔[12]

اسلامی سماج میں حسنِ اخلاق پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

عباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا و اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما ۔

"یعنی رحمٰن (خدا) کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرتے ہیں تو سلام کر کے (الگ ہو جاتے ہیں۔"[23]

ایک موقع پر مسلمان کے اخلاق کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

اذا ما غضبوا ھم یغفرون

"یعنی جب ان کو غصہ آجاتا ہے تو خطاؤں سے درگذر کرتے ہیں"![24]

پھر ارشاد ہوا:

ولمن صبر وغفر، ان ذٰلک من عزم الامور

"اور جو صبر کرے اور خطاؤں سے درگذر کرے تو بیشک یہ بڑے ہمت کے کام ہیں۔"[25]

گویا مسلمانوں کو جس اخلاق کی تعلیم قرآن کریم نے دی ہے یہ ہے:

: زمین پر فروتنی کے ساتھ چلنا، نہ کہ نخوت کے ساتھ اکڑتے ہوئے چلنا۔

: غصہ کی حالت میں بھی خطابخش و خطاپوش ثابت ہونا۔

: صبر اور درگذر کا شمار "عزم امور" میں ہے۔

جو سوسائٹی اس سانچے میں ڈھلی ہو اور جس کے افراد اس اخلاق سے متصف ہوں، کیا وہ بجائے خود اور اس کی قائم کی ہوئی حکومت بھی دنیا کے لیے پیامِ امن و راحت اور نوید نشاط و طرب نہیں ہوگی؟

صحابہ کرام میں حضرت عمرؓ روحِ اسلام کے بہت زیادہ رازداں تھے ان کے فیصلوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی گفتار و کردار میں اسلام کی حقیقی روح جھلکتی نظر آتی ہے، انھوں نے اپنے پورے دورِ خلافت میں جو حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت کی طرح مختصر نہ تھا بارہا ایسے فیصلے صادر کیے ہیں، جو اس حقیقت کے غماز ہیں کہ اسلام کی تعلیم، اس کے پیام اور فلسفۂ حکمرانی کو انھوں نے اپنے قول و فعل میں شیر و شکر کی طرح آمیز کر لیا تھا۔ استاذ سید قطب شہیدؒ کا بیان ہے:

"حضرت عمرؓ سے متعلق مروی ہے کہ آپؓ نے ایک مرتبہ وہ سارا دودھ زمین پر بہادیا جس میں پانی ملایا گیا تھا، ان کا یہ فعل مصلحتِ عامہ کے حفظ و بقا کے لیے تھا کہ "تاجر عوام کو دھوکا دینے کی جرأت نہ کریں۔ ۲۶؎

ضرورت مندوں کی حاجت پوری کرنا بھی اسلامی سماج کا شعار بلکہ فریضہ ہے:

لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون ط

یعنی تم نیکی کو اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیز راہِ خدا میں خرچ نہ کرو جسے تم بے حد عزیز رکھتے ہو" ۲۷؎

عملِ صالح، اسلامی سماج کی ایک نمایاں خصوصیت ہے:

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت اولٰئک ھم خیر البریہ

"یعنی جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے وہ خلقِ خدا میں بہترین لوگ ہیں"! ۲۸؎

نیز ارشاد ہوا:

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت لھم اجر غیر ممنون

"یعنی جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے، ان کے لیے غیر منقطع اجر ہے!" ۲۹؎

امانت میں خیانت ایک ایسا جرم ہے جو اسلامی معاشرے میں ناقابل درگذر اور ناقابل برداشت ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ

"یعنی بلاشبہ خدا تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ادا کیا کرو، اور جب فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کیا کرو"۔[۳۰]

امانت ادا کرنے اور انفاق کی ترغیب کے ساتھ ساتھ اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم بھی اسلامی سماج کو دی گئی ہے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَحْسُورًا

"اور اپنا ہاتھ نہ تو اس طرح سکیڑ لو کہ گویا گردن میں بندھ گیا؛ اور نہ بالکل پھیلا دو، ورنہ تم خالی ہاتھ بیٹھے رہ جاؤ گے، اور لوگ تمھیں ملامت کریں گے"[۳۱]

بیمار کی عیادت بھی مسلم سماج کے خصائص میں ہے اور اس فریضے سے انجام دینے میں بھی عقیدہ و مذہب کا کوئی سوال نہیں ہوتا:

"صحابہ کرام رضؓ میں سے کوئی بیمار ہو جاتا، تو آپ ﷺ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے۔

اہلِ کتاب میں سے ایک آپ ﷺ کا خادم تھا، آپ ﷺ نے اس کی بھی عیادت فرمائی، آپ ﷺ نے اپنے چچا کی عیادت بھی فرمائی، حالانکہ وہ مشرک تھے۔[۳۲]

مسلم سماج کے افراد ظلم کو کس طرح روکتے ہیں؟:

حضرت انس رضؓ بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو خواہ مظلوم!"

لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم مظلوم کی مدد کریں، لیکن ظالم کی مدد ہم کس طرح کر سکتے ہیں؟

آپؐ نے فرمایا: "ظالم کا ہاتھ پکڑ لو۔ یعنی اس کو ظلم سے روک دو"[۳۳]
اس طرح ظلم کا صدور ممکن نہیں رہتا، اور ارادہ ظلم کرنے والا عقاب سے بچ جاتا ہے جو اس کی بھی مدد ہے۔

حسنِ اخلاق اسوۂ حسنہ کی روشنی میں:۔

"نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، اچانک، گھر میں کبھی تشریف نہ لاتے کہ گھر والوں کو پریشان کردیں، بلکہ اس طرح تشریف لاتے کہ پہلے سے آپؐ کی تشریف آوری کی اطلاع پہنچ جاتی، آپ تشریف لاتے، پھر سلام کرتے!"

صحیح بخاری میں ہے کہ تین باتیں جس نے جمع کرلیں، اس نے ایمان کو حاصل کرلیا۔ ۱۔ سلام کرنا، ۲۔ تنگی کے وقت راہ خدا میں خرچ کرنا۔ ۳۔ اپنے آپ سے انصاف کرنا۔

اور سلام کرنے کا مطلب تواضع و انکساری بھی ہے، ایسا آدمی کسی کے سامنے تکبّر نہیں کرتا، بلکہ ہر چھوٹے بڑے، امیر غریب، جاننے والے اور نہ جاننے والے کو سلام کرتا ہے اور تکبر کی حالت اس کے برعکس ہوتی ہے کیونکہ وہ اس شخص کے سلام کا جواب بھی تکبر کے باعث نہیں دیتا، جو خود اسے سلام کرے، اس صورت میں وہ خود کیسے کسی کو سلام کرے گا؟

ایک مرتبہ آپؐ بچوں کے پاس سے گذرے تو انھیں سلام کیا۔

صحیحین میں ہے کہ آپؐ اپنے گھر والوں کا دروازہ رات کو نہ کھٹکھٹاتے بلکہ شام کو یا صبح کو داخل ہوتے۔ اور جب آپؐ سفر لاتے تو خاندان کے بچوں سے آپؐ کی ملاقات ہوتی۔ حضرت عبداللہؓ بن جعفر فرماتے ہیں:

"ایک بار آپؐ سفر سے تشریف لائے تو میں نے آپؐ کی طرف سبقت کی، چنانچہ آپؐ نے مجھے آگے بٹھالیا۔ پھر حضرت فاطمہؓ کے صاحبزادے حسنؓ یا حسینؓ تشریف لائے تو آپؐ نے انھیں پیچھے بٹھالیا، راوی کہتے ہیں کہ ہم تینوں ایک سواری پر مدینہ میں داخل ہوئے!"

اور سفر سے آنے والے کے ساتھ آپؐ معانقہ فرماتے، اور اگر گھر والا ہوتا تو اس کا بوسہ لیتے۔

مسلم سماج کے اخلاق وصفات کا ایک اور پہلو:-

نیز (نامناسب) حرکات میں سے یہ ہے کہ آدمی دوسروں سے اپنی بیوی کی خفیہ باتوں کا یا آپس کی باتوں کا تذکرہ کرے، جیسے کہ بعض لوگوں کی عادت خبیثہ ہے!

نیز زعموا وذکروا وقالوا (کہا جاتا ہے، مشہور ہے، لوگ کہتے ہیں) جیسے الفاظ سے حکایت کرنا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناپسند فرماتے تھے۔

نیز یہ کہ بادشاہ کو زمین میں خلیفۃ اللہ یا نائب اللہ کہا جائے کیونکہ خلیفہ اور نائب تو غیر موجود کے ہو سکتے ہیں، اور اللہ تبارک وتعالیٰ خود اپنے گھر سے غیر حاضر ہونے والے کا خلیفہ اور اپنے مومن بندے کا کارساز ہے۔

معمولی سے معمولی کام بھی صدقہ اور نیکی ہے اور موجب اجر ہے:-

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ افضل عمل کونسا ہے؟

آپؐ نے فرمایا: اللہ پر ایمان رکھنا اور خدا کی راہ میں جہاد کرنا۔

پھر میں نے پوچھا: "کس قسم کے غلام کو آزاد کرنا افضل ہے؟"

فرمایا: "جو قیمت کے اعتبار سے گراں ہو اور مالکوں کے نزدیک پسندیدہ اور محبوب ہو!"

اس کے بعد میں نے پوچھا: "اگر میں یہ نہ کر سکوں!"

آپؐ نے فرمایا: "پھر کسی کاریگر کی مدد کرو یا کسی بے کار یا بے ہنر کا کام کر دیا کرو!"

میں نے عرض کیا: "اگر میں یہ بھی نہ کر سکوں!"

آپؐ نے فرمایا: لوگوں کو شر سے بچاؤ، یا لوگوں کو اذیت نہ دو، کہ یہ بھی صدقہ

ہے جیسے تم اپنی جان پر تصدق کرتے ہو!" [۳۵]

مصالحت کی کوشش بھی مقبول و محمود ہے:

حضرت ام کلثومؓ بنت عقبہؓ کہتی ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ جو شخص لوگوں کے درمیان صلح کرا دے اور صلح کی کوشش میں کوئی اچھی بات غلط بھی کہہ دے تو وہ جھوٹا نہیں ہے۔ [۳۶]

شہادت اور گواہی کی اہمیت: اسلامی سماج کو عدل و انصاف کی زیادہ سے زیادہ ترغیب دی گئی ہے اور عدل و انصاف ہی کا تقاضا یہ ہے کہ شہادت نہ چھپائی جائے۔ لہٰذا اس پر وعید بھی وارد ہوئی۔

یاایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ ولو علیٰ انفسکم او الوالدین والاقربین۔	"یعنی اے ایمان والو! انصاف کو قائم کرنے والے اور اللہ کے لیے شہادت دینے والے بن جاؤ، خواہ تمہاری وہ شہادت خود تمہارے، تمہارے والدین اور تمہارے عزیزوں کے خلاف ہی ہو۔" [۳۶]

پھر فرمایا:

ولا تکتموا الشھادۃ ومن یکتمھا فانہ اٰثم قلبہ	"یعنی شہادت مت چھپاؤ، جو کوئی گواہی کو چھپاتا ہے اس کا دل بھی گنہگار ہو جاتا ہے۔" [۳۷]

جس سماج کے لوگ اس درجہ انصاف پرور اور عدل دوست ہوں کہ نہ صرف عدل و انصاف کو قائم کریں بلکہ اگر ضرورت ہو تو ماں باپ اور رشتے داروں کے خلاف عدالت میں حاضر ہو کر گواہی بھی دیں اور جس سماج کے لوگوں کو وعید کے رنگ میں بتایا گیا ہو کہ اخفائے شہادت جرم ہے، اس کا ارتکاب ہرگز نہ کریں۔ وہ ساری دنیا کے لیے پیامِ رحمت اور نویدِ مسرت کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟

اسلامی سماج میں تعزیت اور اس کے آداب: اور آپؐ کی سنتِ طیبہ یہ تھی کہ میت کے اہل خانہ (تعزیت کے لیے آنے والے) لوگوں کو کھانا نہ کھلائیں۔ بلکہ آپؐ نے حکم دیا کہ دوسرے لوگ (دوست اور عزیز)

ان کے لیے کھانا تیار کر کے بھیجیں اور یہ چیز اخلاقِ حسنہ کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور پس ماندگان کو سبک دوش کرنے والا عمل تھا، کیونکہ اس وقت وہ اپنی مصیبت کے باعث لوگوں کو کھانا کھلانے سے معذور ہوتے ہیں۔[۳۹]

ناپ تول میں کمی کو اللہ تعالیٰ فساد فی الارض سے تعبیر کرتا ہے:

ولا تنقصوا الکیل والمیزان "یعنی پیمانے اور ترازو کو پورا تولو، اور لوگوں کو ولا تبخسوا الناس اشیاءھم تم ان کی چیزیں کم نہ دو، زمین میں اصلاح کے بعد ولا تفسدوا فی الارض بعد فساد نہ پھیلاؤ۔"[۴۰]
اصلاحھا۔

بطل پرستی شعارِ اسلام نہیں: اسلامی سماج میں بطل پرستی کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے۔ نبی صلعم کے سوا کوئی معصوم نہیں ہے، لہٰذا ہر فرد سے خواہ وہ کتنا ہی عظیم و جلیل کیوں نہ ہو، فہم کی غلطی ہو سکتی ہے، اقدام و عمل کی غلطی ہو سکتی ہے اور اس غلطی سے اس کے مرتبہ و فضیلت پر کوئی اثر بھی نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ غلطی دیانتِ فکر پر مبنی ہو، خودرائی اور تمرد پر مبنی نہ ہو:

ایک مرتبہ عبداللہ بن عمر رضؓ سے ایک مسئلے کے سلسلے میں سوال کیا گیا اور دریافت کیا گیا۔

"آپ رضؓ کے والد رضؓ نے تو اس سے منع کیا ہے؟"

ابنِ عمر رضؓ نے جواب میں کہا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، یا میرے باپ کا قول؟"

ابن عباس رضؓ نے ایک شخص سے جو ایک مسئلے میں ابوبکر رضؓ کے قول سے معارضہ کیا کرتا تھا، کہا: "مجھے ڈر ہے کہیں تم پر آسمان سے پتھر نہ برسنے لگیں، میں کہتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا ہے، اور تم کہتے ہو، ابوبکر رضؓ و عمر رضؓ نے یہ کہا ہے!

یہ ہے اہلِ علم کا جواب، نہ یہ جواب کہ عثمانؓ و ابوذرؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے تمھارے مقابلے میں زیادہ واقف تھے۔

ابنِ قیم کے یہ آخری الفاظ روحِ اسلام کا نچوڑ ہیں، ان کی صداقت اور واقعیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

خدمتِ خلق: خدمتِ خلق عبادت سے بھی افضل ہے:

"حضرت انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے، کچھ لوگوں نے روزہ رکھا تھا اور بعض روزہ سے نہیں تھے، اس حال میں ہم نے ایک سخت تپتے ہوئے دن ایک جگہ پڑاؤ کیا، ہم میں سب سے زیادہ سایہ اسے میسّر تھا جس کے پاس چادر تھی، بعض ہاتھوں سے دھوپ کا بچاؤ کر رہے تھے، آخر روزے دار اصحاب تو آرام کرنے لگے اور جنھوں نے روزہ نہیں رکھا تھا انھوں نے خیمے نصب کیے اور سواری کے جانوروں کو پانی پلایا۔

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "آج سارا اجر ان لوگوں کے ہاتھ آ گیا، جو روزے سے نہیں تھے۔"

خدمتِ خلق جہاد کی ہم پایہ ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "غریبوں اور بیواؤں کی خدمت کرنے والا وہی درجہ رکھتا ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کا یا رات بھر نماز پڑھنے اور دن بھر روزہ رکھنے والے کا ہے!"

ایک موقع پر ارشاد ہوا: "عیب چینی اور غیبت اسلامی شعار نہیں!"

نیز فرمایا: "ہر مسلمان ایک دوسرے کا ذمہ دار ہے!"

نیز یہ کہ: "تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور تم سے ہر ایک سے باز پرس بھی ہوگی!"

برائی اور بدی کو برداشت کر لینا مسلمان کا شیوہ نہیں: "تم میں سے

جو کوئی کسی امرِ منکر کو دیکھے تو چاہیے کہ اسے بزورِ بازو روک دے، جو یہ نہ کر سکے، وہ زبان ہی سے اسے دُور کرنے کی کوشش کرے جس میں یہ سکت بھی نہ ہو، وہ (کم از کم) دل میں اس کے خلاف جذبہ رکھے اور یہ ایمان کا سب سے پست درجہ ہے!

بھوکے کو کھانا کھلانا صرف موجبِ اجر ہی نہیں فرض کفایہ بھی ہے۔ آپ[۳۹] نے فرمایا:

"جس بستی میں کوئی شخص صبح اس حالت میں کرے کہ وہ رات بھر بھوکا رہا ہو تو پھر اللہ تبارک و تعالیٰ پر اس بستی کے بقاء و تحفظ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے!"

امدادِ باہمی سے متعلق ایک اور ارشادِ رسول:-

"جس کے پاس زائد سواری ہو، اسے چاہیے کہ اس شخص کو دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو، اور جس کسی کے پاس زائد از ضرورت زادِ راہ ہو، وہ اس کے حوالے کر دے، جو زادِ راہ سے محروم ہو"

ضیافت کی ترغیب:- جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو، وہ تیسرے آدمی کو (مہمان بنا کر) لے جائے، اور اگر چار کا ہو تو پانچویں یا چھٹے کو!"

اُمتِ مسلمہ کی مثال:-

"باہم لطف و کرم اور انس و محبت میں مسلمان کا حال جسم کا سا ہے، کہ جب ایک عضو کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بدن کا ہر عضو بے خوابی اور بخار کے ذریعہ اس کا شریکِ غم بن جاتا ہے!"

مردِ مومن کا مرقع:- "ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت (کی اینٹوں) کی طرح ہے کہ ان میں ایک دوسرے کو تھامے اور سنبھالے رکھتی ہے[۴۲]

معاملات کو سرانجام دینے کے سلسلے میں قرآن پاک کی واضح ہدایت:

وَلیکتب بینکم کاتب بالعدل ولا یأب کاتب ان یکتب کما علمہ اللہ فلیکتب ولیملل الذی علیہ الحق ولیتق اللہ ربہ ولا یبخس منہ شیئاً فان کان الذی علیہ الحق سفیہا اوضعیفا اولا یستطیع ان یمل ھو فلیملل ولیہ بالعدل واستشھدوا شھیدین من رجالکم فان لم یکونا رجلین فرجل وامرأتان ممن ترضون من الشھداء ان تضل احدھما فتذکر احدھما الاخریٰ۔

یعنی اے ایمان والو! جب کسی مدت معین کے لیے تم باہمی طور پر قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو، فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے، جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی صلاحیت عطا کی ہو، اسے لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے، وہ لکھے اور املا وہ شخص کروائے جس پر حق آتا ہے، (یعنی قرض لینے والا) اور اسے اللہ یعنی اپنے رب سے ڈرنا چاہیے۔ کہ جو معاملہ طے پاگیا ہو، اس میں کسی طرح کی کمی بیشی نہ کرے، لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو یا املا نہ کرا سکتا ہو، تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کروائے۔

پھر دو مردوں کی گواہی کرالو، اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں، تاکہ اگر ایک بھول جائے تو دوسرا اسے یاد دلا دے، یا گواہ ایسے لوگ ہونے چاہئیں جن کی گواہی تمہارے درمیان قابلِ قبول ہو۔

وَلا یاب الشھداء اذا ما دعوا

یعنی گواہوں سے جب گواہی کے لیے کہا جائے تو انھیں انکار نہ کرنا چاہیئے!

ولا تکتموا الشھادۃ و من یکتمھا فانہ اثم قلبہ ط

یعنی شہادت نہ چھپاؤ، جو گواہی چھپاتا ہے اس کا دل گنہگار ہے۔[۳۳]

غور کا مقام ہے کہ کتنی باریکیوں کو ان احکام میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ملحوظ

رکھا ہے، اور معاملات میں کس درجہ صفائی کی تاکید کی ہے: تاکہ بعد میں غلط فہمی کا امکان ہی نہ رہے۔

باہمی حسنِ سلوک، رحمت وشفقت اور نرمی وعطوفت کی لسانِ نبوّت سے مسلم معاشرے کو بار بار تاکید فرمائی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"تم زمین کے بسنے والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔"

اور یہ رحم وکرم کی تائید صرف انسانوں ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہر ذی روح اس میں شامل ہے:

ایک بار ایک آدمی اپنے رستے چلا جارہا تھا، کہ اسے سخت تشنگی محسوس ہوئی، اتنے میں اسے کنواں نظر آیا، اس میں اُتر پڑا، پانی پی کر باہر نکلا تو پیاس سے بے حال ایک کتّا ہانپتا نظر آیا جو کیچڑ چاٹ رہا تھا، آدمی نے سوچا کتّا بھی پیاس سے اتنا ہی درماندہ نظر آتا ہے۔ جتنا میں تھا، چنانچہ وہ کنوئیں میں پھر اترا، اور اپنا چرمی کوزہ بھرلیا، وہ اسے اپنے منہ سے پکڑے پکڑے اوپر چڑھ آیا، اور کتّے کو پانی پلایا۔

اللہ نے اس عمل کی قدر کی اور اسے بخش دیا۔

لوگوں نے دریافت کیا۔ "یا رسول اللہ! کیا حیوانوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کا بھی اجر ملے گا؟"

آپؐ نے فرمایا: "ہاں! ہر ذی حیات کے ساتھ حسنِ سلوک میں اجر اجر ہے!"[متفق علیہ]

ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا: "ایک عورت دوزخ میں صرف اس لیے ڈال دی گئی کہ اس نے ایک بلّی کو باندھے رکھا، نہ خود اسے کھلایا، نہ اسے آزاد کیا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا کر پیٹ بھرلے۔"

ایک حدیث قدسی:

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا: "اے ابن آدمؑ میں بیمار پڑا

تو میری عیادت کو نہ آیا۔"

ابنِ آدم جواب دے گا، "پروردگار! میں تیری عیادت کیسے کرتا؟ جب کہ تو سارے جہانوں کا آقا ہے؟"

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تو اس کی عیادت کو نہ گیا، اگر تو اس کی عیادت کو گیا ہوتا تو مجھے اس کے پاس پاتا!"

پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "اے ابنِ آدمؑ، میں نے تجھ سے کھانا کھلانے کو کہا، تو نے مجھے کھانا بھی نہ کھلایا۔"

وہ کہے گا: "پروردگار! میں تجھے کھانا کیسے کھلاتا، جب کہ تو خود ہی سارے جہانوں کا مالک و رازق ہے؟"

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا کھلانے کو مانگا، اور تو نے اسے نہیں کھلایا، اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو اسے (کھانے کو) میرے پاس پاتا۔"

پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا:۔ "اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے پانی پلانے کو کہا، تو نے مجھے پانی بھی نہ پلایا۔"

وہ کہے گا: "پروردگار! میں تجھے کیسے پانی پلاتا، جب کہ تو سارے جہانوں کا رب ہے؟"

اللہ فرمائے گا: "میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی پلانے کی التجا کی، تو نے اسے پانی نہیں پلایا، اگر تو نے اسے پانی پلایا ہوتا تو آج وہ پانی میرے پاس پالیتا۔"

اسلامی سماج کا ضابطۂ اخلاق: حاجت مندوں پر خرچ کرنے اور ان کی ضرورت رفع کرنے پر قرآن نے زور دیا ہے، لیکن زیادہ زور اس پر ہے کہ مدد پوشیدہ کی جائے تاکہ مدد لینے والے کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو، اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے:

"ان تبدو الصدقات فنعما ھی وان تخفوھا و تؤتوھا الفقراء فھو خیر لکم۔
یعنی اگر صدقات علانیہ دو، تو یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو، تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔"[۴۵]

اسلامی سماج کا ضابطۂ اخلاق، ارشاد نبوی کی روشنی میں:

حضرت ابوہریرہ رض سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا: "چھوٹا بڑے کو، چلنے والا بیٹھنے والے کو، اور تھوڑے آدمی بہت سے آدمیوں کو سلام کریں!"

ایک اور حدیث:-

حضرت عبداللہ رض بن عمر رض کہتے ہیں، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی شخص کو یہ سزاوار نہیں کہ کسی آدمی کو اس کی جگہ سے ہٹا کر خود وہاں بیٹھ جائے۔"

دوسری روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ: "دوسرے آدمی کے آجانے پر بیٹھنے والوں کو چاہیے کہ وہ کھل کر بیٹھ جائیں اور جگہ نکال لیں۔"

ایک اور ہدایت:

حضرت عبداللہ رض بن مسعود رض کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم تین آدمی ہو، تو دو خفیہ طور پر کوئی بات نہ کریں، جب تک کہ اور لوگ بھی تینوں میں شامل نہ ہو جائیں، تاکہ تیسرا آدمی رنجیدہ نہ ہو۔"[۴۶]

اس ضابطۂ اخلاق اور اس دستورِ زندگی پر جو سماج عامل ہو، یقیناً وہ فلاحی اور مثالی سماج کہلائے جانے کی مستحق اور سزاوار ہے۔ یاد رہے یہ صرف چند زریں اصول نہیں ہیں، بلکہ ایسے اصول ہیں جن پر دنیا عمل ہوتے دیکھ چکی ہے اور سرِ عقیدت خم کر چکی ہے۔

جو چیزیں کسی ملک، قوم اور سماج کو تباہ کر دیتی ہیں، ان میں ایک چیز

خویش پروری بھی ہے، خویش پروری عبارت ہے، اس بات سے کہ مستحق کو محروم کرکے غیر مستحق کو نوازا جائے۔ یہ چیز عدل و انصاف کے خلاف ہے انسانیت اور شرافت کے بھی خلاف ہے، اسلام نے، اس چیز کو سختی کے ساتھ روکا ہے اور جب تک صحیح معنیٰ میں، اسلامی سماج قائم رہی، اس حکم کی پابندی بھی برابر ہوتی رہی، اور امت مسلمہ اس فتنے سے محفوظ رہی۔

ہمارے سامنے صدیق اکبر کی مثال ہے، انھوں نے جب یزید بن ابی سفیان کو شام کی گورنری پر مامور کیا تو فرمایا:

"تمھاری رشتہ داری کا سلسلہ وسیع ہے، ممکن ہے اپنے عزیزوں کو فائدہ پہنچاؤ، جان لو یہ سب سے بڑا خطرہ ہے، جس سے میں خائف ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

جو مسلمانوں کا حاکم مقرر ہو اور ان پر کسی شخص کو بلا استحقاق رعایت کے طور پر حاکم بنا کر مسلط کرے تو اس پر خدا کی لعنت ہو، خدا اس کا کوئی عذر اور فدیہ قبول نہ فرمائے گا، یہاں تک کہ اسے جہنم میں داخل کردے گا!

اسلامی سماج کے لیے جو ضابطۂ حیات، اور دستور اخلاق، اسلام نے وضع کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے، اس کا نمونہ کہیں اور نہیں مل سکتا، انسانی خطا اور لغزش کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جو نظر انداز کر دیا گیا ہو، فلاح عمومی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جو نظر انداز کر دیا گیا ہو، صالحیت اور انسانیت عظمیٰ کے بام بلند تک پہنچنے کے لیے وہ چیزیں صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں، جو اس کار عظیم کو انجام دینے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

"خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو، آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم پست ہو جاؤ گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

ناانصافی دشمن کے ساتھ بھی نہیں ہونی چاہیئے بہ رد کسی قوم سے عداوت کا ہونا

تمھیں انصاف سے منحرف نہ کردے۔ ہر حالت میں انصاف کرو، کہ یہ تقویٰ سے قریب تر ہے اور تقویٰ اختیار کرو، تم جو کچھ کرتے ہو، خدا خوب جانتا ہے۔[۴۹]

مشرکین مکہ تک سے کہ انھوں نے اسلام اور داعیٔ اسلام کے خلاف کیا کچھ نہ کیا، رحمت و رافت کا برتاؤ کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے:۔

"ان لوگوں کی اس مخالفت کا کہ انھوں نے تمھیں مسجد حرام سے روک دیا تھا، یہ نتیجہ نہ نکلے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو، تم نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ان کی مدد کرو، اور گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ان کا ساتھ نہ دو، خدا سے ڈرتے رہو۔[۵۰]

اسلام لانے سے پہلے دشمنی اور عداوت کا کیا عالم تھا، لیکن اسلام نے سب کو بھائی بھائی بنادیا، اسلام اسے اپنا احسان سمجھتا ہے اور یاد دلاتا ہے:

واصبحتم بنعمته اخوانا "یعنی تم خدا کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔"[۵۱]

یہ بھی فرمادیا کہ مسلمانوں میں جو رشتہ خدا نے قائم کیا ہے، وہ اخوت کا ہے:۔

"انما المومنون اخوۃ "یعنی سب ایمان والے آپس میں بھائی ہیں!"[۵۲]

اللہ تعالیٰ اپنے کن بندوں کو زیادہ "محبوب" رکھتا ہے؟

جو اللہ سے محبت رکھتے ہوں:

"یحبھم ویحبونہ" "یعنی یہ بندے اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ ان بندوں کے ساتھ محبت کرتا ہے۔"[۵۳]

جو احسان کرتے ہوں:

"ان اللہ یحب المحسنین" "یعنی اللہ احسان کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔"[۵۴]

"ان اللہ یحب المقسطین" "یعنی اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔"[۵۵]

"اِنَّ اللہ یحب المتقین ٥" یعنی اللہ تعالیٰ تقویٰ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"[۵۶]

جو تائب ہوں :-

اِنَّ اللہ یحب التوابین۔ "توبہ کرنے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے"[۵۷]

جو صابر ہوں :

واللہ یحب الصابرین "صبر کرنے والوں سے اللہ محبت رکھتا ہے"[۵۸]

جو پاک اور طاہر ہوں :-

"واللہ یحب المطھّرین" "پاک صاف رہنے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے"![۵۹]

اور اللہ کن لوگوں سے محبت نہیں کرتا اور کن باتوں کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے :

جو ڈنکے کی چوٹ برائی کا بیان کرتے ہوں :-

"لا یحب اللہ الجہر بالسّوء" "یعنی اللہ برائی کی اشاعت ناپسند کرتا ہے"[۶۰]

ظالموں سے محبت نہیں کرتا :-

"اِن اللہ لا یحب المعتدین"، "یعنی اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے"[۶۱]

نخوت پسندوں کو پسند نہیں کرتا :

"اِنَّ اللہ لا یحب من کان مختالاً فخوراً" بلاشبہ اللہ تعالیٰ حیلہ باز، اترانے والے کو ناپسند کرتا ہے"[۶۲]

خائنوں سے محبت نہیں کرتا :-

"اِن اللہ لا یحب الخائنین" "یعنی خیانت کرنے والوں کو اللہ ناپسند کرتا ہے"[۶۳]

نیز :

"اِنَّ اللہ لا یحب کل خوان کفور" "یعنی خیانت کرنے والے، احسان کو فراموش کرنے والے، اللہ کو ناپسند ہیں"[۶۴]

شیخی بازوں سے خدا خوش نہیں :

"اِن اللہ لا یحب الفرحین" "یعنی اللہ شیخی باز اترانے والے کو ناپسند کرتا ہے"[۶۵]

فساد برپا کرنے والوں سے خدا خفا رہتا ہے :

فساد برپا کرنے والوں سے خدا خفا رہتا ہے:

"ان اللہ لا یحب المفسدین" "یعنی فساد کرنے والے اللہ کو ناپسند ہیں"[۶۶]

کافروں سے بھی خدا بیزار ہے:

"انہ لا یحب الکافرین" "یعنی اللہ کافروں کو ناپسند کرتا ہے"[۶۷]

فضول خرچ بھی:-

"لا یحب المسرفین" "یعنی اسراف کرنے والے اللہ کو ناپسند ہیں"[۶۸]

ظالموں سے خدا متنفر ہے:-

"انہ لا یحب الظالمین" "ظلم کرنے والے اللہ کو ناپسند ہیں"[۶۹]

اور اس سماج سے ابھر کر جو لوگ مسندِ اقتدار پر متمکن ہوتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔

"ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے بیت المال کا جائزہ لیا تو صرف ایک درہم باقی رہ گیا تھا، انھوں نے سوچا، یہ معمولی سی رقم بھی کیوں پڑی رہے، اٹھا کر حضرت عمرؓ کے بیٹے کو دے دیا۔ انھیں پتہ چلا تو فوراً وہ درہم بیت المال میں داخل کرا دیا، پھر ابوموسیٰ اشعریؓ کو طلب کیا اور کہا افسوس کا مقام ہے کہ تمھیں سارے مدینے میں آل عمرؓ کے علاوہ کوئی دوسرا غریب نظر نہ آیا، کیا تمھاری خواہش ہے کہ قیامت کے روز اُمّتِ محمدیہ کا مطالبہ میری گردن پر رہے"[۷۰]

کفر سازی اور فرقہ آرائی: فرقہ آرائی اور تکفیر کو بھی اسلامی سماج میں داخل ہونے کی اجازت نہیں، حضرت علیؓ ایک خطبہ میں جس کے مخاطب خوارج ہیں فرماتے ہیں:

"اگر تم میرے اس لیے مخالف ہو کہ تمھارا گمان ہے کہ میں نے خطا کی، اور گمراہ ہو گیا تو میری گمراہی کے باعث ساری اُمّتِ محمدیہ کو کیوں گمراہ سمجھنے لگے ہو؟ تمھارے کندھوں پر تلواریں ہیں، تم انھیں صحت و بیماری (گناہ و ثواب) کے موقع پر (بے دھڑک) استعمال کر رہے ہو، اور جس نے گناہ کیا ہے اور جس نے

گناہ نہیں کیا ہے۔ (دونوں کو) باہم خلط ملط کر دیتے ہو، حالانکہ تمھیں معلوم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زانی کو سنگسار کیا، پھر اس پر نماز پڑھی اور اس کے ورثاء کو اس کی میراث بھی عطا فرمائی، قاتل کو بر بنائے قصاص قتل کیا۔ اور اس کی میراث ورثاء میں تقسیم کی، چور کے ہاتھ کاٹے اور زانی بے ہمسر کو تازیانہ کی سزا دی، (بایں ہمہ) انھیں مالِ غنیمت میں حصہ بھی دیا، اور انھوں نے مسلمان عورتوں سے بغیر کسی رکاوٹ کے شادیاں بھی کیں۔ پس ثابت ہوا کہ رسولؐ خدا نے انھیں کافر نہیں قرار دیا، بلکہ ان کے گناہوں کی سزا فرض دی، خدا کا حق ان کے بارے میں جاری کیا، لیکن اسلام میں ان کے جو حصے تھے وہ نہیں روکے، نہ مسلمانوں کی فہرست سے ان کا نام خارج کیا، پھر تم یہ سب کس اصول سے کرتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ تم اشرار الناس ہو کہ جسے شیطان نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے، اور گمراہی کے راستے پر لا ڈالا ہے[۱۱]۔

فرد اور اُمّت: مقروض کا خیال بھی اسلامی سماج میں زیادہ سے زیادہ رکھا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی معذور رہے، تو اس کا بارِ قرض اُمت کے ذمے ہے اور زیادہ ہو تو قرض دینے والا اپنا زرِ اصل کم کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے:۔

ابو سعید خدری رضؓ سے روایت ہے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص نے پھلوں کا ایک باغ خریدا، آفاتِ سماوی کے باعث باغ برباد ہو گیا اور وہ شخص مقروض ہو گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو تلقین کی کہ اس کے بارِ قرض میں حصہ لیں، چنانچہ لوگوں نے امداد کی، لیکن اتنی رقم جمع نہیں ہو سکی کہ سارا قرض ادا کیا جا سکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرض خواہوں سے فرمایا کہ جو مل رہا ہے، لے لو، اس سے زیادہ نہیں مل سکتا[۱۲]۔"

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے ہمراہ تھا، جب آپؐ کی نظر اُحد (پہاڑ) پر پڑی تو فرمایا:

"میں اسے پسند نہیں کرتا کہ یہ پہاڑ میرے لیے سونا بن جائے تو تین دن سے زیادہ اس میں سے میرے پاس ایک دینار بھی باقی رہے، البتہ وہ دینار جسے میں نے قرض ادا کرنے کے لیے روک لیا ہو۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

"دولت مند لوگ نیکیوں کے اعتبار سے بہت کم ہوتے ہیں، مگر ہاں وہ مالدار شخص جو اپنے مال کو اس طرح خرچ کرے۔"

یہ فرما کے آپؐ نے دونوں ہاتھوں سے کھونچ بنا کے آگے اور دائیں بھر بھر کے دینے کا اشارہ فرمایا، یعنی یہ بتلایا کہ کھونچ بھر بھر کے اس طرح دے، اور ہر نیک کام میں بے دریغ خرچ کرے اور ایسے آدمی بہت کم ہیں۔[۳۲]

قرآن کریم کی چند آیات کریمہ بھی اس سلسلے میں پیش نظر رہیں تو بہتر ہے:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ومن هم من عاهد الله لئن اٰتینا من فضله لنصدقن ولنكونن من فضله بخلوا به وتولوا وهم معرضون ہ	"یعنی ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں، جنہوں نے خدا سے عہد کیا، اگر ہم کو مال و دولت عطا کرے گا تو ہم تیری راہ میں صدقہ کریں گے، اور اس طرح صالحین میں سے ہو جائیں گے، پھر جب خدا نے انھیں مال دیا تو مال کی محبت میں خدا کو فراموش کر بخل کرنے لگے۔"[۳۳]

ساتھ ہی ساتھ یہ ہدایت بھی ہے:

"ولا تبذر تبذیرا"	یعنی دولت کو بے جا مت ضائع کرو۔[۳۴]

منافقین کی تعریف:

"المنفقون والمنفقت بعضہم من بعض یامرون بالمنکر وینہون عن المعروف ویقبضون ایدیہم نسو اللہ فنسیہم ان المنفقین ہم الفاسقون"

یعنی منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک ہی قسم کے ہیں، برائی کا حکم دیتے ہیں، نیکیوں سے روکتے ہیں، اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا وقت آئے تو مٹھیاں بھینچ لیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کو بھلا دیا کچھ شک نہیں کہ یہ منافق ہی ہیں جو سخت فاسق ہیں[۵۶]

صحابئ رسولؐ حضرت ابو ذر غفاریؓ تو اسے بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ لوگ، دولت جمع کریں اور امیر سے امیر تر بن جائیں، ایک موقع پر انھوں نے فرمایا:

"اب ایسے کام کیے جانے لگے ہیں، جو میری سمجھ سے باہر ہیں، خدا کی قسم نہ تو اللہ کی کتاب میں ان کی کوئی سند ہے نہ نبیؐ کی سنت میں ان کی کوئی نظیر ملتی ہے۔ بخدا میں دیکھ رہا ہوں، کہ حق پامال کیا جا رہا ہے، باطل کو از سرِ نو زندگی بخشی جا رہی ہے، — دولت مندو! تمھیں چاہیے کہ غریبوں کے ساتھ اخوت کا برتاؤ کرو — اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں، اور خدا کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، انھیں بشارت دو کہ ان کی پیشانی پر، پہلو پر، پشت پر، آگ سے داغ لگائے جائیں گے۔ اے مال جمع کرنے والے، جان لے کہ مال میں تین شریک ہیں:-

ایک تقدیر ہے، جو تجھ سے اجازت نہیں لے گی کہ تباہی یا موت کے ذریعہ تیرے مال کا اچھا حصہ لے جائے یا برا۔

دوسرے وارث ہیں، جو منتظر ہیں کہ تیری آنکھیں بند ہوں اور وہ مال پر قبضہ کریں، اور تو خود مفلس رہ جائے۔

تیسرے تیرا حق ہے، اگر یہ ممکن ہے کہ تو تینوں میں سے سب سے کمزور شریک

بن کر نہ رہے تو ضرور اس کا اہتمام کر!

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یعنی تم نیکی کے درجہ کو اس وقت تک نہیں
لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما پہنچ سکتے، جب تک ان چیزوں کو راہِ خدا
تحبّون میں خرچ نہ کرو، جو تمھیں محبوب ہیں۔

"— لوگو! تم اب ریشمی پردے اور دیباج کے گاؤ تکیے استعمال کرنے لگے ہو۔ اور اب تم آذر بائیجان کے بنے ہوئے (عمدہ) نمدے پر سونے میں تکلیف محسوس کرتے ہو، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر سویا کرتے تھے، تمھارے ہاں طرح طرح کے کھانے دستر خوان کی زینت بنتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جَو کی روٹی بھی میسر نہ تھی کہ شکم سیر ہو کر کھاتے[۴۶]!"

ذخیرہ اندوزی اور ارتکازِ دولت: اسلامی سماج میں ذخیرہ اندوزی اور ارتکازِ دولت بھی حد درجہ معیوب، اور نامرغوب چیز ہے، دولت اس لیے ہے کہ اچھے کاموں پر خرچ کی جائے، اس لیے نہیں ہے کہ اسے زیرِ زمین دفن کر دیا جائے، یا تجوری میں بند کر دیا جائے، یا اس سے غلط قسم کی بلکہ بہیمانہ اور سفّاکانہ منفعت حاصل کی جائے، قرآن مجید نے ارتکازِ دولت کو ذرا بھی پسند نہیں کیا ہے، بلکہ صاف صاف فرما دیا ہے:

کی لا یکون دولۃ بین "تاکہ یہ مال و زر تم میں سے جو دولت مند
الاغنیآء منکم۔ ہیں، انہی کے درمیان چکر نہ لگایا کرے[۴۷]"۔

جو بات آج کے ماہرینِ معاشیات و اقتصادیات، ایک بلند آہنگ فلسفے کے طور پر پیش کر رہے ہیں، وہ بات آج سے چودہ سو سال پہلے عرب کے ایک اُمّی صلعم کی زبان سے قرآن نے کہیں زیادہ جامع و مانع اور اثر انگیز طور پر کھلا دی تھی — صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذخیرہ اندوزی کے بارے میں ارشاد

فرمایا ہے:

"جس نے احتکار (ذخیرہ اندوزی) کیا، وہ غلط رَو ہے۔"[۷]

ایک اور حدیث میں مزید صراحت فرمادی گئی:-

"جس نے چالیس دن تک سامانِ غذا کو ذخیرہ کیے رکھا، اسے اللہ سے کوئی واسطہ نہیں، نہ اللہ کو اس کی کوئی پروا ہے!"

حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اے ابنِ آدمؑ، تیرے لیے ضرورت سے زیادہ مال خرچ کردینا کہیں بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ تو اسے روکے رکھے، کیونکہ یہ چیز برے نتائج کی حامل ہے۔"

حضرت بلال رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے، اسے چھپا کر نہ رکھ، اور جو تجھ سے مانگا جائے، اس میں بخل سے کام نہ لے۔"

مَیں نے کہا: "یا رسولؐ اللہ! یہ کیسے ممکن ہے؟"

آپؐ نے فرمایا: "یا تو یہ کرنا ہوگا، ورنہ (دوزخ کا) ایندھن بننا پڑے گا۔"[۷۹]

دَورِ خلافت راشدہ کے بعد جو حکومتیں قائم ہوئیں، ان میں سے بھی کئی نے اسلام کی اس تعلیم کو عملی جامہ پہنایا، فاطمی عہدِ حکومت میں:

"فتح حاصل کرنے کے بعد جوہر نے جس چیز کی طرف سب سے پہلے توجہ کی، وہ قحط و فاقہ مستی کی اس شدت کو کم کرنے کی کوشش تھی، جو ملک پر عرصہ سے مسلّط تھی، چنانچہ اس نے غلّہ کا ایک گودام قائم کیا، اور اسے محتسب کی نگرانی میں دے دیا، محتسب کا اہم فریضہ غلّہ کے احتکار کو روکنا تھا۔"[۸۰]

آج بھی ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ارتکازِ دولت اور ذخیرہ اندوزی

کے باعث غریب عوام کو کتنی شدید اور ناقابلِ برداشت اذیتوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، لہٰذا ہم صحیح طور پر اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ چیز سماج اور سوسائٹی کے لیے کس درجہ ہلاکت انگیز اور تکلیف دہ ہے! اسلام نے سختی کے ساتھ ارتکازِ دولت اور ذخیرہ اندوزی کا دروازہ بند کر دیا، اور اسلامی سماج جب تک اسلامی سماج رہی، دیانت اور صداقت کے ساتھ اس پر عمل بھی کر دکھایا، جس سماج میں ذخیرہ اندوزی اور ارتکازِ دولت کی لعنت نہ ہو، اس کے سراسر رحمت ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

حضرت علی کی گفتار و کردار: حضرت علی رض نے ایک مرتبہ رات بھر باغ سینچ کر تھوڑے سے جو مزدوری میں حاصل کیے، صبح گھر تشریف لائے، تو ایک ثلث پسوا کر حریرہ پکوانے کا بندوبست کیا، ابھی تیار ہی ہوا تھا کہ ایک فقیر نے صدا دی - آپؓ نے سارا اسی کو دے دیا، اور جو باقی رہ گیا تھا اس کے دوسرے ثلث کے پکنے کی راہ دیکھنے لگے، وہ جیسے ہی تیار ہوا، ایک یتیم نے سوال کیا، وہ بھی بے تامل اسے دے دیا، تیسرا حصہ جو بچ رہا تھا وہ ایک مشرک قیدی کو دے دیا، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اس ایثار نے شرفِ قبول حاصل کیا، چنانچہ آیۂ کریمہ: "ویطعمون الطعام علیٰ حبہٖ مسکیناً ویتیماً واسیراً" اسی موقعہ پر نازل ہوئی۔

یہ مثال اسلامی سماج کے ایک فرد کی نہیں، بلکہ امیر المؤمنین اور خلیفۃ المسلمین کی ہے، گویا یہ ہے وہ نمونہ اور اسوۂ جس پر اسلامی سماج کی بنیاد استوار ہوئی ہے، اس لیے کہ یہ ماخوذ ہے۔ اسوۂ نبیؐ سے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا:

"کوئی بدعت اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی، جب تک کوئی سنت ترک نہیں کی جاتی۔

پس بدعتوں سے اجتناب کرو، اور شریعت کے راستہ کو اپنا لو،

سنتِ رسولؐ کی پیروی کرو، کیونکہ امورِ قدیمہ جو پیغمبرِ اکرمؐ کے عہد میں برقرار تھے، بہترین اور افضل ترین ہیں، اور بدعت ہائے نو بدترین چیز ہیں، کیونکہ ان بدعتوں کا تعلق سنتِ رسولؐ سے ذرا بھی نہیں، بلکہ درحقیقت یہ غیر مذہبی چیزیں ہیں۔ جنھیں جہالت اور نادانی سے مذہبی بنا لیا گیا ہے۔[۸۲]

احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں اسلامی سماج کی تصویر کا اگر نظارہ کیا جائے تو وہ روشن تر اور تاباں تر نظر آئے گی، آپؐ نے فرمایا:

"جس شخص سے اس کا ہمسایہ مامون نہیں، وہ صاحبِ ایمان نہیں۔!"

گویا پڑوسی کو اذیت دینا ایمان کے حلقے سے باہر نکل آنا ہے۔

نیز فرمایا: "جس کی فتنہ انگیزی سے پڑوسی کو چین نہیں، وہ بہشت میں داخل نہ ہوگا!"

یعنی پڑوسی کو ستانا، جہنم میں گھر بنانا ہے۔

بیوہ اور یتیم: ابوہریرہ رضؓ سے مروی ہے:

"بیوہ عورتوں اور مسکین لوگوں کے کام کرنے والا خدا کی راہ میں جہاد کرنے والوں کی طرح ہے۔" یعنی بیواؤں اور مسکینوں کی دستگیری بھی کارِ جہاد ہے!

سہل بن سعدؓ سے مروی ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جنت میں یتیم کی خبر گیری کرنے والا اور میں اس طرح ہوں گے، جیسے یہ دونوں انگلیاں ہیں![۸۳]"

جس سماج میں بیواؤں کو تکلیف دی جاتی، ان کا مذاق اڑایا جاتا، ان کو ہدفِ ستم بنایا جاتا، اور یتیموں کے مال میں تصرف کیا جاتا اور ان کے مال سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے، وہ چاہے جیسی سماج ہو، بہرحال اسلامی سماج نہیں ہے، اسلامی سماج تو وہ ہے جس میں مسکینوں کے لیے

خود فاقہ کر لیا جائے، یتیموں کی خلوص اور دیانت سے دستگیری کی جائے اور بیواؤں کا سہارا بن جائے، — کتنا زبردست فرق ہے۔ دوسری سماجوں میں اور اسلام کی سماج میں!

اسلامی سماج کی خصوصیت: جن چیزوں کو عام طور پر کوئی اہمیت نہیں دی، اسلامی سماج میں انھیں بھی غیر معمولی اہمیّت حاصل ہے، بلکہ کہنا چاہیئے، ان پر سلام اور ایمان کا دارومدار ہے۔

اللہ تعالیٰ کلام پاک میں فرماتا ہے:

"ولا تصعر خدك للناس ولا تمش فى الارض مرحا ان الله لا يحب كل مختال فخور واقصد فى مشيك واغضض من صوتك ان انكر الاصوات لصوت الحمير

"یعنی لوگوں کی طرف سے اپنا منہ کج نہ کیا کرو نہ زمین پر اکڑ کر چلا کرو، اللہ کسی نخوت پسند کو پسند نہیں کرتا، اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آواز نرم رکھو، بے شک سب سے بار سماعت آواز گدھے کی ہے"۔[۸۴]

حضرت عبداللہ رضؓ بن عمر رضؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو ذلیل کرے، اور جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں مصروف رہتا ہے، اللہ اس کی حاجت پوری کرتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان کی مصیبت دور کرتا ہے، اللہ اس کی مصیبت قیامت کے دن رفع کرے گا، اور جو شخص کسی مسلمان کے عیب کی پردہ پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عیوب قیامت کے دن چھپائے گا"۔[۸۵]

اس حدیث میں تین باتوں پر زور دیا گیا ہے:

ایک دوسرے کی حاجت روائی۔

مصیبت کے وقت ایک دوسرے کی دستگیری۔
ایک دوسرے کے عیوب کی پردہ پوشی۔

اور خوش خبری دی گئی ہے، جو کسی کی حاجت روائی کرتا ہے، قیامت کے دن اس کی حاجت روائی ہو گی، جو کسی کی دستگیری کرے گا، روزِ قیامت اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جائے گا، جو دوسروں کے عیب چھپائے گا ستارِ عیوب حشر کے دن اس کے عیبوں پر پردہ ڈال دے گا۔

دنیا کا کوئی انعام اور کوئی ترغیب بھلا اس خوش خبری کا مقابلہ کر سکتی ہے؟

جنگ باہمی سے بڑھ کر اسلام کی نظر میں شاید ہی کوئی چیز مبغوض ہو لیکن ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب یہ ناگزیر ہو جاتی ہے، ناگزیر اس وقت ہوتی ہے جب حق پامال کیا جا رہا ہو، حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیا جا رہا ہو، احکامِ خداوندی نظر انداز کیے جا رہے ہوں،

حضرت علی رضؓ نے اپنے ایک خطبے میں فرمایا:

"اے ہر دم گوناگوں، و دارائے قلوب پراگندہ! جن کے جسم حاضر اور عقلیں غائب ہیں، میں تمھیں حق کے راستے پر لے چلنا چاہتا ہوں لیکن تم اس سے یوں بھاگتے ہو، جس طرح بکری شیر کا دھڑکا سن کر بھاگتی ہے، کس قدر مشکل ہے یہ کام کہ تمھاری کمک سے عدل پنہاں کو آشکار کر دوں اور حق کو (کہ جسے گمراہوں نے کج کر دیا ہے) راست کر دوں۔

بارِ خدایا! تو آگاہ ہے کہ جو کچھ ہم سے صادر ہوا، اس لیے نہ تھا کہ ہم سلطنت و خلافت کی طرف میل و رغبت رکھتے تھے، اس لیے تھا کہ جب فتنہ و فساد کا شیوع ہوا تو تیرے دین کے آثار میں جو تغیر ہو گیا تھا، ہم نے چاہا کہ اسے واپس لائیں اور تیرے شہروں میں اصلاح و آسائش کو برقرار کر دیں تاکہ تیرے ستم کشیدہ بندے امن و آسودگی حاصل کر لیں اور

تیرے احکام جو ضائع کیے جا رہے تھے پھر جاری ہو جائیں!"[۸۶]

دشمن اور معاند ملک کے وزیروں سفیروں اور نمائندوں، یا ممتاز اصحاب میں سے کوئی شخص کٹ کر جب مخالف ملک سے سیاسی پناہ طلب کرتا ہے تو کتنے اہتمام و اعلان کے ساتھ یہ تقریب منائی جاتی ہے لیکن اسلامی سماج ایسی تبدیلیٔ فکر کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی۔

"آپؐ کی عادتِ طیبہ تھی کہ جب قاصد آپؐ کا دین قبول کر لیتا تو آپؐ اپنے پاس اسے نہ روکتے اور نہ اپنی قوم کے پاس جانے سے منع کرتے، بلکہ اسے دوبارہ وہیں لوٹا دیتے۔ جیسا کہ ابو رافعؓ فرماتے ہیں کہ قریش نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، جب میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے دل میں اسلام کی محبت آ گئی، میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسولؐ! میں لوٹ کر نہ جاؤں گا، آپؐ نے فرمایا، میں عہد شکنی نہیں کروں گا اور نہ تمھیں روکوں گا، واپس جاؤ، اگر وہاں جا کر بھی تمھارے قلب میں وہی ایمان رہا جو اب ہے تو لوٹ آنا۔"[۸۷]

سوادِ اعظم: اسلامی سماج میں سوادِ اعظم سے ترکِ تعلق ممنوع ہے، بلکہ اس کا ساتھ دینا منجملہ واجبات ہے۔ اسلام کے جمہوری ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ملک کی اکثریت سے بغاوت اور سرکشی کی اجازت نہیں دیتا اور جماعت سے تعلق قائم رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔

حضرت علیؓ نے ایک خطبے میں فرمایا:

"پس تم بھی اس جماعت کو اختیار کر لو، اور سوادِ اعظم سے وابستہ ہو جاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ جماعت (حق) کی تائید فرماتا ہے اور تفرقہ سے بچو کیونکہ جماعت کو چھوڑنے والا شیطان کا شکار بن جاتا ہے جس طرح گلہ سے نکلنے والی بھیڑ، بھیڑیے کا شکار بن جاتی ہے۔

خبردار! جو شخص تمھیں اس روّیہ (جماعت سے علیحدگی) کی دعوت دے

اسے قتل کردو، خواہ وہ میرے اس عمامہ کے نیچے ہی کیوں نہ ہو!"[۸۸]

غرض اسلامی سماج کو جس پہلو سے بھی جانچا اور پرکھا جائے یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ایسی جماعت پیدا کرتی ہے کہ فرد اس سے کسی حال میں رشتہ منقطع نہیں کر سکتا اور ایسا ضابطہ اخلاق پیش کرتی ہے جو اگر بروئے کار لایا جائے تو دنیا کے سارے مفاسد کا آن کی آن میں خاتمہ ہو سکتا ہے۔

ماخذ :

ے۱ صحیح بخاری عن سعد بن وقاص۔ ے۲ الاحکام السلطانیہ (علامہ سیوطی) ص ۲۴۷۔
ے۳ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۲، ص ۲۰۸، طبع مصر۔ ے۴ صحیح بخاری، کتاب الایمان، عن عبداللہ بن مسعود۔ ے۵ صحیح بخاری، کتاب الاجارہ عن عبداللہ بن عمرؓ
ے۶ سورہ طٰہٰ، پارہ ۱۶ رکوع ۶ آیت ۱۱۹۔ ے۷ سورہ بنی اسرائیل پارہ ۱۵ رکوع ۴ آیت ۳۷۔ ے۸ صحیح بخاری، کتاب الحرث عن انسؓ بن مالک و ابن عباس۔
ے۹ سورہ مائدہ، رکوع ۵، آیت ۳۳ پارہ ۶۔ ے۱۰ سورۂ اعراف رکوع ۱۰، آیت ۷۵، پارہ ۸۔ ے۱۱ صحیح بخاری عن قیسؓ، سہیلؓ، جابرؓ۔
ے۱۲ سورۂ بنی اسرائیل، پارہ ۱۵، رکوع ۴، آیت ۳۶۔ ے۱۳ سورۂ تطفیف پارہ ۳۰، رکوع ۱، آیت ۳۔ ے۱۴ سنن ابن ماجہ و سنن ترمذی۔
ے۱۵ صحیح مسلم و صحیح بخاری دونوں کتابوں میں یہ حدیث مروی ہے۔ ے۱۶ سورۂ بقر پارہ ۱، رکوع ۳۸، آیت ۲۸۰۔ ے۱۷ یہ حدیث صحیحین یعنی بخاری و مسلم میں مذکور ہے۔ ے۱۸ ایضاً۔ ے۱۹ سنن ترمذی۔ ے۲۰ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (استاذ سید قطب شہید) بہ حوالہ: ابو حنیفہ بطل الحریت و التسامح فی الاسلام (استاذ عبدالحلیم الجندی) طبع مصر۔ ے۲۱ صحیح بخاری، کتاب الادب وصلۃ الرحم عن عائشہؓ۔ ے۲۲ (زاد المعاد (ابن قیمؒ) طبع مصر ج ۲، ص ۳۵۵-۳۵۶)۔ ے۲۳ سورۂ فرقان، آیت ۶۳۔ ے۲۴ سورہ شوریٰ آیت ۳۷۔ ے۲۵ سورۂ شوریٰ آیت ۵۴۔ ے۲۶ العدالۃ الاجتماعۃ

فی الاسلام (استاذ سید قطب شہید) ۲۷ھ سورۂ آل عمران، آیت ۶۲۔
۲۸ھ سورہ بینہ، پارہ ۳۰، رکوع ۱، آیت ۷۔ ۲۹ھ سورۂ سجدہ، آیت ۷۵۔
۳۰ھ سورۂ نساء آیت ۵۹، رکوع ۸، پارہ ۴۔ ۳۱ھ سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۳۰،
رکوع ۲، پارہ ۱۵۔ ۳۲ھ زاد المعاد (ابن قیم) طبع مصر، ج ۲، ص ۳۳۳۔
۳۳ھ صحیح بخاری، کتاب المظالم، عن انسؓ بن مالک۔ ۳۴ھ زاد المعاد، ج ۲،
ص ۴۴، ۵۸، ۷۵، ۸۶۔ ۳۵ھ صحیح بخاری، عن ابوذر غفاریؓ کتاب العتق،
۳۶ھ صحیح بخاری کتاب الصلح، عن ام کلثومؓ بنت عقبہ۔ ۳۷ھ سورۂ نساء آیت ۲۰۔
۳۸ھ سورۂ بقرہ، آیت ۳۹۔ ۳۹ھ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۲، ص ۳۵۲، ۳۵۳)
۴۰ھ سورہ اعراف، آیت ۴۰۔ ۴۱ھ زاد المعاد، ج ۲، ص ۴۳۰۔
۴۲ھ بخاری، مسلم، ترمذی، سنن ابی داؤد، مسند احمد بن حنبلؒ، سنن نسائی سے مذکورہ
حدیثیں استاذ سید قطب شہید نے اپنی کتاب "العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام
میں نقل کی ہیں:۔ ۴۳ھ سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۲۔ ۴۴ھ بخاریؒ اور
مسلمؒ کی یہ حدیثیں استاذ سید قطب شہید نے اپنی کتاب "العدالۃ الاجتماعیہ فی
اسلام میں نقل کی ہیں۔ ۴۵ھ سورۂ بقرہ آیت ۲۷۱۔ ۴۶ھ صحیح بخاریؒ
کتاب الاستئذان عن ابی ہریرہؓ۔ ۴۷ھ مسند احمدؒ بن حنبل، ج ۱، ص ۶۔
۴۸ھ سورۂ انفال، آیت ۴۷، رکوع ۶، پارہ ۹۔ ۴۹ھ سورۂ مائدہ آیت ۳ رکوع ۱
۵۰ھ سورہ مائدہ، آیت ۳ رکوع ۱، پارہ ۶۔ ۵۱ھ سورہ آل عمران آیت ۱۰۴، رکوع ۱۱
پارہ ۲۶۔ ۵۲ھ سورۂ حجرات، آیت ۱۳، پارہ ۲۶، رکوع ۱۔
۵۳ھ سورہ مائدہ، آیت ۵۵، رکوع ۸، پارہ ۶۔ ۵۴ھ سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۶
پارہ ۱۔ ۵۵ھ سورہ مائدہ آیت ۴۳، رکوع ۶۔ ۵۶ھ سورۂ توبہ آیت ۴
رکوع ۱، پارہ ۱۰۔ ۵۷ھ سورۂ بقرہ، آیت ۲۲۳، رکوع ۲۸۔
۵۸ھ سورۂ آل عمران، آیت ۱۴۷، رکوع ۱۵۔ ۵۹ھ سورہ توبہ، آیت ۱۰۸۔
۶۰ھ سورۂ نساء، آیت ۱۴۹، پارہ ۴۔ ۶۱ھ سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۱۔

۶۲؎ سورۂ نساء، آیت ۵۹ رکوع ۶ - ۶۳؎ سورۂ انفال، آیت ۵۹ رکوع ۷، پارہ ۹۔
۶۴؎ سورۂ حج، آیت ۳۹، رکوع ۵، پارہ ۱۷ - ۶۵؎ سورۂ قصص، آیت ۷۷،
رکوع ۸، پارہ ۲۰، ۶۶؎ سورۂ قصص، آیت ۷۸، رکوع ۸، پارہ ۲۰،
۶۷؎ سورۂ روم، آیت ۴۷، رکوع ۵، پارہ ۲۱، ۶۸؎ سورہ اعراف، آیت ۲۳،
رکوع ۳، ۶۹؎ سورۂ شوریٰ، آیت ۳۲، رکوع ۳، ۷۰؎ کنز العمال، ج ۶
ص ۳۵۷، ۷۱؎ نہج البلاغۃ، طبع مصر، ص ۸۹۰، ۷۲؎ یہ حدیث
ترمذی کی ہے جسے استاذ سید قطب شہید نے اپنی کتاب العدالۃ الاجتماعیہ فی
الاسلام میں نقل کیا ہے۔ ۷۳؎ صحیح بخاری، کتاب الایون والجز، عن
ابوذر غفاریؓ - ۷۴؎ سورۂ توبہ آیت ۷۶، رکوع ۱۰، پارہ ۱۰۔
۷۵؎ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۳۷، رکوع ۴، پارہ ۱۵، ۷۶؎ سورہ توبہ آیت ۶۰
رکوع ۹، پارہ ۱۰ - ۷۷؎ العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام - (استاذ سید قطب
شہید) ۷۸؎ سورۂ حشر، آیت ۸ رکوع ۱، پارہ ۲۸ - ۷۹؎ ترمذی،
مسلم اور سنن کی دوسری کتابوں میں یہ احادیث مروی ہیں - ۸۰؎ النظم
الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن و علی ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۷۳۵-
۸۱؎ صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب مناقب علیؓ - ۸۲؎ نہج البلاغۃ، طبع مصر،
ص ۱۰۰۶ - ۸۳؎ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۲، ص ۱۷۵، ۸۴؎ سورہ لقمان
آیت ۱۹، رکوع ۳، پارہ ۲۱ - ۸۵؎ صحیح بخاری، کتاب المظالم عن عبداللہؓ
بن عمرؓ - ۸۶؎ نہج البلاغۃ، طبع مصر، ص ۹۲۸، ۹۲۹ -
۸۷؎ زاد المعاد (ابن القیم) ج ۲، ص ۱۶۳ -
۸۸؎ نہج البلاغۃ، طبع مصر، ص ۸۹۱

---

(۳)

خلافت

خلافتِ راشدہ، منہاج و اصول، انتخاب اور شوریٰ اور اس سے مستنبط آثار و نتائج

خلافتِ اسلامیہ ختم ہو چکی اور اب نظر بہ ظاہر احیاء خلافت کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ دنیا کی سب سے بڑی تحریک ہندوستان میں "خلافت" کے نام سے اُبھری اس تحریک نے مسلم ہندوستان کے عوام و خواص کا مزاج بدل دیا، سیرت، کردار اور عادات و اطوار میں تبدیلی پیدا کر دی، مذہبیت کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا جس کی نظیر مشکل سے ملے گی، سلطنتِ برطانیہ اس زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور حکومت تھی، اس حکومت سے خلافت کے پرستاروں نے ٹکر لی، اگر تحریکِ خلافت عالمِ وجود میں نہ آئی ہوتی تو ہندوستان آج تک غلام ہوتا، وہ خلافت کی تحریک ہی تھی جس نے مسلم ہندوستان میں اور ہندوؤں میں سیاسی شعور پیدا کیا، آزادی کی تڑپ پیدا کی، مر مٹنے کا جذبہ پیدا کیا، ایک عظیم مقصد کے لیے ایثار و قربانی کا ولولہ پیدا، ایک مقدس منزل کی طرف طرح طرح کے خطرات و مہالک کے باوجود رہ روی کی ہمت پیدا کی۔ سب کچھ قربان کر دینے کا حوصلہ پیدا کیا۔ لیکن یہ عظیم و جلیل تحریک ناکام ہوئی اور اس کی ناکامی نے ایک غیر معین عرصے کے لیے منہاج خلافت راشدہ پر احیاءِ خلافت کی تجدید و تشکیل کی امیدیں ختم کر دیں۔ اب دنیا کا کوئی ملک خلافت کی تجدید و تشکیل سے دلچسپی نہیں لے رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ عرب تک اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ خلیفہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ حجاز مقدس کا علاقہ اس کی تحویل میں ہو اور

بلادِ اسلامیہ اس کی سیادت کا دم بھرتے ہوں، اس وقت دنیائے اسلام میں نہ کوئی فرد ایسا ہے، نہ کوئی ملک جس پر دنیائے اسلام اتفاق کر کے اس کی بالادستی تسلیم کر لے۔ اکثر مسلمان ملک "نیشنلزم" کے دام ہمرنگ زمین میں گرفتار ہیں، قومیت ہی ان کا مقصد اور منتہا ہے، نظر میں وسعت پیدا کر کے جہانِ اسلام کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے کوئی تیار نہیں، زیادہ سے زیادہ جو ہو سکتا ہے یہ کہ اتحاد عالمِ اسلام کی تحریک کسی وقت پروان چڑھ جائے اور اسلامی ممالک، اقتصادی، سیاسی، فنّی، تعلیمی، علمی اور مالی معاملات سے متعلق ہم آہنگی اور یک جہتی کی صورت پیدا کر لیں، اس سے زیادہ کی توقع موجودہ زمانے میں نہیں کی جا سکتی۔

پھر بھی، ہم خلافت پر، مسئلہ خلافت پر، خلافت کی حیثیت اور نوعیت پر، خلافت کے انعقاد و قیام پر، خلافت کے نظام پر اور خلافت کے وضع و اصول پر گفتگو کرنے پر مجبور ہیں۔

مجبور اس لیے ہیں کہ جب تک خلافت کو اور مسئلہ خلافت کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے سمجھ نہ لیا جائے، ایک اسلامی ملک کی حیثیت سے کوئی مسلمان ملک بھی جمہوریہ اسلامیہ کا قیام عمل میں نہیں لا سکتا۔

خلافت کی تجدید و احیاء نہ ہو سکے، یہ دوسری بات ہے لیکن جب تک اسلامی ممالک موجود ہیں اور انھیں اسلام سے وابستگی پر فخر ہے۔ اس وقت تک وہ نہ اسلامی نظام سے صرف نظر کر سکتے ہیں نہ خلافت کے نظام و اصول کو نظر انداز کر سکتے ہیں، خلیفہ نہ ہو نہ سہی۔ امیر، امام، سربراہ مملکت یا صدر جمہوریہ تو بہرحال ہو گا جو ملک کسی شخص کو امیر، امام، سربراہ مملکت یا صدر جمہوریہ بناتا ہے یا بنانا چاہتا ہے۔ وہ کن اصولوں کو مدِّ نظر رکھے گا؟ کیا کریملن کی شورائیت؟ کیا امریکہ کی عوامیت (ری پبلک) کیا برطانیہ وغیرہ کی پارلیمانی جمہوریت؟ یا ان سب سے الگ کوئی اور نظام، جس میں اسلام کو، اور اس کے وضع و طریق کو، دخل نہ ہو؟

اگر جواب اثبات میں ہے تو کچھ کہنا بے کار ہے، اگر اثبات میں نہیں ہے تو لازم ہے کہ خلافت کی نوعیت اور اس کی حیثیت کو سمجھ لیا جائے، تاکہ اسی کو سامنے رکھ کر ایسا دستور اور نظام بنایا جا سکے، جس کی اسلامیت بہرحال غیر مشکوک اور غیر مشتبہ ہے۔

ایک جائزہ: انسان نے اپنی فہم و خرد کے مطابق مرض کا مداوا مختلف طریقوں سے سوچا، مثلاً:

۱۔ بادشاہت ، ۲۔ جمہوریت اور عوامیت ، ۳۔ آمریت۔
۴۔ اشتراکیت اور اشتمالیت ، ۵۔ طبقاتیت۔

ان میں سے ہر ایک کا دنیا نے تجربہ کر لیا، لیکن کوئی بھی اس کے دکھ کا مداوا ثابت نہ ہو سکا، اس نے بادشاہت کا تجربہ کیا اور اپنے بادشاہ کو ظل اللہ، اوتار، مظہر ذاتِ خداوندی، سب کچھ مان لیا، لیکن اس کے باوجود بادشاہوں کے ہاتھوں نہ اس کی جان بچی، نہ مال، نہ آبرو!

اس نے اپنا خون اور پسینہ ایک کر کے ان بادشاہوں کو پالا پوسا، اور پروان چڑھایا، انھیں اختیار و اقتدار کا غیر مسئول مرکز بنا دیا، لیکن ان بادشاہوں نے اسے غربت، افلاس، تلوار اور کوڑے کے سوا کچھ نہ دیا،

بادشاہت سے رُوگرداں ہونے کے بعد دکھی انسان نے جمہوریت اور عوامیت کے دامن میں پناہ ڈھونڈی، لیکن وہ یہاں بھی نہ ملی، جمہوریت کے تجربہ کو طریقِ انتخاب نے ناکارہ بنا دیا، عوام کے نام پر، عوام کے لیے یعنی انسانی فلاح و صلاح کا بیڑا اٹھا کر جن لوگوں نے عوام سے ووٹ لیے اور عوام کی دی ہوئی کرسیوں پر متمکن ہوئے، اُنہی نے عوام کا گلا کاٹا، عوام کی دولت لُوٹی، عوام کو تباہی و بربادی کے گڑھے میں دھکیلا، اور بالآخر ان کی تباہی و بربادی کے موجب ہوئے، پارٹی سسٹم نے جماعت بندی پیدا کر دی، جماعت بندی نے مفادات کا مسئلہ پیدا کر دیا، انتخاب کے سلسلہ

میں ووٹ کی تجارت اور کاروبار شروع ہوا، غریب رہ گیا، امیر ووٹ خرید کر حاکم اور مالک و مختار بن گیا، بادشاہ منظر سے ہٹ گیا، لیکن اب بادشاہوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی، جن کی سفاکی، درماندگی اور خون آشامی کسی طرح سابق بادشاہوں سے کم نہ تھی۔

عوامیت نے جمہوریت کی شکست و ریخت کو پیوندکاری سے اور طرز انتخاب کی تبدیلی سے پارٹی سسٹم ختم کر دینے سے درست کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بھی کوئی ٹھوس فائدہ عوام کو نہ پہنچا سکی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد دنیا جمہوریت (ڈیموکریسی) اور عوامیت "ری پبلک" دونوں سے بیزار ہوگئی اور امید کی نظر دوسری طرف ڈالنے لگی۔

اب دنیا کے سامنے جو چیز نمودار ہوئی، وہ آمریت کی شکل میں ابھری، لوگوں نے سوچا، وزیر، وزیر اعظم، صدر مملکت، وغیرہ اتنے بادشاہوں کے بجائے اگر ایک غیر مسئول بادشاہ ہو تو زیادہ غیر جانبداری کے ساتھ وہ عوام کی پاسبانی اور ان کے دکھ درد کا مداوا کر سکے گا، بادشاہت موروثی ہوتی تھی، اس کی خرابی کی جڑ وراثت تھی، بادشاہ اچھا ہوتا تھا، اس کا بیٹا نالائق اور نا اہل، چونکہ بادشاہ کا بیٹا ہوتا تھا اس لیے نا اہلی اور نالائقی کے باوجود بادشاہ بنا دیا جاتا تھا، اگر ایسا ہو کہ بادشاہت حین حیات تک کے لیے ہو تو بادشاہت کے مفاسد ختم ہو جائیں گے اور حسنات حاصل ہو جائیں گے اس کی صورت یہ سمجھ میں آئی کہ آمریت کو فروغ دیا جائے، دنیا نے یہ تجربہ بھی کر لیا، لیکن بہت جلد تجربہ بھی ناکام ہو گیا، آمر یا ڈکٹیٹر کی حرص و ہوس اقتدار و اختیار کی بھوک، ظلم اور سفاکی، درندگی اور بہیمیت ظلم اور ناانصافی نے سفاک اور خون آشام بادشاہوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ زار روس کے مظالم اسٹالین کے مقابلے میں قیصر جرمنی کے مظالم، ہٹلر کے مقابلے میں وکٹر عمانوئیل کے مظالم مسولینی کے مقابلے میں کوئی حیثیت رکھتے ہیں؟ کیا ان میں اور ان

میں وہی مناسبت نہیں ہے جو قطرۂ ناچیز کو بحرِ بے پایاں کے مقابلہ میں حاصل ہوتی ہے ؟

اس دور میں آمریت ہی کی ایک شاخ اشتراکیت اور اشتمالیت کے نام سے ابھر چکی تھی۔ شروع میں تو عوام نے فریب کھایا اور اس کے دامِ ہمرنگ زمین کا شکار ہو گئے، انھوں نے سوچا بادشاہت تو ہمارے درد کا مداوا نہ بن سکی، جمہوریت اور عوامیت کی مٹی بھی طبقاتیت، جماعت بندی اور طریقِ انتخاب نے پلید کر دی۔ آمریت نے بھی ثابت کر دیا کہ وہ بادشاہت سے زیادہ سنگین، ناقابلِ علاج اور مہلک ترین ہے۔ یہ اشتراکیت اور اشتمالیت یقیناً ہمارے درد کا درماں ثابت ہوگی، اس لیے کہ اس میں نہ کوئی جاگیردار ہوگا، نہ سرمایہ دار جو اپنے کاشتکاروں اور مزدوروں کے ووٹ خرید لیا کرتا تھا۔ اپنے روپے سے ہر ظلم کو عین انصاف ثابت کر دیا کرتا تھا، اب وہ اور ہم ایک صف میں آجائیں گے، وہ طبقہ ہی ختم ہو جائے گا، پھر ظلم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؛ ناانصافی کی شکایت ہی نہیں ہوگی، اس نظام کے تحت نہ کوئی غریب رہے گا، نہ امیر، لہٰذا انسانیت کے دکھوں کا واحد اور آخری علاج صرف یہی ہو سکتا ہے لیکن جب اس نظام کا تجربہ کیا گیا، اسے عمل کی کسوٹی پر کسا گیا تو معلوم ہوا، یہ نظام آمریت اور قیصریت سے بھی زیادہ عوام کے لیے مصیبت ہے، قیصریت کے دور میں وہ فریاد تو کر سکتے تھے آمریت کے دور میں وہ خوشحال تو تھے، لیکن اشتراکیت نے تو ان کی ہر چیز چھین لی، دولت بھی، آزادیٔ فکر و رائے بھی، آزادیٔ خیال و عقیدہ بھی، آزادیٔ اجتماع و تقریر بھی، یہ ستم کسی نے اب تک نہ ڈھایا تھا، یہ تجربہ بھی ناکام ہوا ——— اب ہم کہاں جائیں، کیا کریں؟ کس سے امید لگائیں اور کس سے مداوا حاصل کریں؟ ——— خداوندا! یہ ترے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

علاج اور مداوا: واقعہ یہ ہے کہ انسانیت کے ان مفاسد کا صحیح اور مکمل اور تیر بہدف علاج صرف اسلام ہے، اسلام نے جو اصول حاکم اور محکوم کے رائج کر دیے ہیں۔ صرف وہی دکھی انسانیت کو تمام امراض سے نجات دلا سکتے ہیں، صرف انہی پر عمل کر کے انسانیت، ایک نئی زندگی سے بہرہ ور ہو سکتی ہے[۱]۔"

مسئلہ خلافت اور اس کا تقابل دوسرے نظاموں سے: پس مسئلہ خلافت پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ ابن خلدون نے خلافت کے مبحث پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے:

"خلافت افراد کو ان کے دینی و دنیوی مصالح کے راستہ پر شرعی نقطۂ نظر کے مطابق چلانے کا نام ہے کہ دراصل دنیاوی مصالح بھی مصالح اُخرویہ ہی کی طرف راجع ہیں اس لیے کہ شریعت کی نگاہ میں تمام دنیوی امور مصالح آخرت ہی کے ماتحت ہوتے ہیں۔ پس فی الحقیقت خلافت حراست دین میں اور دین ہی کی طرح سیاست دنیا میں صاحب شریعت کی نیابت ہے[۲]!"

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن (مصر) نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"یہ وہ زمانہ تھا کہ مشرق میں خلافت اور مغرب میں مقدس رومی شہنشاہیت قائم تھی، دونوں نظام دین کی قوت اور طاقت پر قائم تھے دونوں عالمگیر مذہب تھے، تمام دنیا کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرنا چاہتے تھے، ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ مقدس شہنشاہیت کوئی جدید چیز نہ تھی بلکہ پچھلی بت پرست شہنشاہیت ہی کی ایک مسلسل تصویر تھی۔ یہاں تک کہ شہنشاہ شارلیمان کے القاب بھی وہی تھے جو بت پرست اباطرہ کے تھے دوسرے یورپ میں دو حاکم تھے، ایک دنیاوی فرماں روا تھا، یہ شہنشاہ

کہا جاتا تھا، دوسرا مذہبی حاکم تھا، یہ پوپ کہلاتا تھا لیکن خلافت کسی پچھلے سیاسی نظام کی بنیاد پر قائم نہ تھی، یہ ایک جدید نظام تھا، جس کی تخلیق ان ظروف و احوال کی بنا پر ہوئی تھی جو ظہور اسلام اور بلادِ فارس نیز مشرقی سلطنت روما کے ایک بڑے حصے پر عربوں کی سیادت قائم ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ خلیفہ سیاسی حاکم تھا، مفہوم اس کا یہ تھا کہ اس حاکم واحد کی ذات میں دینی و دنیوی دونوں قسم کی طاقتیں جمع ہو گئی ہیں، اس کا مذہبی فریضہ صرف دین کی محافظت تھا، حامیٔ دین ہونے کی حیثیت سے کفار کے ساتھ وہ اعلان جنگ کر سکتا تھا۔ دین کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو سزائیں دے سکتا تھا۔ نماز میں لوگوں کی امامت کرتا تھا اور جمعہ کا خطبہ دیتا تھا۔ بخلاف پوپ کے کہ اس کی حیثیت ایک قسیس اعظم کی تھی، ایسا قسیس اعظم جو گنہ گاروں کے قصور معاف کرتا تھا اور جسے مذہبی معاملات میں ایک مقتدرِ اعلیٰ کی حیثیت حاصل تھی۔[۳۵]

شوریٰ اور مسئولیت اولی الامر: خلافت میں اقتدار و اختیار کا منبع اور سرچشمہ کیا ہے؟ اس پر گفتگو کرتے ہوئے علامہ عبدالوہاب خلاف نے فرمایا ہے:

"حضرت عمرؓ جب مسند آرائے خلافت ہوئے تو انھوں نے فرمایا کہ:

"اگر تم میں سے کوئی مجھ میں کجی دیکھے تو اسے ٹھیک کر دے!"

ایک اعرابی نے کہا:

"خدا کی قسم اگر ہم نے تم میں کجی دیکھی تو ہم اسے اپنی تلوار سے سیدھا کر دیں گے"۔

غرض احادیث و آثار سے اس نظریہ کی تائید میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

ان آیات واحادیث اور آثار وامثلہ سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام میں نظام نیابی واجب ہے، کیونکہ حاکم اعلیٰ کا امت سے مشورہ لینا اور امت کا اس کو اپنی نصیحتوں سے سرفراز کرنا ممکن ہی نہیں ہے، جب تک کہ عوام میں سے ایک خاص جماعت مرتب نہ ہو، جس کا کام صرف باہمی مشورہ اور نصیحت ہو، جمہوریت کے لیے ان دونوں کا قیام لازمی اور لابدی ہے اور جبکہ حاکم اور محکوم پر یہ مشورہ اور نصیحت واجب اور فرض ہے تو یہ بھی فرض ہوا کہ ایک خاص جماعت امت میں سے قائم ہو جو یہی کام کرے، کیونکہ یہ اصول متفق علیہ ہے۔

"ما لا یتم الواجب الا بہ فھو واجب!"

ان حقائق سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اسلام میں حکومت کا اہم ترین ستون "شوریٰ اور مسئولیت اولی الامر ہے"۔

یہی وہ ستون ہیں جن پر ہر حکومت عادلہ کو اپنا نظام قائم رکھنا پڑتا ہے کیونکہ ہر عادل حکومت کا مرجع اور مصدر یہی ہوتا ہے کہ آخری اختیارات امت کے ہاتھ میں ہوں اور تمام اختیارات کا واحد سرچشمہ یہی ہوا!۔

اب ہم زیادہ وضاحت کے ساتھ ان دو امور پر گفتگو کریں گے جن کو علامہ خلاف نے حکومت کا اہم ترین ستون قرار دیا ہے، یعنی

۱۔ شوریٰ اور ۲۔ مسئولیت اولی الامر

۳۔ اس کے بعد یہ بتائیں گے کہ خلیفہ کا انتخاب کس طرح ہونا چاہیے اس سلسلے میں لازمی طور پر خلفائے راشدین کے طرز انتخاب کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ اسے سامنے رکھ کر ہی کوئی صحیح رائے نظام انتخاب کے بارے میں قائم کی جا سکتی ہے اور یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ خلیفہ کے تقرر میں انتخاب یعنی رائے عامہ کو دخل ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو پھر

نامزدگی اور ولی عہدی دونوں درست ہیں اور اگر نہیں تو دونوں ہی غلط ہیں۔

شوریٰ کا جہاں تک تعلق ہے اس کے بارے میں قرآن کریم نے اس امر کو بالکل صاف اور واضح کر دیا ہے، اس کے بعد کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی۔

قرآن کریم میں وارد ہوا ہے:

وامرھم شوریٰ بینھم "یعنی مسلمانوں کے معاملات (حکومت) باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔"[۵]

اسی طرح ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

وشاورھم فی الامر "یعنی اے نبی معاملات حکومت میں مشورہ کرلیا کرو۔"[۶]

پہلی آیت سے مراد یہ ہے کہ عامۂ مسلمین اپنے معاملات کو پایۂ تکمیل تک اسی وقت پہنچاتے ہیں، جب باہمی طور پر مشورہ کرلیں۔

دوسری آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپؐ صحابہ سے امور ومعاملات جنگ وغیرہ پر مشورہ فرمایا کرتے تھے اور حضرت عمرؓ نے اسی آیۂ مبارکہ کو پیش نظر رکھ کر جب ان پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا، ایک مجلس مشاورت انتخاب خلیفہ کے لیے بنادی تھی۔[۷]

مذکورہ دونوں آیتوں کے بارے میں مزید تصریح وتفسیر:

"امرھم شوریٰ بینھم کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان پیش آمدہ معاملات واحوال پر باہمی مشورت کرکے اقدام وعمل کا فیصلہ کرتے ہیں، جلدبازی سے کام نہیں لیتے اور کسی ایسی رائے پر عمل نہیں کرتے جس کی تائید کثرت آرا سے نہ ہو رہی ہو۔[۸]

"امرھم شوریٰ بینھم" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جلدبازی

سے کام نہیں لیتے، بلکہ پیش آمدہ معاملات ومسائل سے متعلق مشاورت کے بعد کوئی فیصلہ کیا کرتے ہیں[۹]!"

مقدمۂ ابن خلدون کی قدر وقیمت، اہمیت اور افادیت سے انکار کرنا ہرگز مقصود نہیں، اس کا ایک پایہ ہے اور اس کا اعتراف ناگزیر ہے، لیکن افسوس ہے کہ بعض دوسری کتابیں جو اپنے مواد، مغز اور طرز و اسلوب کے اعتبار سے اگر ابن خلدون سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں قرار دی جا سکتیں، تغافل کا شکار رہیں۔ مثلاً الفخری اور طرطوشی کی سراج الملوک یہ دونوں کتابیں بھی فلسفۂ اقتدار و اختیار اور نظامِ مملکت پر عقل و خرد اور دلائل و امثال اور معقول و منقول کی روشنی میں دل آویز پیرایہ بیان کے ساتھ بحث کرتی ہیں، لیکن شاید اختصار کے باعث سکۂ رائج الوقت نہ بن سکیں۔

امام یا خلیفہ کے لیے طرطوشی نے لکھا ہے کہ اسے تین خصلتوں پر عامل ہونا چاہیے:

۱۔ نرم خوئی، ۲۔ سنت نبوی سے اعتصام، ۳۔ مشاورت۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ سے فرماتا ہے:

فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لا انفضو من حولک فاعف عنھم واستغفر لھم وشاورھم فی الامر"!

پھر مشاورت پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ایک سربراہِ مملکت کا سب سے قبیح فعل یہ ہے کہ وہ استبداد بالرائے سے کام لے اور مشاورۃ ترک کر دے[۱۰]!"

اس جگہ یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ قرآن کریم کی مذکورہ دونوں آیتوں میں لفظ "امر" جو آیا ہے اس سے مراد حکومت و خلافت ہی ہے۔

ایک یہ بات بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ دوسری آیت میں رسولؐ کو مشورے کا "حکم" دیا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ رسولؐ کو جو اپنے امتیوں سے مشورہ کرنے کا مشورہ نہیں دیا گیا، ہدایت نہیں کی گئی، بلکہ حکم دیا گیا، آخر اس کی کیا وجہ تھی؟

قرآن کریم میں آیا ہے کہ رسولؐ جو فیصلہ بھی کر دیں، خواہ وہ تمھیں پسند ہو یا ناپسند، خوشی کے ساتھ قبول کر لو، قرآن کریم ہی میں یہ بھی وارد ہوا ہے، کہ آپؐ جو کچھ فرماتے ہیں، وہ اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ آپؐ کا نطق وحی ہوتا ہے، تو جس کا نطق وحی ہو، اور جس کا فیصلہ دل سے قبول کرنا واجب، اور ایمان کی علامت، اسے مشورہ کا حکم کیوں دیا گیا؟

قرآن کریم کے پیرایۂ بیان سے جو لوگ آشنا ہیں، وہ اس حقیقت کے رمز شناس ہیں کہ متعدد مواقع پر مخاطب عوام ہیں لیکن امر تخاطب پر زیادہ زور دینے کے لیے مخاطب آپؐ بنائے جاتے ہیں تاکہ بات کی اہمیت اور قطعیت زیادہ واضح ہو جائے، جس بات کا رسولؐ کو حکم دیا گیا ہے اس سے کوئی اُمّتی کیسے مستثنیٰ ہو سکتا ہے؟ اگر اپنے امیتوں سے مشورہ کرنا رسولِ خداؐ کے لیے ضروری ہے تو افرادِ امت کے لیے تو لازم ہے کہ باہمی مشورہ کر کے کوئی فیصلہ کیا کریں، اور قدم اٹھایا کریں۔

اس جگہ چند نکتے میرے ذہن میں آتے ہیں:

۱۔ پہلی آیت میں شوریٰ کا ذکر "بینہم" یعنی باہمی طور پر فرمایا گیا ہے، اور دوسری آیت میں "ہُم" کا لفظ آیا ہے، یعنی اپنے صحابہؓ سے مشورہ کر لیا کریں۔ ان دونوں الفاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجلس مشورت کو محدود تر نہیں کیا گیا ہے، بلکہ وسیع تر بنا دیا گیا ہے، اس لیے کہ جمع کا استعمال کیا گیا ہے، ورنہ اگر اسے محدود کرنا مقصود ہوتا تو فرمایا جا سکتا ہے تھا۔ اپنے "امر" کا فیصلہ چند لوگوں سے کر لیا کرو۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مشورت صرف چند جنا اور مرحبا اور نعم کہنے والوں تک بھی محدود نہیں ہے، بلکہ جمع کا لفظ بتاتا ہے کہ اس میں ہر مکتب فکر کو شامل ہونا چاہیے۔ اگر اسے محدود رکھنا مقصود ہوتا تو فرمایا جا سکتا تھا کہ مشورہ، اپنے ہمدردوں اور ہوا خواہوں سے کر لیا کرو، ایسا نہیں ہے بلکہ مشورہ سب سے کرنا پڑے گا، کیونکہ بات اسی طرح نکھر سکتی اور واضح ہو سکتی ہے، صرف چند آدمیوں سے یا ہمدردوں اور ہوا خواہوں سے مشورہ کر لینا کوئی معنی نہیں رکھتا، اس سے بات کھل کر اور نکھر کر سامنے نہیں آتی وہ تو اسی وقت نکھر سکتی اور واضح ہو سکتی ہے، جب سب طرح کے لوگوں کی باتیں سُن لی جائیں۔

۳۔ تیسرا نکتہ جو ان آیات کریمہ سے واضح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مشورہ کی تاکید صرف خانہ پُری کے لیے یا برائے بیت نہیں ہے، بلکہ مشورہ اگر نص کے خلاف نہ ہو تو اسے ماننا بھی پڑے گا، اور اگر یہ صورت نہ ہوتی تو فرمایا جا سکتا تھا، مشورہ کر لیا کرو، لیکن اگر اسے اپنی رائے کے خلاف پاؤ تو مسترد کر دو، اس طرح کی کوئی اجازت نہیں دی گئی ہے اور نہ صرف خلفائے راشدین بلکہ آنحضرتؐ تک نے مشورہ لیا ہے اور مانا بھی ہے، آپؐ نے تو اپنی رائے اور مرضی تک کے خلاف بھی امت کی رہبری کے لیے اور اس کے سامنے مثال پیش کرنے کے لیے مشورہ کو قبول فرمایا ہے جیسا کہ جنگِ اُحد کے موقع پر ہوا تھا کہ آپؐ اندرون شہر رہ کر دشمن کا حملہ روکنا چاہتے تھے اور لوگوں کی کثرت رائے یہ تھی کہ باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ آپؐ اندر تشریف لے گئے اور اسلحہ زیب تن کر کے تشریف لے آئے۔

جیسا کہ ابنِ قیمؒ نے فرمایا ہے:

"جنگِ بدر میں جب اشراف قریش قتل ہو گئے تو ان کے رئیس ابوسفیان بن حرب نے تین ہزار کی تعداد میں فوج مرتب کر کے مدینہ کی طرف کوچ کیا۔

یہ واقعہ ہجرت کے تیسرے سال شوال کا ہے، ابوسفیان عینین کے مقام پر احد پہاڑ کے قریب اترا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ آیا مقابلہ مدینہ سے باہر نکل کر کریں، یا مدینہ میں ٹھہریں؟ آپؐ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ سے باہر نہ جائیں اور یہیں قلعہ بند ہوں، اگر وہ شہر میں داخل ہو جائیں تو مسلمان ان سے گلیوں میں مقابلہ کریں اور عورتیں چھتوں پر سے، عبداللہ بن ابی نے اس رائے کی تائید کی، کبار صحابہؓ کی ایک جماعت جو بدر میں شریک نہ ہو سکی تھی، انھوں نے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا، اور اس پر اصرار کیا، عبداللہ بن ابی نے مدینہ ہی میں ٹھہرنے کا اشارہ کیا، آپؐ کی رائے بھی مدینہ کے متعلق تھی، اس لیے بعض صحابہؓ نے آپؐ کی تائید کی۔ بحث مباحثہ کے بعد اٹھ کر گھر تشریف لے گئے اور سلاحِ جنگ زیب تن فرما کر باہر تشریف لائے[۱۲]۔

خلیفہ کا انتخاب: اب اس کے بعد سوال آتا ہے انتخاب کا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "انتخاب" تو ظاہر ہے ہو ہی نہیں سکتا۔ نبوت تو امرِ ربّی پر منحصر ہے جسے اللہ تعالیٰ مناسب سمجھے، اس منصب پر سرفراز کر دے، ویسے محمدؐ بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق تو بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر خدا مشرکین مکہ کے دل میں یہ بات ڈال دیتا کہ ایک نیا نبی بھیجنا ہے اور تمھیں اجازت دی جاتی ہے کہ جسے چاہو منتخب کر لو، ہم جبرائیلؑ امین کے ذریعے اس سے رابطہ پیدا کر دیں گے، تو کوئی شبہ نہیں، مکہ مکرمہ کے لوگ جن کے سامنے آپؐ کی حیات کے شب و روز تھے، جنھوں نے قبل از نبوت آپؐ کو "الامین" اور "الصادق" کا خطاب دے رکھا تھا، آپؐ کے سوا کسی کو منتخب نہ کرتے۔

البتہ آپؐ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد ضرور انتخاب کا سوال پیدا ہوا!

اس موقع پر ایک نکتہ پھر یاد رکھنے اور غور کرنے کے قابل ہے!
"امّت پر وفاتِ نبیؐ سے بڑھ کر بڑا کوئی وقت نہ آسکتا تھا!"
اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اس درجہ پریشان خاطر ہوئے کہ تلوار کھینچ لی، کہ جو کہے گا، آپؐ نے وفات پائی، اس کی گردن اڑا دیں گے۔ اور آپؐ کی وفات کے فوراً بعد ہی ارتداد کا ایک طوفانِ عظیم اٹھا، جو اگر کامیاب ہو جاتا تو اسلام کا خاتمہ تھا، یہی نہیں، بلکہ جھوٹے نبیوں نے سر اٹھایا، چنانچہ مسیلمہ کذاب باقاعدہ آمادۂ جنگ ہوا، اور لشکر لے کر میدان میں آگیا، ذہنی طور پر مسلمان کسی کی وفات سے بھی اس درجہ اندوہگین اور ملول نہیں ہو سکتے تھے، جتنے آپؐ کی وفات سے ہوتے تھے، یہ صرف آپؐ ہی کا طفیل تھا کہ ایک اُجڈ قوم چند سال میں دنیا کی سب سے زیادہ، باخدا، متقی اور حق پر مٹنے والی قوم بن گئی؟
یہی لوگ تھے جو شراب پانی کی طرح پیتے تھے۔ بات بات پر آمادہ بہ جنگ ہو جاتے تھے، جوا کھیلتے تھے فسق و فجور میں مبتلا تھے، عورتوں کو ذرۂ بے مقدار خیال کرتے تھے، لڑکی پیدا ہوتی تو اسے زندہ زمین میں دفن کر دیتے تھے، سود لیتے تھے، صلۂ رحم سے ناواقف تھے، زنا کا ارتکاب کرتے تھے، سوتیلی ماؤں سے شادی تک رچا لیتے تھے۔
لیکن محمدؐ بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طفیل، ایک مضبوط، توانا اور باشوکت قوم بن گئے، اوصافِ حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کا معیار بن گئے، حصولِ مقصد کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کا ان میں جذبہ پیدا ہو گیا، جو ڈاکو اور چور تھے، عابدِ شب زندہ دار بن گئے، جو زانی اور جواری تھے وہ صائم النہار نظر آنے لگے، جو سود خوار اور زرپرست تھے وہ اللہ کی راہ میں سب کچھ لٹانے لگے، کردار، سیرت اور اخلاق کی یہ پیاری نعمتیں جس شخص سے اور جسؐ کے طفیل ملی تھیں، وہ دفعتہً رفیق اعلیٰ سے

جا ملا، وحی کا سلسلہ قیامت تک کے لیے منقطع ہوگیا، اب رہبری کون کرے گا؟ ہدایت کس کے ذمے ہوگی؟ اس بکھرے ہوئے قافلہ کا سالار کون ہوگا؟

اس موقع پر دماغ معطل تھا عقل گم اور حواس جواب دے رہے تھے اور یہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا تھا عین تقاضائے حالات و احوال تھا اور یہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا تھا اپنے وقوع سے پہلے عالم الغیب والشہادۃ یعنی خدائے بزرگ و برتر سے پوشیدہ نہ تھا، اور آپؐ کی فراست و بصیرت بھی اس کا مشاہدہ کر رہی تھی۔

اس سے بہتر موقع نامزدگی اور ولی عہدی کا قیامت تک نہیں پیش آ سکتا تھا۔

اگر وفات کے وقت آپؐ کسی شخص کو خلیفہ نامزد کر دیتے یا کسی کو وفات سے پہلے ولی عہد بنا لیتے تو کس میں یارائے اختلاف ہو سکتا تھا!

لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا! اور سب کچھ جانتے ہوئے نہیں کیا! آپؐ نے اسے گوارا کر لیا کہ امت کو اگر بہت بڑا خطرہ پیش آتا ہے تو آئے لیکن وحی کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد، اب امت کو خود ہی اپنے مستقبل کی تشکیل کرنی چاہیئے۔ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیئے، خود ہی باہمی مشورت سے اپنے "امر" کا فیصلہ کرنا چاہیے۔

اگر آپؐ ایسا نہ کرتے، اور کسی کو وقتِ وفات نامزد کر جاتے یا زندگی میں ولی عہد بنا لیتے تو ایک مثال قائم ہو جاتی، اور اس سے لوگ غلط فائدہ اٹھاتے، لوگ غلط فائدہ اٹھاتے یا نہ اٹھاتے، آپؐ مثال قائم کر کے اس کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے، ورنہ آپؐ کے سامنے اصحاب بدر تھے۔ اصحابِ عشرہ مبشرہ تھے۔ ایسے اصحاب تھے، جنھوں نے ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد، اور پھر فتح مکّہ کے بعد، اسلام کے گراں بہا

خدمات انجام دیے تھے، اس گنجینۂ جواہر سے کسی لعلِ شب چراغ کا اُٹھا لینا آپؐ کے لیے کتنا آسان تھا، مگر آپؐ نے یہ آسان کام نہیں کیا، اور یہ ذمّے داری اُمّت ہی پر ڈالی کہ اپنی آزادانہ رائے سے جسے چاہیے اپنا سربراہ منتخب کر لے۔

چنانچہ آپؐ کی وفات کے فوراً بعد سربراہِ انتخاب کا سوال پیدا ہو گیا چونکہ آپؐ کی غرض یہ تھی کہ انتخاب آزادانہ رائے سے ہو۔ اس لیے نہ انصار کو اپنے امیدوار کی حیثیت سے سعدؓ بن عبادہ کو پیش کرنے میں تامل ہوا، نہ مہاجرین کی طرف سے عمرؓ بن الخطاب کو ابوبکر صدیق رضؓ کا نام نامی پیش کرنے میں کوئی جھجک ہوئی، دونوں طرف سے نرم گرم ہر طرح کی تقریریں ہوئیں۔ سخت اور تند الفاظ کا تبادلہ ہوا[۱۴]، ایک مرحلے پر یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں تلواریں میان سے باہر نہ نکل آئیں۔

لیکن کیا ایسا ہوا؟

تاریخ بتاتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا، نطق و کلام کی تیزی اور تندی کے بعد تھوڑی ہی دیر میں حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب متفقہ طور پر عمل میں آ گیا جو انصارؓ سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنانے میں پیش پیش تھے۔ وہی اب مطمئن اور متفق ہو کر صدیق اکبرؓ کی بیعت پر پروانہ وار ٹوٹ رہے تھے، اور ایسا کیوں نہ ہوتا، صدیق اکبرؓ کا پایہ بھی ایسا ہی تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا انتخاب جس طرح ہوا، وہ بالکل معمولی تھا اور خالص اسلامی اور جمہوری، نہ کسی پر جبر کیا گیا، نہ جور کیا گیا، سب نے مل بیٹھ کر گفتگو کی، بحث کی، پھر ایک فیصلے پر پہنچے، اور سب نے اسے مان لیا، حتیٰ کہ ان لوگوں کے نزدیک بھی، حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب روا اور درست تھا، جو حضرت علیؓ کو دوسرے تمام صحابہ سے افضل مانتے ہیں اور یہ بات ان کا عقیدہ بن چکی ہے چنانچہ امام زیدؒ کا مسلک

یہی ہے۔

"زیدیہ کا مذہب یہ ہے کہ امامت کا تصفیہ اصحاب فکر و خرد کی صواب دید پر منحصر ہے۔"[۱۴۱]

امت کا اختیار اور پسند:۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ معتزلہ کے مذہب میں امامت اُمّت کے اختیار و پسند سے قائم ہوتی ہے اللہ عزوجل نے اس مقصد کے لیے کسی خاص شخص کی تعیین نہیں فرمائی ہے، اس کا اختیار امت کے ہاتھوں میں سونپ دیا گیا ہے۔ کہ اپنے جس فرد کو چاہے تنفیذ احکام کے لیے منتخب کرلے خواہ وہ قریشی ہو یا غیر قریشی۔ صرف اسلام، عدالت اور ایمان کی شرط ضروری ہے۔ نسب وغیرہ کی شرط وہ ملحوظ نہیں رکھتے، ان کے نزدیک ہر زمانہ کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنا ایک امام منتخب کریں، جو لوگ قریش اور قریش کے علاوہ دیگر طبقات میں امامت کو جائز قرار دیتے ہیں، ان میں تمام معتزلہ اور زیدیوں کا ایک گروہ مثلاً حسن بن صالح بن حی وغیرہ شامل ہیں[۱۵]۔

جو لوگ یہ رائے رکھتے تھے کہ خلافت انتخاب سے منعقد ہونی چاہیے ان میں خوارج، بعض صحابہ اور جمہور مسلمین کا بہت بڑا طبقہ شامل تھا۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا، حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب ہنگامی اور فوری صورت حال کا تقاضا تھا (تفصیل آگے آئے گی) اور اسے بہرحال پورا کرنا پڑا، پھر بھی عوام کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ انصار اور مہاجرین نے بہت اچھی طرح اپنے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ اس کے بعد مسند خلافت پر حضرت ابوبکرؓ متمکن ہوئے۔

لیکن حضرت عمرؓ کا انتخاب؟ ظاہر ہے رسول اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت جو بے چارگی اور بے سہارا پن مسلمان محسوس کرنے لگے

تھے اب وہ صورت نہیں تھی، نہ ایسے ہنگامی حالات تھے کہ ایک ہی مجلس میں بحث و گفتگو کے بعد فیصلہ کر دیا جاتا، اور کسی کو مسندِ خلافت پر بٹھا دیا جاتا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے خوب غور و فکر کے بعد ایک شخص کا نام لیا اور کافی بحث و مباحثے کے بعد اسے منظور کر لیا۔

حضرت عمرؓ خلیفہ کس طرح بنے؟ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی رائے میں کسی قسم کی مطلق العنانی سے کام نہیں لیا تھا اور نہ جمہور کو حضرت عمرؓ کی خلافت تسلیم کرنے پر مجبور کیا تھا، بلکہ آپؓ نے اس بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا تھا اور سب نے اس انتخاب کو بہتر کہا تھا[۱۷]

طرطوشی نے بات اور زیادہ صاف کر دی ہے:-

وقتِ مرگ حضرت ابوبکرؓ نے حسبِ روایت حسن بصریؒ فرمایا:

یا معشر المسلمین! یہ میری آخری گھڑیاں ہیں، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو ضروری ہے کہ ایک ایسا شخص ہو جو تمھارے امور کی دیکھ بھال کرے تمھیں نماز پڑھائے، تمھارے دشمنوں سے مقاتلہ کرے، پس اگر چاہو تو سب کو جمع کر لو، تمھارے لیے کوئی امیر منتخب کر دوں، اگر چاہو، تو اپنی صوابدید پر کسی کو نامزد کر دوں؟

لوگ رونے لگے، انھوں نے کہا۔

آپ ہم سب سے بہتر آدمی ہیں، اور سب سے زیادہ دانا و بینا ہیں جسے چاہیئے نامزد کر دیجیے!

انھوں نے فرمایا: "تو میں عمرؓ کو نامزد کرتا ہوں![۱۸]"

انصار جب سقیفہ بنو ساعدہ میں سعدؓ بن عبادہ کی بیعت کے لیے جمع ہوئے تھے تو ان کا خیال تھا۔ "امر" خلافت انہی کا حق ہے[۱۹]، تو حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ نے مطمئن کرنے اور ان کی تائید حاصل

کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ ایسا ہی حضرت عمرؓ کے انتخاب کے موقع پر ہوا۔ یہ نہیں تھا کہ پہلے ہی مرحلے میں سب لوگوں نے دستِ بیعت حضرت عمرؓ کی طرف بڑھا دیے ہوں، بعض لوگ اُن کے مزاج اور سختی کے باعث بیعت پر متامل تھے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے انھیں رضامند کرلیا۔[۲۰] تب عمرؓ کا انتخاب پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

خلافت ایک معاہدہ ہے: سوچنے کی بات ہے کہ حضرت ابوبکرؓ جیسا شخص جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور مزاج شناس رسولؐ تھا، اس نے اس انتخاب میں اپنا کوئی مفاد ملحوظ نہیں رکھا اور اسے بیان بھی کردیا۔

حضرت ابوبکرؓ شدتِ مرض کی حالت میں مجمع کے سامنے باہر تشریف لائے اور لوگوں سے مخاطب ہوکے کہا:۔

"کیا تم اس شخص کو پسند کروگے جسے میں تمہارا خلیفہ مقرر کردوں؟ میں نے غور اور مشورہ میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور اپنے کسی قرابت دار کو نہیں تجویز کیا ہے، بلکہ عمرؓ کو اپنا جانشین بناتا ہوں۔ تم ان کی بات مانو!"

سب نے "سمعنا و اطعنا" کہا،[۲۱] اور بے چون وچرا ابن کثیر کے الفاظ میں "معاہدہ" تسلیم کرلیا۔[۲۱]

اس بیماری کے دوران حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اپنے بعد عمرؓ بن الخطاب کی امارت کا معاہدہ لکھوایا، یہ معاہدہ عثمانؓ بن عفان نے لکھا، لوگوں کو سنایا گیا۔ لوگوں نے اسے تسلیم کیا اور اس کی اطاعت ضروری جانی۔

لفظ "معاہدہ" بہت زیادہ غور طلب ہے۔ ظاہر ہے معاہدے کے دو مساوی فریق ہوتے ہیں، اور ان کی مکمل منظوری ہی سے معاہدہ نافذ ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اس حدیث نبویؐ سے ناواقف نہ تھے۔

"خدا کا عذاب امام (حاکم) جابر پر ہوگا۔"[۲۲ الف]

نہ اس ارشادِ رسولؐ کو نظر انداز کرسکتے تھے:

"امام ظالم میری شفاعت سے محروم رہے گا۔"[٢٢]

پھر وہ استبداد بالرائے سے کام لے کر اللہ کی مرضی کے خلاف کسی کو کس طرح امت پر مسلط کر سکتے تھے، جبکہ اپنے لیے بھی انھوں نے اسے پسند نہیں کیا تھا؛

اب تک ہمارے سامنے انتخاب کی دو صورتیں آچکی ہیں:

١- ہنگامی حالات کا انتخاب ــــ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ کا ہوا۔ لیکن اس میں بھی جمہوری اقدار اور رائے عامہ، اور رضامندی طرفین کو پورے طور پر ملحوظ رکھا گیا۔

٢- عام حالات میں خلیفہ کا انتخاب ــــ جیسا حضرت عمرؓ کا ہوا۔

اس انتخاب سے دو باتوں پر روشنی پڑتی ہے:-

ایک تو یہ کہ خلیفہ، یا امام، یا امیر، یا سربراہ مملکت، اگر کسی شخص کو منصب حکومت کی سربراہی کے لیے مناسب اور موزوں سمجھتا ہو تو بغیر کسی جھجک کے اس کا نام پیش کر سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اپنی تجویز کی رائے عامہ سے منظور کرائے بغیر اسے نافذ نہیں کر سکتا رائے عامہ کو حق ہے کہ اگر چاہے تو اس کی تجویز منظور کر لے، چاہے تو مسترد کر دے۔

حضرت عمرؓ کا طرز کار: اب تیسرا انتخاب ہمارے سامنے آتا ہے۔ یعنی حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے۔ وار اتنا کاری ہے کہ جان بچنے کی امید نہ مجروح کو ہے نہ عامۂ مسلمین کو۔

یاد رکھیے یہ بھی ہنگامی صورت ہے! اور بے انتہا نازک اور پیچیدہ ہنگامی صورت ہے۔

جس طرح ہنگامی حالات میں حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب ہوا تھا، اسی طرح اصحاب شوریٰ کو بلا کر کسی کے ہاتھ پر فوری بیعت کرا سکتے تھے اور صورت احوال اتنی الجھن تھی کہ کوئی انکار نہ کر سکتا،

لیکن جاں بلب خلیفہ نے ایسا نہیں کیا! اس لیے کہ رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی وفات پر جو ہنگامی حالات پیدا ہوئے تھے، ان کی نوعیت کچھ اور تھی، اور ایک خلیفۂ راشدؓ کا زخموں سے نڈھال ہو کر سفرِ آخرت اختیار کرنا لاکھ ہنگامی ہو لیکن رائے عامہ کو چند احتیاطی بندشوں کے ساتھ پورا پورا حقِ انتخاب دینا لازمی تھا۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک نئی صورت تجویز کی۔ انھوں نے تمام لوگوں پر ایک نظر دوڑائی اور گو اُن کی ذاتی رائے حضرت علیؓ کے حق میں تھی[24]۔ لیکن انھوں نے ابو بکرؓ کی طرح اپنی ذاتی رائے بھی لوگوں کے سامنے پیش نہیں کی، صرف یہ کیا کہ جو لوگ اس منصب کے لیے موزوں تر ہو سکتے تھے ان کا ایک پینل بنا دیا اور اس پینل کو حق دے دیا کہ جسے چاہے منتخب کر لے، اس صورت میں اس کا اندیشہ نہیں تھا کہ بعد میں کوئی اپنی محرومی کا شکوہ سنج ہو کر نظامِ حکومت کو متزلزل کر دینے کی کوشش کرے گا۔

یہ پینل بن گیا، اس نے اپنا کام شروع کر دیا، اس نے ایک بزرگ ہستی کو منتخب بھی کر لیا لیکن امت ہرگز اس کی پابند نہیں تھی کہ پینل کے ممبران ہی میں سے کسی کو منتخب کرے، اگر ایسا ہوتا تو عبد الرحمٰن بن عوف جیسا بے لوث اور جلیل القدر صحابی گھر گھر پوچھتا نہ پھرتا، تم کسے خلیفہ بنانا چاہتے ہو؟[25]

بہر حال اس انتخاب کی ضروری تفصیلات بھی نظر کے سامنے رکھنی چاہئیں۔ ابنِ عمرؓ کا بیان ہے۔ وفات سے پہلے عمرؓ پر غشی طاری ہوئی۔ میں نے اُن کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ ہوش میں آئے تو کہا:

"میرا سر زمین پر رکھ دو۔ شاید خدا مجھ پر رحم کرے۔ پھر اپنے رخسار زمین سے رگڑنے لگے، اور فرمایا؟

ہائے عمرؓ۔ ولئے اس کی ماں پر اگر عمرؓ کی مغفرت نہ ہوتی، جب میرا دم نکل جائے تو مجھے دفن کرنے میں جلدی کرنا، اگر انجام بخیر ہے تو جس قدر جلدی اس تک پہنچ جاؤں اچھا ہے۔ اگر بد ہے تو یہ بوجھ تمھاری گردن سے جس قدر

جلد اُتر جائے بہتر ہے۔ پھر گریاں کناں کہا، کچھ خبر نہیں میری منزل جنت ہے، یا جہنم۔[26]

جس شخص کی ذمے داری کے احساس کا یہ عالم ہو، نہ وہ استبداد بالرائے سے کام لے سکتا تھا، نہ اپنے کسی آدمی کو زینتِ مسندِ خلافت بنانے کی کوشش کر سکتا تھا۔

چنانچہ وقتِ مرگ جب حضرت عمرؓ اس باب میں فکرمند نظر آئے تو:

"ایک شخص نے کہا، میں نام بتاتا ہوں، آپ عبداللہ بن عمر کو خلیفہ بنا دیجیے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا، اللہ تم کو سمجھے، تمھارا مقصد اللہ کی خوشنودی نہیں، تم خود غور کرو میں ایسے شخص کو خلیفہ کس طرح بنا دوں جسے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا بھی سلیقہ نہیں آیا، تمھارے معاملات سے ہماری کوئی غرض وابستہ نہیں، میں نے امارت میں کوئی جاذبیت نہیں پائی کہ اپنے خاندان کے کسی فرد کے لیے اسے چاہوں۔ اگر یہ کوئی اچھی چیز تھی تو ہم اس سے بہرہ مند ہو چکے، اور اگر یہ کوئی بُری چیز تھی تو اس بُرائی کو عمرؓ کی ذات پر ختم ہو جانا چاہیے۔ خاندانِ عمرؓ کے لیے یہ کافی ہے کہ اُن کے ایک فرد سے محاسبہ کیا جائے اور ان کا ایک ہی فرد امتِ محمدیہ کے متعلق جواب دہ ہو۔ میں نے اپنے آپ کو اور متعلقین کو بہت سی آسائشوں سے محروم رکھا۔ پھر بھی اگر خلافت کی ذمہ داریوں سے بلا عذاب و بلا عقاب چھوٹ جاؤں تو سمجھوں گا کہ بڑا خوش قسمت ہوں۔ دیکھو! اگر میں کسی کی خلافت کے لیے سفارش کر دوں تو یہ بھی بے جا نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ابوبکرؓ نے جو مجھ سے بہتر تھے ایسا کیا ہے لیکن اگر نہ کروں تو یہ بھی نامناسب نہیں، اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مجھ سے اور ابوبکرؓ سے بہتر تھے کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے دین کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔ یہ جواب پاکر لوگ منتشر ہو گئے۔"[27]

کیا اسلام کی جمہوری روح (عدم وراثت) اور عوام کی بالادستی اور انتخاب

خلافت میں رائے عامہ کی فیصلہ کن حیثیت کو اس سے زیادہ جامع مانع الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہے؟

پینل کی آخری کارروائی:

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے لوگوں سے عثمانؓ و علیؓ کے بارے میں استصواب کیا۔ انھوں نے عوام کی رائے بھی دریافت کی، اور اکابر داعیان کی بھی۔ انھوں نے جماعتی طور پر بھی عام رجحان معلوم کرنے کی کوشش کی اور انفرادی طور پر بھی۔ انھوں نے باہم دگر بھی سوالات کیے اور منفرداً بھی۔ انھوں نے خفیہ طور پر بھی لوگوں کی رائے معلوم کی اور برسرِعام بھی۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے صرف اہلِ مدینہ پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اہالیانِ نواحی مدینہ سے بھی استصواب رائے کیا، اور گنوار عربوں کا دل بھی ٹٹولا، مسلسل تین شب و روز بس یہی ایک کام تھا، جسے وہ سر انجام دیتے رہے۔[۲۸]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بات بالکل واشگاف ہو کر سامنے آگئی اور کوئی پہلو تشنہ نہیں رہ گیا۔

چنانچہ: "عبدالرحمٰنؓ نے کہا کہ میں ذاتی طور پر بھی اس معاملہ پر غور و خوض کر چکا ہوں اور دوسروں سے بھی مشورہ کر لیا ہے۔ لہٰذا اے لوگو! تم اپنے اوپر فتنہ کو راہ نہ دو۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کو بلا کر کہا۔ حلف اٹھاؤ، قرآن و حدیث پر عمل کرو گے، اور ابوبکرؓ و عمرؓ کے نقشِ قدم پر چلو گے۔

حضرت علیؓ نے جواب دیا: ہاں! لیکن اپنے علم سے کام لیتے ہوئے اور بقدرِ استطاعت۔

پھر حضرت عثمانؓ کو بلایا اور اُن کے سامنے بھی وہی الفاظ دہرا دیے جو حضرت علیؓ سے کہے تھے۔

آپؓ نے غیر مشروط وعدہ کر لیا۔ اس لیے خلافت حضرت عثمانؓ کو دے دی گئی ہے۔[۲۹]

ابنِ کثیرؒ کی روایت بھی اسی طرح کی ہے :

عبدالرحمنؓ بن عوف نے بعد نماز کہا۔ میں نے لوگوں سے رائے لی اور مشورہ کیا، وہ تم دونوں (عثمانؓ و علیؓ) کے سوا کسی اور کے حق میں نہیں ہیں۔

پھر عوام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"میں نے خفیہ طور پر تمھاری دلی رائے کے بارے میں تم سے استصواب کیا۔ اور تمھیں ان دونوں —— عثمانؓ و علیؓ —— میں سے کسی ایک سے بھی منحرف نہیں پایا، تم نے بار بار عثمانؓ و علیؓ کو سزاوارِ خلافت بیان کیا۔"[۳۰]

انتخاب کثرتِ رائے سے : حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف نے بجا ارشاد فرمایا ہے کہ خفیہ یا اعلانیہ نجی طور پر یا برسرِ عام جماعتی طور پر یا منفرداً جس سے کسی سے بھی رائے لی، تو محسوس کیا کہ لوگ بس دو ہی آدمیوں کو چاہتے ہیں، یا عثمانؓ کو یا علیؓ کو اور اگرچہ کتبِ تاریخ میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی لیکن واقعات کے بین السطور سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ عبدالرحمن بن عوف نے استصواب رائے کے وقت کثرت آرا حضرت علیؓ کے حق میں پائی ہوگی۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ سب سے پہلے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر ان سے کتاب و سنت اور سیرت ابوبکرؓ و عمرؓ پر بیعت لینے پر آمادہ ہوتے۔ ایسے موقع پر حضرت عثمانؓ کو مؤخر رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ استصواب میں انھوں نے کثرت رائے حضرت علیؓ کے حق میں پائی تھی۔

لیکن حضرت علیؓ کا کردار بھی اس موقع پر کتنا نکھر کر سامنے آگیا ہے۔

بعض حلقوں کی طرف سے صدا بلند ہوتی رہی ہے کہ حضرت علیؓ حصولِ خلافت کے لیے بے قرار تھے۔ اگر واقعی یہی بات تھی تو اب کہ عبدالرحمن بن عوف بیعت کے لیے ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ وہ سیرتِ شیخین کی شرط کو قبول کرنے سے انکار نہ کر دیتے۔ اس شرط کا ماننا انھوں نے اپنی انفرادیت اپنے حق اجتہاد اور امیر و خلیفہ کی حیثیت سے اپنے استحقاق صواب دید کی نفی سمجھا۔ لہٰذا

انھوں نے طے کر لیا کہ خلافت جاتی ہے تو جائے لیکن وہ ایسا وعدہ نہیں کریں گے جسے اصولی طور پر وہ بجا اور درست نہیں سمجھتے۔

حضرت علیؓ کے انکار کے بعد حضرت عثمانؓ کی طرف عبدالرحمٰنؓ ابن عوف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے دونوں وعدے کر لیے۔ یعنی کتاب و سنت اور سنتِ شیخین پر عمل۔ اور حضرت علیؓ نے بے تامل ان کی بیعت کر لی۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا محاکمہ: ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ: بلاشبہ حضرت علیؓ کو اس بات کا حق حاصل تھا کہ حالات اور زمانے کی تبدیلی کو مدنظر رکھتے ہوئے عوام کے مفاد اور مسلمانوں کی سود و بہبود کی خاطر اگر ضرورت سمجھیں تو سیرتِ شیخین سے اختلاف کریں اور اپنی صواب دید پر معاملات کو نمٹائیں۔ حضرت عثمانؓ نے سیرت شیخین والی شرط منظور کر لی تھی۔ یعنی انھوں نے عہد کیا تھا کہ اپنے دورِ خلافت میں کتاب و سنت اور سیرتِ شیخین پر عمل درآمد کریں گے۔ یقیناً حضرت علیؓ نے جو جواب دیا تھا وہ بھی روا اور درست تھا اور حضرت عثمانؓ نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ بھی غلط نہ تھا۔ لیکن کیا حضرت عثمانؓ نے بیت المال وغیرہ کے سلسلے میں وہ روش اختیار نہیں کی جو سیرتِ عمرؓ سے یکسر منافی تھی؟[۳۱]

حضرت عثمانؓ کی شہادت تاریخ اسلام کا بہت بڑا المیہ ہے۔ اس کے اسباب اور وجوہ پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہم تو عہدِ خلافتِ راشدہ کے طرزِ انتخاب اور اصولِ مشورت پر گفتگو کر رہے ہیں۔ ضمناً بلکہ کہنا چاہیے۔ مذکورہ دونوں اصولوں کو واضح کرنے کے لیے ان کی سیرت و شخصیت کے چند پہلو بھی نظر کے سامنے لے آئے۔ بہرحال حضرت عثمانؓ کی شہادت کا معرکہ المیہ رونما ہوا۔

عہدِ خلافتِ راشدہ کا سب سے زیادہ ہنگامہ خیز، فساد انگیز اور پُرفتن دور!

عہد خلافتِ راشدہ کا سب سے زیادہ ہنگامی عہد: حضرت عثمانؓ کو نہ حضرت ابوبکرؓ کی طرح یہ موقع ملا کہ اپنی پسند کے آدمی پر لوگوں کو متفق کرلیں نہ حضرت عمرؓ کی طرح یہ مہلت ملی کہ ایک مجلسِ اکابر قائم کرجائیں، جو کچھ ہوا آناً فاناً ہوگیا لیکن حالات خواہ کتنے ہی الم انگیز ہوں مسندِ خلافت تو خالی نہیں رہ سکتی تھی۔ کاروبارِ مملکت کو سرانجام دینے کے لیے سربراہِ مملکت کا انتخاب ناگزیر اور لازمی تھا۔

اور جو واقعات گذرے ہیں وہ اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے استصواب عام سے یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ اکثریت حضرت علیؓ کے ساتھ ہے۔

جن لوگوں نے مدینہ منورہ پر قبضہ کر رکھا تھا انھیں بھی حضرت علیؓ کی خلافت سے اختلاف نہ تھا اور دیارِ رسولؐ کے رہنے والوں کی غالب اکثریت تو حضرت علیؓ کے ساتھ تھی ہی؛

حضرت علیؓ کس طرح منتخب ہوئے: اب سوال یہ ہے کہ اس موقع پر کیا ہوا؟ — کیا حضرت علیؓ سامنے آگئے اور انھوں نے فرمایا، یہ مسند میری ہے اور میں اس مسند پر متمکن ہوا جاتا ہوں۔ یہ "امر" (خلافت) میرا حق ہے۔ اور میں اس پر قابض ہوتا ہوں۔

ایسا نہیں ہوا، حضرت علیؓ نے اس معاملے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ نفیاً یا اثباتاً کسی طرح کی سلسلہ جنبانی نہیں کی۔ وہ خاموش اپنے گوشۂ عزلت میں بیٹھے رہے۔ جیسے مایوس ہوکر حضرت عثمانؓ کے آخری ایام حیات میں بیٹھ رہے تھے۔

لیکن لوگوں کی نگاہیں ان کے سوا کسی اور پر جا بھی تو نہیں سکتی تھیں۔ آخر لوگ آپ کے پاس آنے لگے اور اصرار کرنے لگے کہ مسندِ خلافت پر متمکن ہو جائیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا؛

"مجھے اس کی تمنّا نہیں کہ تمہارا سربراہ بن جاؤں، اور بھی لوگ موجود ہیں کسی کو منتخب کر لو، میرا دامن نہ کھینچو، میرے نزدیک تو بہ نسبت امیر کے وزیر بننا زیادہ بہتر ہے۔"[۳۲]

لیکن لوگوں کا خاص طور پر انصار کا اصرار قائم رہا، آخر مسجد نبوی میں بیعت شروع ہوئی بیعت کرنے والوں میں پہلے حضرت طلحہؓ نے پھر حضرت زبیرؓ نے بیعت کی۔[۳۳]

یوں سمجھنا چاہیے۔ خلفائے راشدین میں صرف حضرت علیؓ ہی کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ ان کی بیعت عوام کی بیعت تھی، یعنی نہ ان کے پیش رو نے ان کا نام پیش کیا تھا، نہ کوئی مجلس انتخاب قائم کی تھی، انتخاب کی تمام تر ذمے داری عامۂ مسلمین اور اصحاب حل وعقد کے ہاتھ میں تھی اور انھوں نے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا کہ خلیفہ علیؓ کو ہونا چاہیے۔ اور یہ انتخاب اہل جمہوری تھا۔

"حضرت علیؓ کا انتخاب اقدار جمہوری حامل تھا، اہل مدینہ نے آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی، یہ صحیح ہے کہ تمام مسلمانوں نے بیعت نہیں کی تھی؛ لیکن غالب اکثریت اس میں شریک تھی۔

حضرت علیؓ کا انتخاب گویا عہد خلافتِ راشدہ میں جو اُمّت کے لیے مشعلِ راہ تھا، بیعت کی تیسری قسم تھی۔

پہلی یہ کہ خلیفہ نے اپنی پسند کا آدمی مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اور عوام کو اپنا ہمنوا بنا کر اس کی خلافت پر متفق کر کے بیعت لے لی۔

دوسری یہ کہ خلیفہ نے ممکن مستحقین منصب پر مشتمل ایک مجلس انتخاب قائم کی، اور اس نے ایک شخص کو خلیفہ منتخب کر لیا اور عام مسلمانوں نے اس فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے اس کی بیعت کر لی۔ تیسری یہ کہ نہ خلیفہ کی طرف سے کسی کا نام پیش ہوا، نہ اس نے کوئی مجلس انتخاب قائم کی، بلکہ خود بخود وہی صورت پیش آگئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیش آئی تھی، یعنی نہ نامزدگی، نہ تقرر، نہ سفارش، امت کو اختیار تھا، جسے چاہے منتخب کرلے۔ اس نے اپنے اس اختیار سے

فائدہ اٹھایا، اور چوتھے خلیفہ راشد کو منتخب کر لیا۔

حضرت علیؓ کا طریق کار: آخر چوتھے خلیفہ راشد کا دور بھی ختم ہوا، ایک خارجی نے عین حالتِ نماز میں آپؓ پر قاتلانہ وار کیا جو کاری ثابت ہوا؛ اور زندگی کی ساری امیدیں منقطع ہو گئیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ حضرت علیؓ اپنے آپ کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق، برادر و خویش رسولؐ ہونے کے باعث سمجھتے تھے، تو ان کے لیے کیا مشکل تھا کہ اپنے صاحبزادوں میں سے کسی کو نامزد کر جاتے، یا کم از کم وصیت کر جاتے، مگر ایسا نہیں ہوا، نہ آپ نے کسی کو نامزد کیا، نہ کسی کے لیے وصیت کی، لوگوں نے پوچھا:

"اگر آپؓ وفات پا جائیں تو کیا ہم حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں؟"

آپ نے جواب دیا: "نہ حسن کی بیعت کا تمھیں حکم دیتا ہوں، نہ اس سے منع کرتا ہوں، تم خود دانا، بینا ہو، جسے چاہو، منتخب کر لو!"[۳۴]

یہ روایت دوسری متداول اور مستند تاریخوں ــــ مثلاً ابن کثیر اور طبری وغیرہ ــ میں بھی مذکور ہے لیکن خاص طور پر ابن خلدون کا حوالہ ہم نے اس لیے دیا ہے کہ ابنِ خلدون کو امویوں کا بہت زیادہ طرف دار اور حامی مانا جاتا ہے، اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ مورخ اندلس کی اموی حکومت کے دور کی پیداوار تھا، اس کی نشو و نما، تعلیم و تربیت اور تہذیب و تکمیل اسی ماحول میں ہوئی، ظاہر ہے، ماحول کا کچھ نہ کچھ اثر پڑتا ہی ہے، پھر بھی اس نے تسلیم کیا ہے کہ اس باب میں حضرت علیؓ کا اصول وہی تھا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ یعنی جس طرح آپؐ نے یہ "امر" امت کی صواب دید پر چھوڑ دیا تھا، حضرت علیؓ نے بھی ایسا ہی کیا۔

لیکن حضرت علیؓ نے اپنے صاحبزادوں کو ایک وصیت ضرور کی تھی۔ حضرت علیؓ نے وقت وفات حسنؓ و حسینؓ کو بلایا اور فرمایا:

"میں تمھیں خدا سے ڈرنے (تقویٰ) کی، آخرت سے رغبت کی اور دنیا سے

نفرت کی وصیت کرتا ہوں ـــــ میں تمھیں دوست اور دشمن کے ساتھ یکساں عدل کرنے کی وصیت کرتا ہوں! (یاد رکھو) جنت کے مقابلے میں ہر نعمت حقیر ہے اور دوزخ کے مقابلے میں ہر بلا، عافیت ہے، یاد رکھو جس کی نظر اپنے عیب پر ہے وہ دوسروں کے عیب نہیں دیکھتا، جو اپنی غلطیاں فراموش کر دیتا ہے اسے دوسروں کی غلطیاں بہت بڑی دکھائی دیتی ہیں، جس نے اپنی رائے پر گھمنڈ کیا گمراہ ہوا، جس نے اپنی عقل کو کافی سمجھا ٹھوکر کھائی، جس نے نخوت کو شعار بنایا، ذلیل ہوا[۳۳]۔

استاذ سید قطب کا فکر آفرین تبصرہ: خلفائے راشدین کے انتخاب اور طرزِ انتخاب پر استاذ سید قطب شہید نے بڑی فکر آفرین گفتگو کی ہے وہ حضرت ابوبکرؓ کے طرزِ انتخاب پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مہاجرین میں خلافت کے انعقاد کے متفقہ فیصلے سے یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ منصبِ خلافت قطعی طور پر قریش کے لیے وقف ہو گیا تھا اگر صورتِ احوال یہ ہوتی تو حضرت عمرؓ نے جب انتخابِ خلیفہ کے لیے مجلسِ شوریٰ قائم کی تھی، تو یہ نہ فرماتے کہ اگر ابو حذیفہ کا غلام سالم زندہ ہوتا تو میں اسے خلافت سونپ جاتا، کیونکہ جانتے تھے کہ سالم قریشی نہیں تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شرطِ قرشیت ایسی چیز ہے جو روحِ اسلام سے معارض ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ قریش کو عامۂ مسلمین پر فوقیت صرف اس لیے دی جاتی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم نسب ہیں حالانکہ خود جناب رسالت مآبؐ کا ارشاد ہے کہ:

"جس شخص کو اس کے عمل نے پیچھے کر دیا اسے اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا، اس حدیث کو مسلم، ابوداؤد، اور ترمذی نے روایت کیا ہے"۔

پھر حضرت عمرؓ کی خلافت پر گفتگو کرتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں:

"حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کی خلافت تسلیم کرائی، لیکن اس سے یہ

نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ابو بکرؓ نے مسلمانوں کو اپنی رائے پر مجبور کر دیا تھا۔ مسلمانوں کو از روئے شریعت اس امر کا حق حاصل تھا کہ سفارش رد کر دیتے اور کسی دوسرے کو خلیفہ منتخب کر لیتے۔ عمرؓ اس لیے خلیفہ نہیں بن گئے کہ ابو بکرؓ نے انھیں نامزد کر دیا تھا۔ خلیفہ تو اس وقت ہوئے جب لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور عوام نے ابو بکرؓ کی رائے سے اتفاق کر لیا۔

حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے بارے میں فرماتے ہیں:

"حضرت عمرؓ نے مجلسِ شوریٰ اپنے بعد خلیفہ منتخب کرنے کے لیے قائم کی جسے اپنے ہی اندر سے کسی آدمی کو چُننا تھا لیکن مسلمان (شرعاً) ہرگز اس امر پر مجبور نہیں تھے کہ لا محالہ انہی چھ حضرات میں سے کسی ایک کو منتخب کریں ویسے امرِ واقعی یہ ہے کہ یہ حضرات جن پر مجلس شوریٰ مشتمل تھی، امت کے بہترین فرد تھے، اور عمرؓ کی نگاہِ انتخاب نے یقیناً صحیح تر لوگوں کو چنا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہی میں سے ایک کو عام مسلمانوں نے اپنا خلیفہ بنا لیا۔

حضرت علیؓ کے بارے میں ارشاد ہے:

"حضرت علیؓ کی بیعت اس طرح ہوئی کہ ایک جماعت اس پر رضا مند تھی، کچھ حضرات نے مخالفت کی (لیکن اکثریت علیؓ ہی کے ساتھ تھی)"۔

حضرت علیؓ کو خلافت کے معاملے میں پیچھے رکھنا خاص طور پر عمرؓ کے بعد انھیں خلیفہ منتخب نہ کرنا، ان کے ساتھ زیادتی تھی اور ہماری رائے تو یہ ہے کہ تاریخِ اسلام کا یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ عمرؓ کے بعد علیؓ کو خلیفہ نہیں بنایا گیا لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ حضرت علیؓ کا مؤخر رکھا جانا اسلام کے تصوّرِ حکومت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے غیر معمولی اہمیّت کا حامل ہے۔ اسے مؤخر کیے جانے میں جو مصلحت (قدرت کی طرف سے) کار فرما تھی یہ تھی، کہ وراثت کا استحقاق اس منصب کے قریب بھی نہ پھٹک سکے، کیونکہ موروثی حکومت اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے بالکل متصادم ہے۔ حضرت علیؓ کی

ذاتِ گرامی کی اگرچہ حق تلفی ہی ہوگئی ہو لیکن وراثت کے تصوّر سے اس منصب کو پاک رکھنے کا مظاہرہ اس حق تلفی سے کہیں زیادہ اہم تھا[۳۶]۔

حکام کا تقرر عوام کی مرضی سے : یہ حضرات خلفائے راشدین وہ تھے، جنھوں نے حکام و عمال اور گورنروں کا تقرر بھی صرف "حسب الحکم" نہیں کیا، بلکہ رائے عامہ کو ملحوظ رکھا۔

"حضرت عمرؓ کے عہد میں صوبوں اور ضلعوں کے حکام کا تقرر وہاں کے لوگوں کی مرضی سے کیا جاتا تھا، کوفہ، بصرہ اور شام کے صوبوں میں انھوں نے جن لوگوں کو عامل خراج مقرر کیا، وہ وہی تھے جن کی سفارش ان مقامات کے عوام نے امیرالمؤمنین سے ان کی دیانت و امانت کی بنا پر کی تھی، چنانچہ وہی حضرات مقرر ہوئے[۳۷]!

عوام کی گردن پر وہی لوگ مسلط ہوتے ہیں، اور ان کے لیے من مانے حکام بھی وہی مقرر کرتے ہیں جو حکومت کو خدائی امانت نہ خیال کرتے ہوں، بلکہ ذاتی املاک و جاگیر سمجھتے ہوں، خویش پروری، اقربانوازی، مفاد پرستی، انہی دلوں میں گھر کرسکتی ہے جو خدا سے غافل ہوں اور فکرِ آخرت سے بے نیاز ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو ذاتی جلب منفعت اور استحصال کا ارادہ رکھتے ہوں لیکن جو لوگ اسے بارِ گراں سمجھے ہوں وہ نہ مسلط ہو سکتے تھے نہ مسلط کر سکتے تھے۔ ان کی زندگی کا جو جلوہ نظر کے سامنے ہے۔ وہ تو یہ ہے :

سبق آموز مثالیں : "حسن بصریؒ کہتے ہیں۔ جب ابوبکرؓ کا وقت وفات بالکل قریب آگیا، تو انھوں نے لوگوں سے کہا، ذرا پڑتال کرو۔ میں نے کتنا مال خرچ کیا ہے؟ معلوم ہوا، ڈھائی سال کی مدّت میں ۸ ہزار درہم خرچ کیا ہے؟ معلوم ہوا، ڈھائی سال کی مدّت میں ۸ ہزار درہم خرچ کیے، فرمایا، یہ رقم میری طرف سے واپس کردی جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

حضرت انس رضؓ سے مروی ہے کہ عہدِ عمرؓ میں ایک مرتبہ اناج گراں ہو گیا تو آپ رضؓ نے جو کی روٹی کھانا شروع کر دی!

ابو عثمان النہدی کی روایت ہے کہ میں نے عمر رضؓ بن خطاب کو بیت اللہ کا طواف کرتے اس حالت میں دیکھا کہ ان کے جُبّے میں بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ عمر رضؓ بن خطاب جب کسی شخص کو عامل (گورنر) بناتے تھے تو اسے ہدایت کر دیتے تھے، کہ وہ خچر پر نہ بیٹھے، اعلیٰ درجے کے کپڑے نہ پہنے۔ نہ اعلیٰ درجے کا کھانا کھائے۔ نہ حاجب و دربان رکھے۔ نہ حاجت مندوں پر دروازہ بند رکھے۔[۳۸]

حضرت علی رضؓ کی زندگی عہدِ کشور کشائی سے پہلے جتنی سادہ اور زاہدانہ تھی اس کے بعد بھی ویسی ہی رہی۔ نہ انھوں نے کاروبار میں حصّہ لیا، نہ تجارت کی طرف توجہ کی۔ بیت المال سے جو معمولی سا وظیفہ ملتا تھا، اسی پر قانع تھے۔ کچھ تھوڑی سی زمین تھی، وفات پائی تو جو ترکہ نکلا! وہ سات سو درہم سے زیادہ نہ تھا جسے تھوڑا تھوڑا کر کے اس لیے جمع کیا تھا کہ ایک خادم کا بندوبست کر لیں۔

اپنے عہدِ خلافت میں حضرت علی رضؓ موٹا جھوٹا لباس استعمال کرتے تھے اس میں بہت سے پیوند لگے ہوتے تھے، ہاتھ میں تازیانہ لیے بازار کا گشت کرتے، اور حضرت عمر رضؓ کی طرح عوام کی ہدایت اور رہبری۔ حضرت عمر رضؓ نے بالکل صحیح فرمایا تھا کہ اگر یہ شخص خلیفہ بنا لیا گیا تو لوگوں کو راہ راست سے ادھر ادھر نہیں ہونے دے گا۔[۳۹]

بھلا یہ لوگ جن کی کوئی ذاتی غرض نہیں تھی جنھیں زراندوزی کا چسکا نہیں تھا، جو فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے، جو خدا سے ڈرتے اور ڈراتے رہتے تھے، کسی طرح بھی گوارا کر سکتے تھے کہ امت کی مرضی کے خلاف اس پر مسلط ہو جائیں اور امت کی مرضی کے خلاف جابر اور مفاد پرست حاکموں کو

ان پر مسلّط کر دیں۔ کلّا ثم کلّا!

حضرت علیؓ کے بارے میں طٰہٰ حسین نے اپنی دوسری کتاب میں گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے:

"خدا کی رحمتیں ہوں عمرؓ پر، ان کی فراست کا جواب نہ تھا، انھوں نے بالکل درست رائے قائم کی تھی، کہ اگر خلافت علیؓ کو دے دی جاتی تو وہ لوگوں کو آسانی سے منحرف نہ ہونے دیتے۔

عمرؓ نے محسوس کیا کہ علیؓ ان سے غیر معمولی مماثلت رکھتے ہیں۔ حق کے لیے سخت، اور حق کے سامنے سرنگوں، حق کے منکروں کے لیے پیامِ اجل!

آگے چل کر اسی کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے ایک اور موقع پر کہا ہے:

"علیؓ کو اگر کوئی چیز خریدنی ہوتی تو بازار میں ایسے شخص سے خریدتے جو انھیں پہچانتا نہ ہو، یہ بات انھیں سخت نامرغوب تھی کہ خلیفہ سمجھ کر خرید و فروخت میں ان کے ساتھ امتیازی برتاؤ کیا جائے"

جو لوگ مسندِ خلافت پر بیٹھنے کے بعد، اتنے محتاط اور پاک نہاد ہوں، اور حلبِ منفعت کا خیال بھی دل میں نہ لائیں، ظاہر ہے مسلمانوں کے بیت المال کے سلسلے میں وہ کتنے زیادہ محتاط نہ ہوں گے؟ اور اس کی پائی پائی کس درجہ سوچ بچار کے بعد خرچ کرتے ہوں گے"؟

موازنہ بھی اور نمونہ بھی: سفیان ثوریؒ کا بیان ہے کہ خلیفہ مہدی جب حج کے لیے مکہ آیا تو میرے گھر بھی مجھ سے ملنے کے لیے آیا، میں نے پوچھا: "اس سفر میں تم نے کتنا صرف کیا؟"

مہدی نے جواب دیا: "معلوم نہیں!"

میں نے کہا: "کل جب خدا یہی سوال کرے گا، تو کیا جواب دو گے؟

عمرؓ نے جب حج کیا تو اپنے خادم سے پوچھا۔ "اس سفر میں کتنی رقم خرچ ہوئی ہے؟"

وہ کہنے لگا ! " یا امیر المومنین ! ۱۸ (اٹھارہ) دینار !"

یہ سُن کر عمرؓ نے کہا : تو سارا بیت المال خالی کیے دے رہا ہے ؟

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ بیت المال سے میرے لیے جو کچھ جائز ہے ، وہ یہ کہ ایک جوڑ ا جاڑوں کا ، ایک گرمی کا ، اور اپنا اور اپنے اہل و عیال کا نان و نفقہ ، جتنا ایک متوسط الحال قریشی کا ہوتا ہے !

حضرت علیؓ فرماتے ہیں : " اپنے کھانے پینے سے جو مال زیادہ تم نے جمع کیا ہے وہ دوسرے کا ہے اور تم اس کے خزانچی ہو"[۴۱] !

یہی وجہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد جو دَور شروع ہوا ، اسے دیکھ کر غیر مسلم مؤرخ آرنلڈ ٹنک کہہ اٹھا :

" حضرت امیر معاویہؓ کے ہاتھ میں قوت و اقتدار آنے کے معنی یہ تھے کہ آج سے وہ نظامِ شوریٰ ختم ہو رہا ہے جو خلفائے راشدینؓ کے انتخاب میں اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا ، اور خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو رہی ہے ، اس منصب پر وہی شخص فائز ہو سکتا ہے جس کے ہاتھ میں تلوار ہو ، سیاست ہو ، اور وہ اپنے دشمنوں کو دھوکا دینے کی تدبیریں جانتا ہو ، اور حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے لڑکے یزید کو اپنا ولی عہد نامزد کیا ، تو یہ اس بات کا اعلان تھا کہ آئندہ خلافت میں بھی وراثت چلے گی ۔ بنی عباسؓ نے بھی اپنے عہد میں اسی نظام کو اختیار کیا ، اور اس طرح مسلمان اپنے "حق طبعی" یعنی "شوریٰ" سے محروم ہو گئے ، جس سے عرب مانوس تھے ، جسے لے کر قرآن آیا تھا ۔ اور جس کی تائید احادیث نبویؐ نے کی تھی"[۴۲] ۔

معاویہ بن یزید کی تقریر : اور یزید کے بعد تو اس کا بیٹا بھی چیخ اُٹھا :

" یزید کی موت کے وقت بنی امیہ کی فوج مکّہ کے محاصرہ میں مصروف تھی یزید کا لڑکا معاویہ ثانی اس کا جانشین ہوا ۔ اس کی خلافت چالیس دن سے زیادہ نہ رہی ۔ وہ خود خلافت سے دستبردار ہو گیا ، اور ان الفاظ کے ساتھ اس

مسئلہ کو جمہور کے شوریٰ پر چھوڑ دیا کہ تم اپنے معاملہ کے سب سے زیادہ مالک مختار ہو۔ جسے چاہو، خلیفہ بنالو، پھر منبر پر آیا، اور لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"لوگو! جن لوگوں کا یہ معاملہ تھا، میرے دادا معاویہؓ ان سے جھگڑ بیٹھے، اور جو شخص اس امر کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف قرابت کی وجہ سے ان سے زیادہ حقدار تھا، اس سے لڑ گئے، یہ شخص حضرت علیؓ بن ابی طالب تھے، اور معاویہ نے تمھارے ساتھ بھی زیادتیاں کیں، جن سے تم واقف ہو، یہاں تک کہ ان کی موت آئی اور اپنے بوجھ سے لدے ہوئے اور اپنی غلطیوں میں محبوس اپنی قبر میں چلے گئے، ان کے بعد میرے والد نے اس طوق کو پہنا، وہ اس امر کے اہل نہ تھے، انھوں نے ہوائے ہوس کو راہ دی؛ امارت نے بھی ان سے وفا نہ کی اور موت نے ان کا راستہ کوتاہ کر دیا۔ وہ بھی اپنے گناہوں میں لت پت اور اپنے جرم میں محبوس اپنی قبر میں چلے گئے۔" یہاں تک پہنچ کر" معاویہ ثانی رونے لگا، اور اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔" پھر سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"ہماری سب سے بڑی مصیبت، ان کا سوءِ انجام، اور ان کی عاقبت کی رسوائی ہے۔ انھوں نے آلِ رسولؐ کو تہ تیغ کیا، حرم میں قتل وغارت کی۔ اور کعبہ کو تباہ و برباد کیا، تمھارے بھلے یا برے کام کے نتائج کا میں ذمہ دار نہیں بن سکتا، تم اپنے معاملہ کے مالک و مختار ہو، اگر دنیا بھلی ہے تو خدا کی قسم! ہم اپنا حصہ اس سے پا چکے، اور اگر بری ہے تو اولاد ابی سفیان کو جو کچھ اس سے پہنچ چکا، وہی کافی ہے۔ انس بن مالک نماز میں لوگوں کی امامت کریں، اپنی خلافت کے بارے میں تم لوگ باہمی مشورہ کر لو، اللہ تم پر رحم کرے۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر چلا گیا، اور پھر باہر نہ نکلا۔ اسی حال میں اسی سال اس کا کچھ دن بعد انتقال ہو گیا۔[۱]

ایک بالغ نظر مؤرخ کہتا ہے:

"دوسرے لفظوں میں امویوں نے اس نظامِ خلافت کو بدل دیا جس کی بنیادیں شوریٰ اور دین پر قائم تھیں، اور اس کے بجائے سلطنت کے اس نظام کو پیش کیا، جس کی اساس وراثت پر مبنی ہوتی ہے اور جو اپنے سامنے سیاست کو پہلے اور دین کو دوسرے درجہ پر رکھتا ہے۔

خلافتِ اموی، مذہب کے مقابلہ میں سیاست سے زیادہ قریب تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ سلطنت کی شکل میں تبدیل ہو گئی، چنانچہ حضرت معاویہؓ نے فخر و شان کے وہ تمام مظاہر اختیار کیے جو ملوکِ قیاصرہ کا دستور تھے۔[۴۴]

مرتے وقت عبدالملک نے ایک دفعہ ایک غسال کو دیکھا کہ اپنے ہاتھ سے کپڑے پٹخ رہا اور دھو رہا ہے، کہنے لگا:

"کاش میں بھی غسال ہوتا کہ روز کے روز کماتا اور سکھ کی زندگی بسر کرتا!"

یہ بات ابو حازم تک پہنچی، انھوں نے کہا:

"خدا کا شکر ہے کہ یہ لوگ مرتے وقت ہماری سی زندگی بسر کرنے کی تمنا کرتے ہیں، اور ہم ان کی سی زندگی بسر کرنے کی آرزو نہیں رکھتے![۴۵]"

کم سہی مگر ایسے حضرات بھی تھے:

"عمرؓ بن عبدالعزیز ۹۹ھ — ۱۰۱ھ، ۷۱۷ء — ۷۲۰ء خلافت کے والی ہوئے۔ ان میں دوسرے خلفاء بنو امیہ میں خوبیوں کے لحاظ سے بڑا فرق تھا، یہاں تک کہ بعض مؤرخین کی رائے میں ان کی حکومت اس قرن کی پیشانی کا روشن ستارہ ہے، جو دین کے انحراف سے مملو اور استبداد و خوں ریزی سے آلودہ تھا۔[۴۶]"

حضرت عمر کا قول: فردِ واحد کی رائے کچے دھاگے کی طرح ہے:

خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے کردار و سیرت اور شخصیت کا

یہ نظارہ ناتمام رہے گا، اگر "شوریٰ" یعنی مشورت کے بارے میں ان کا رویہ پیش نظر نہ ہو اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل پر نگاہ نہ ہو!

حضرت ابوہریرہ رضہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو اپنے اصحاب رضہ سے مشورہ کرتے نہیں دیکھا، نیز آپ سفر میں پیچھے رہتے، کمزور کو ساتھ ملا کر چلتے، اور نہ چل سکنے والوں کو ساتھ سوار کر لیتے تھے[۴۷]

اور یہ صرف آپ کا ارشاد ہی نہیں تھا، عمل بھی تھا،

ایک مرتبہ آپ نے انصار کو صلاح دی کہ اگر غطفان کے امراء سے پھلوں کی ایک تہائی پیداوار پر صلح کر لی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر انصار نہیں مانے۔ آپ نے اصرار نہیں کیا ان کی بات مان لی[۴۸]

حضرت عمر رضہ فرمایا کرتے تھے؛

الرای الفرد کالخیط السحیل "یعنی فرد واحد کی رائے کچے دھاگے کی طرح ہے![۴۹]"

حضرت عمر رضہ کے سامنے ایک بار ایک کاغذ پیش ہوا جس میں ماہ شعبان درج تھا۔

حضرت عمر رضہ نے دریافت کیا، شعبان سے مقصود کون سا شعبان ہے؟ اس سال کا یا آئندہ سال کا؟"

پھر آپ رضہ نے اصحاب مشورت کو بُلایا، اور ان سے فرمایا: حکومت کے مالی وسائل میں اضافہ ہوگیا ہے، ہم جو کچھ تقسیم کرتے ہیں، وہ روپیہ ایک ہی دفعہ ختم نہیں ہو جاتا، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ حساب کتاب اس طرح منظم کیا جائے کہ اوقات کے بارے میں غلطی اور غلط فہمی نہ ہو!

لوگوں نے کہا: "بہتر ہو کہ ایرانیوں سے مشورہ کر لیا جائے کہ ان کے یہاں کیا طریقہ رائج ہے"؟

حضرت عمرؓ نے ہرمزان کو طلب کیا، اس نے کہا، ہمارے ہاں تو ایک حساب ہے جسے "ماہ روز" کہا جاتا ہے، یہی ماہ روز عربی میں "مؤرخ" بن گیا!۔ پھر یہ سوال اٹھا کہ اسلامی حکومت کی تاریخ کے لیے کون سا سنہ اختیار کیا جائے؟ اور اس کا آغاز کب سے کیا جائے؟

"سب کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ سالِ ہجرت مناسب رہے گا، آخر ہجری طے پا یا!"

ابن المسیب کا قول ہے کہ ہجرت سے آغاز سال کی رائے حضرت علیؓ نے دی تھی، وہ فرماتے ہیں:

"جب حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ طلب کیا کہ کب سے تاریخ کا حساب شروع کیا جائے تو حضرت علیؓ نے فرمایا:

"اس روز سے جس روز سے آپؐ نے ہجرت کی، اور مکّہ سے مدینہ تشریف لائے!"[۵۰]

یعقوبی نے بھی اسی طرح کی روایت بیان کی ہے[۵۱]:

حضرت عمرؓ تو مشورت کے بغیر خلافت کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے تھے، آپؓ فرمایا کرتے تھے:

لاخلافۃ الا عن مشورۃ![۵۲] "یعنی بغیر مشورے کے خلافت بے معنی ہے"

ظاہر ہے جن خلفاء کے شوریٰ کی یہ کیفیت ہو ان کے کردار و سیرت اور ہیبت کا یہ عالم ہو، تو خوارج کے اس اصول کو بڑی حد تک صحیح ماننا پڑتا ہے:

"ایک مرتبہ کوئی شخص خلیفہ منتخب ہو جائے، تو پھر اس باب میں اس سے جھگڑا نہیں کیا جا سکتا، البتہ اگر وہ جبر و جور پر اتر آئے تو اسے معزول کر دینا، اور اگر ضرورت ہو تو قتل کر دینا بھی جائز ہے"[۵۳]

یہ قتل والی بات خوارج ہی کہہ سکتے تھے، کیونکہ ان کی انتہا پسندی تاریخ کی ایک مسلم حقیقت ہے۔ چونکہ وہ قتل کے خوگر اور کشت و خون کے

عادی تھے، لہٰذا ان کے نزدیک قتل کوئی ایسا سنگین معاملہ نہ تھا، ورنہ اگر کسی کو قتل کرنے کی قوت حاصل ہے تو اسے معزول بھی کر سکتا ہے، رہا خفیہ طریقے استعمال کر کے قتل کرنا، سو یہ اسلام کی واضح تعلیمات کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من قتل مؤمنا متعمدا فجزاءہ جھنم خالدا فیھا ابدا۔ — یعنی جس نے کسی مسلمان کو دانستہ طور پر قتل کیا، اس کی جزا جہنم ہے، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔

ماخذ:

سلہ السیاسۃ الشرعیہ، ص ۱۱۰-۱۱۸ (علامہ خلاف) طبع مصر،

سلہ مقدمۂ ابن خلدون، ص ۱۶۶، سلہ النظم الاسلامیہ (طبع مصر، ص ۳۴-۳۵، سلہ السیاستہ الشرعیۃ (علامہ عبدالوہاب خلاف طبع مصر) ص ۸۸، ۸۹، سلہ سورہ شوریٰ، رکوع ۴، آیت ۳۹، سلہ سورۂ آل عمران، رکوع ۱۷، آیت ۶۰، سلہ تفسیر ابن کثیر طبع مصر ۱۹۴۸ء، ج ۴، ص ۱۱۸، سلہ تفسیر خازن، طبع مصر، ج ۶، ص ۱۰۶،

سلہ تفسیر معالم التنزیل، طبع مصر، ج ۶، ص ۱۰۶، برحاشیہ خازن،

سلہ سراج الملوک، طبع مصر، للامام ابی بکر محمد بن الولید الفھری الطرطوشی، ص ۹۲، ۹۴، سلہ سورۂ نجم، پارہ ۲۷، رکوع ۱، آیت ۴، سلہ زادالمعاد، ج ۲، ص ۱۸۷، سلہ مروج الذہب (مسعودی) ج ۲، ص ۳۰۷، سلہ مقدمۂ ابن خلدون، ص ۲۲۹۔

سلہ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر احمد حسن ابراہیم حسن) مصر، ص ۵۰، سلہ تاریخ خوارج (عمر ابوالنصر) طبع بیروت، ص ۳۱، سلہ السیاستہ الشرعیہ، طبع مصر

(علامہ عبدالوہاب خلاف) ص ۸۸، ۱۸ھ سراج الملوک (طرطوشی)، طبع مصر، ص ۲۴۱، ۱۹ھ ابن خلدون، ج ۲، ص ۸۱،
۲۰ھ طبری اور تمام کتب تاریخ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔
۲۱ھ السیاستہ الشرعیہ (خلاف) طبع مصر، ص ۷۰، ۲۲ھ ابن کثیر، ج ۵، ص ۱۸،
۲۲ھ صحیح بخاری، عن ابی سعید الخدری، ۲۳ھ سراج الملوک (طرطوشی) طبع مصر، ص ۷۳، ۷۴، ۲۴ھ الفتنۃ الکبریٰ — (عہد عثمانی) ڈاکٹر طٰہٰ حسین، طبع مصر ص ۱۷۰، ۲۵ھ ابن کثیر، ج ۷، ص ۱۴۶، ۲۶ھ سراج الملوک (طرطوشی) طبع مصر، ص ۴۸، ۲۷ھ طبری، ج ۵، ص ۳۴۔
۲۸ھ ابن کثیر ج ۷، ص ۱۴۶، ۲۹ھ الکامل (ابن اثیر) ج ۱۳، ص ۲،
۳۰ھ ابن کثیر ج ۷، ص ۱۴۱، ۳۱ھ الفتنۃ الکبریٰ — عہد عثمان رضی (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) طبع مصر، ص ۴۵، ۳۲ھ الکامل (ابن اثیر) ج ۵، ص ۷۴۔
۳۳ھ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۸۹، ۳۴ھ ابن خلدون ج ۲، ص ۱۰۵، ۳۵ھ سراج الملوک (طرطوشی) طبع مصر، ص ۴۸۔
۳۶ھ العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام (استاذ سید قطب شہید) ص ۳۱۱۔
۳۷ھ کتاب الخراج ص ۲۲، ۳۸ھ سراج الملوک (طرطوشی) طبع مصر، ص ۲۴۱، ۲۴۴، ۲۶۵، ۳۹ھ الفتنۃ الکبریٰ — عہد عثمان رض (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) طبع مصر، ص ۱۸۵، ۴۰ھ علی رض و بنوہ (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) طبع مصر ص ۴۲ نیز ۲۸۸، ۴۱ھ سراج الملوک (طرطوشی) طبع مصر، ص ۵۳، ۲۴۴، ۱۶۹
۴۲ھ Arnold The Khalaphate.
۴۳ھ النجوم الزاہرہ لابی المحاسن، ج ۱، ص ۱۶۴ (بحوالہ النظم الاسلامیہ)
۴۴ھ النظم الاسلامیہ، ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) ص ۹۴۔
۴۵ھ سراج الملوک (طرطوشی) طبع مصر، ص ۴۲۔
۴۶ھ Nicholson History of Arabs (بحوالہ النظم الاسلامیہ)

۴۷؎ زادالمعاد، ج ۲، ص ۱۳۳، (علامہ ابن قیمؒ) طبع مصر
۴۸؎ سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۴۱،
۴۹؎ سراج الملوک (طرطوشی) ص ۱۴۵
۵۰؎ مقریزی، ج ۲، ص ۵۵، ۵۶
۵۱؎ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۶۶
۵۲؎ کنزالعمال، ج ۳، ص ۱۳۹
۵۳؎ تاریخ خوارج (عمرابوالنصر) طبع بیروت، ص ۱۱۰ ؂

(۴)

شرطِ قرشیت

حضرت ابوبکرؓ کی روایت سے منسوب ایک حدیث بیان کی جاتی ہے:

"الائمۃ من قریش" "یعنی امامت اور سرداری قریش کا حق ہے"۔

یہ بات بھی روایات اور کتب تاریخ و سیر میں منقول ہے کہ انصار نے جب سعدؓ بن عبادہ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کرنی چاہی، اور اس منصب پر سقیفہ بنو ساعدہ میں اپنا حق جتایا، اپنی قربانیاں پیش کیں، تو حضرت ابوبکرؓ نے یہی فرمایا تھا اور حضرت عمرؓ نے انصار کی ہر دلیل یہ کہہ کر رد کر دی کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ قبیلہ ہیں۔ ہمارے ہوتے یہ منصب کسی اور کو نہیں جا سکتا، نہ قریش کسی اور کی حکومت قبول کر سکتے ہیں۔

ایک غلط حدیث سے استدلال: نگاہِ تعمق سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ حدیث بھی غلط ہے، اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی طرف سے جو دعویٰ خلافت کے لیے شرطِ قرشیت سے متعلق کیا جاتا ہے، وہ بھی غلط ہے، اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابیٔ رسولؐ اور منجملہ عشرہ مبشرہ ایسی بات کیسے کہہ سکتے تھے جو روحِ اسلام کی نفی کرتی ہو، جو نصّ آثار، اخبار اور روایات کے یکسر خلاف ہو، جس مساوات کے لیے اسلام نے سب سے زیادہ زور دیا تھا، اگر اسلام میں وہی باقی نہ رکھی جائے تو پھر اسلام کے متعلق ماننا پڑے گا کہ وہ اپنے مقصد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جاتے ہی ناکام ہو گیا اور ایک عظیم اور بنیادی مقصد

میں فوراً ہی ناکام ہو جانے کے بعد نہ اسے تبلیغ کا حق رہ سکتا تھا، نہ وہ آفاقی مذہب کہلائے جانے کا سزاوار تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث اور حضرت عمرؓ کی طرف دعوئ قرشیت کا انتساب تمام تر غلط ہے سند کے اعتبار سے بھی، روایت کے لحاظ سے بھی اور درایت کے نظر سے بھی۔

اصولِ حدیث کی کتابوں میں، قبول حدیث کے جو شرائط ہیں، ان میں ایک اہم ترین شرط یہ بھی ہے کہ راوی کتنا ہی ثقہ کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر وہ کوئی ایسی روایت کرتا ہے جو قرآن کے خلاف ہو، سیرتِ رسولؐ کے خلاف ہو، اور اصولِ اسلام کے خلاف ہو تو رد کر دی جائے گی، قبول نہیں کی جائے گی[1] صرف اسی بنیاد پر حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی طرف یہ انتساب غلط اور نادرست ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ محض اپنے استحقاق اور اہلیت کی بنا پر اس منصب کے لیے منتخب کیے گئے، اس میں نہ قبائلی عصبیت کارفرما تھی نہ عشیرتی اصول

کیا قرآن کریم نے نہایت صاف طور پر نہیں فرمایا ہے:

"ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم یعنی خدا کے نزدیک تم میں سب سے سربلند وہ ہے جو صاحب تقویٰ ہے[2]"

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا یہ ارشاد گرامی نہیں ہے کہ:

"اے لوگو! سن رکھو کہ تمھارا پروردگار ایک ہے، عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سفید فام کو سرخ فام پر، سرخ فام کو سفید فام پر کسی طرح کی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ فضیلت کی بنیاد تو صرف تقویٰ ہے[3]"

پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ آپؐ کے دنیا سے پردہ فرماتے ہی، مدار اکرام و توقیر، قرشیت قرار دیا جاتا، اس طرح حکم الٰہی نظر انداز کر کے قریش کی سرداری اور امامت مسلط کر دی جاتی، دوسرے تمام لوگ اس سے محروم

کر دیے جاتے، اور حدیث وسنت کی اپنے عمل سے نفی کر دی جاتی!

ایک مصری محقق کے ارشادات: مصر کے ایک محقق اور عالم علامہ عبدالوہاب خلاّف نے اس مبحث پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"سرکارِ رسالت ؐ کے اس جہان سے پردہ فرمانے کے بعد مسلمان جب ثقیفہ بنو ساعدہ میں جمع ہوئے تو ان میں اس مسئلہ پر شدید اختلاف پیدا ہوا کہ رسول ؐ کے بعد زمامِ کار کس کے ہاتھ میں دی جائے؟ انصار و مہاجرین ہر دو کے دلائل و براہین علیحدہ علیحدہ تھے۔ سعدؓ کی بیعت پر انصار نے لوگوں کو دعوت دی، بعض انصار نے مہاجرین سے کہا:

"ایک امیر ہم میں سے ہو، ایک تم میں سے!"

پھر جب حضرت ابو بکرؓ نے یہ دلیل پیش کی کہ: "الائمۃ من قریش"

تو انھوں نے اپنی دلیل کو یہ کہہ کر مبرہن نہیں کیا کہ یہ نص ہے اور دین کی طرف سے ایک فریضہ ہے، انھوں نے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ قریش ہی وہ جماعت تھی جو متخالف اور متحارب فریقین میں اپنے زور قوت اور دبدبہ کی بنا پر مرکز کی حیثیت رکھتی تھی، چنانچہ اس سلسلے میں حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا تھا کہ یہ بات کہ زمامِ حکومت قبیلہ اوس کے ہاتھ میں دی جائے، قبیلہ خزرج کو مشتعل کر دے گی۔ اسی طرح اگر قبیلۂ خزرج کو زمامِ حکومت سونپ دی گئی، تو قبیلہ اوس قابو سے باہر ہو جائے گا اس لیے اس وقت عربوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوگا کہ قبیلۂ قریش سے رجوع کریں،

اگر قریش کی حکومت نص ہوتی اور جزوِ دین ہوتی تو ثقیفہ بنو ساعدہ میں جو انصار کرام اور مہاجرین عظام جمع تھے وہ اس حقیقتِ کبریٰ سے ناواقف نہ ہوتے اور حضرت ابو بکرؓ کو انھیں یاد دلانے کی ضرورت پیش نہ آتی کہ اوس کے برسرِ اقتدار ہونے کی صورت میں خزرج اور خزرج کے برسرِ اقتدار ہونے کی صورت میں اوس آمادۂ پیکار ہو جائیں گے۔

اسی طرح حضرت عمرؓ جب یہ سوچ رہے تھے کہ ان کے بعد ان کا جانشین کون ہو؟ تو یہ نہ فرماتے کہ حذیفہ کا غلام سالم آج زندہ ہوتا، تو میں اسی کو سب کچھ سونپ دیتا۔

عمرؓ اور علیؓ کی مثال: کھلی ہوئی بات ہے کہ حضرت عمرؓ ایک غلام کو کس طرح خلیفہ بنانے کا خیال ظاہر کر سکتے تھے، جب کہ "الائمۃ من قریش" سے وہ واقف تھے، حالانکہ نصوص وارده میں بار بار یہ فرمایا گیا ہے کہ فضیلت نسب کی نہیں، عمل کی ہے، نیز بار بار عصبیت جاہلیت سے برأت ظاہر کی گئی ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ:

"ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم!"[۴]

علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے بھی اس کی تغلیط بڑے دل نشین انداز میں فرمائی ہے۔ ان کی تردید بظاہر تعریفی معلوم ہوتی ہے، اور ہے بھی، لیکن اس کے اندر دلیل یہی ہے کہ روایت غلط اور ناقابلِ اعتبار ہے۔

نہج البلاغۃ میں مذکور ہے کہ ثقیفہ بنو ساعدہ کے واقعات آپؓ کے سامنے بیان کیے جا رہے تھے، اور آپؓ سن رہے تھے، کیونکہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مشغولیت کے باعث اس موقع پر وہاں نہیں جا سکے تھے، بلاشبہ دونوں کام اپنی جگہ بڑے اہم تھے، آنحضرت صلعم کی تدفین بھی، اور امت کو ایک عظیم خطرے سے بچانے کی سعی و کوشش بھی، غرض:

امیر المومنین نے فرمایا:

"اور قریش اس معاملہ میں کیا کہہ رہے تھے؟"

عرض کیا گیا۔ وہ اس بات سے دلیل لا رہے تھے کہ وہ شجرِ رسولؐ ہیں۔

یہ سن کر امیر المومنین نے فرمایا: یعنی درخت سے تو یہ دلیل لاتے ہیں لیکن اس کے پھل کو ضائع کر دیتے ہیں[۵]۔

خوارج کا مسلک: ڈاکٹر حسن علی ابراہیم حسن نے بھی اپنی کتاب میں اس پر

بحث وگفتگو کی ہے، فرماتے ہیں:

خوارج خالص فلوتن کے الفاظ میں جدید جمہوری مبادی کے نمائندے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خلافت ہر آزاد عرب کا حق ہے[۷]!"

بعد میں خوارج نے عربیت کی تخصیص بھی حد درجہ غالی اور متشدد عربیت کے علمبردار ہونے کے باوجود ساقط کر دی تھی، اور ہر مسلمان کو منصب خلافت کا اہل تسلیم کر لیا تھا، خواہ وہ کسی ملک، نسل، قوم یا قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو۔

عمر ابو النصر کا بیان ہے:

یہ بات کہ خلافت کے سلسلے میں قریش کی حیثیت کیا ہے؟ اور یہ منصب قریشیوں کے لیے ہے یا دوسرے بھی اس کے حق دار ہیں؟ اسے خوارج نے کوئی اہمیت نہیں دی، اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ قریش کے استحقاق خلافت سے متعلق جو حدیث بیان کی جاتی ہے، وہ صحیح نہیں ہے، بلکہ خوارج اپنے عقائد کے اعتبار سے قرآن وسنت سے بہت زیادہ قریب تھے اور ان کی مخالفت کا ارتکاب ہرگز نہیں کر سکتے تھے، پس اگر استحقاقِ قریش والی حدیث نصِ صریح کی حیثیت رکھتی ہوتی تو خوارج نہ اس کا انکار کرتے، نہ اس سے اختلاف ہی کرتے[۸]

اگر "ائمۃ من قریش" کے باعث حضرت ابو بکر صدیق رض کی بیعت ہوئی تھی، تو حضرت عمر رض نہ صرف اس موقع پر موجود تھے، بلکہ سب سے پہلے دستِ بیعت بھی انہی نے بڑھایا تھا۔ اس کے بعد ہی دوسرے لوگ اس "ثانی اثنین" کی بیعت کے لیے بے تحاشہ ٹوٹ پڑے تھے۔ سوال یہ ہے کہ حضرت عمر رض نے بوقتِ وفات یہ کیسے فرما دیا تھا کہ:

"اگر حذیفہ رض کا غلام سالم رض آج زندہ ہوتا تو میں یہ منصب اسے سونپ دیتا[۹]۔

علامہ عبدالوہاب خلاف نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

ترک تعیین کا مقصد و مقتضا: "پختہ اور محکم دلائل سے یہ امر واضح طور پر

ثابت ہے کہ حکومتِ اسلامیہ میں حکومت نہ "قریش" کا "حق" ہے، نہ کسی دوسرے کا قرآن کریم اور سنتِ نبویہؐ میں کہیں بھی یہ اشارہ نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد مسلمانوں کی زمامِ حکومت فلاں خاص جماعت یا گروہ کا حق یا حصّہ ہے۔ جس طرح اس سلسلہ میں کوئی جماعت خاص نہیں کی گئی، اسی طرح افراد کو بھی نظرانداز کر دیا گیا اور ان کے لیے بھی کوئی ہدایت نہیں کی گئی، اس ترکِ تعیین کا مقصد و مقتضاء جو کچھ ہے وہ یہی کہ حکومت کا معاملہ صرف اُمّت کے ہاتھ میں رہے۔ اسے پورا اختیار ہو کہ جس کو چاہے چُنے اور برسرِ اقتدار و اختیار کر دے[۱۱۰]

طبری اور ابن خلدون کی بحث: طبری نے قرشیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ: "حضرت عمرؓ نے مخالفت کی، اور استحقاقِ خلافت پر دلائل پیش کیے، آپؓ نے فرمایا، بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایک زمانہ میں دو امیر جمع ہوں، بخدا! عرب یہ کبھی گوارا نہ کریں گے کہ تمھیں اپنا امیر منتخب کریں، درآنحالیکہ ان کا نبیؐ دوسرے قبیلہ سے ہو، لیکن ہاں عرب اس قبیلہ کو خلافت دینے میں کوئی تامل نہ کریں گے جس میں نبوّت کا ظہور ہوا ہو، وہ صرف اسی قبیلے کے فرد کو اپنا اولی الامر بنا نا پسند کر سکتے ہیں۔ مذکورہ بالا حقیقت ملکِ عرب کے ہر مخالف فرد کے مقابلہ میں ہمارے لیے ایک زبردست دلیل اور کھلے ہوئے استدلال کی حیثیت رکھتی ہے[۱۱۱]!

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اقتدار و امارت کے بارے میں ہم سے کون جھگڑ سکتا ہے؟ ہمارے آپؐ کے اولیاء اور ہم قبیلہ ہونے کا اعتراف کس کو نہ ہوگا؟ اس سے انکار صرف وہی کرے گا جو غلط باتوں سے استدلال کرنا چاہتا ہو، جو ارتکابِ گناہ کی پہلے سے ٹھان چکا ہو، یا جو ہلاکت و بربادی میں غوطے لگا رہا ہو[۱۱۲]!

ابن خلدون نے خلافت کی قریش کے ساتھ وابستگی کو ایک نئی نظر سے دیکھا

ہے: "مسلمانوں نے خلافت کے ساتھ قریش کو مخصوص کر دیا، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ تنہا یہی قبیلہ اپنے غلبہ و اقتدار کی بناء پر جمہور کی قیادت کی صلاحیت رکھتا تھا، کسی دوسرے قبیلہ کو یہ بات نصیب نہ تھی، تمام جزیرۂ عرب ان کی فضیلت و برتری کا معترف تھا، کسی قبیلہ کو ان کی سیادت و ریاست سے انکار نہ تھا۔[۱۲]

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن کا نقطۂ نظر یہ ہے:

"جو لوگ عالمگیر مساوات کے قائل ہیں اور قریشی غیر قریشی کو ایک درجہ میں رکھتے ہیں وہ متعدد دلائل سے استناد کرتے ہیں۔ مثلاً وہ حضرت عمرؓ کے آخری الفاظ پیش کرتے ہیں:

"اگر آج "سالم" زندہ ہوتا، تو مجھے اس بارے میں کوئی شک و تامل نہ ہوتا"

یہ الفاظ آپؓ نے سالم کے بارے میں اس وقت فرمائے، جب آپؓ مسئلہ خلافت کو شوریٰ کے ہاتھوں میں دے رہے تھے، اگر حضرت عمرؓ کے خیال میں تمام مسلمانوں کو امامت کا حق حاصل نہ ہوتا تو اس قسم کے الفاظ آپ ارشاد نہ فرماتے؟ انھیں ابو حذیفہؓ کے غلام کی موت پر افسوس کبھی نہ ہوتا،

فیصلہ کن ارشادِ رسولؐ: آنحضرتؐ سے بہت سی روایات اس کے متعلق منقول ہیں: آپؐ نے فرمایا: "سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ وہ ایک نکٹا غلام ہو۔"

"ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم "یعنی اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔[۱۳]"

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت صرف ان کے ذاتی مجد و شرف کی بناء پر ہوئی تھی، نہ کہ قرشیت کی بناء پر، حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح نے جنھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "امینِ امت" کا خطاب دیا تھا۔ حضرت

صدیقِ اکبر رضؓ کی بیعت کرتے ہوئے کتنی سچّی بات کہی تھی:
"مہاجرین میں سب سے افضل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یارِ غار، آں حضرتؐ کی عدم موجودگی میں امامتِ نماز کے شرف سے مشرف آپ اور صرف آپ ہیں، لہٰذا آپ کے مقابلے میں کوئی بھی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا، جو خلافت کے بارِ گراں کو اُٹھا سکے[۱۵]!"

مساوات اور اخوت کی نفی: اوپر جو تصریحات پیش کی گئی ہیں، ان سے یہ بات واضح ہے کہ خلافت یا امامت کے لیے قرشیت کی شرط پر جو زور دیا گیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ صحیح اور مستند طور پر ثابت نہیں ہے، بلکہ اسلام کی بنیادی تعلیم مساوات اور اخوت کے منافی بھی ہے، بہت سی روایتیں ہماری بلند پایہ کتابوں تک میں اس طرح شامل ہوگئی ہیں کہ ان کی تنقیح نہیں کی گئی، اگر چھان بین سے کام لیا جاتا، اور درایت کی کسوٹی پر انھیں پرکھ لیا جاتا، تو جو چند در چند غلط فہمیاں ان کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہیں وہ ہرگز رونما نہ ہوتیں، نہ معاملات میں ابتری پیدا ہوتی۔ ترکوں نے کئی سو برس تک خلافت کا بار سنبھالا، جنھیں ساری دنیائے اسلام بشمول ممالک عربیہ "امیر المؤمنین" تسلیم کرتی رہی۔ ظاہر ہے وہ قریشی نہیں تھے ـــــ غلطی ہائے مضامین مت پوچھ!

ماخذ:

ف ۱ شرح نخبتہ الفکر، اور اصول حدیث کی دوسری کتابوں میں، پوری تفصیل کے ساتھ احادیثِ نبوی کے رد و قبول کا معیار قائم کیا گیا، اور اس کی نشان دہی کی گئی ہے۔ تفصیل کے لیے ان کتابوں سے رجوع کیا جائے۔

ف ۲ سورۂ حجرات رکوع ۲، آیت ۱۴، ف ۳ متعدد کتب احادیث میں متعدد طرق سے یہ حدیث بیان کی گئی ہے، بیہقی وغیرہ نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

ف ۴ السیاستہ الشرعیہ، ص ۸۶، ۲۷،

۵ھ نہج البلاغۃ، (ترتیب وتہذیب علامہ عبدہٗ) طبع مصر، ص ۴۹۸ -

۶ھ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) ص ۴۸ - طبع مصر -

۷ھ المذاہب الاسلامیہ (علامہ ابوزہرہ، مطبوعہ مصر) -

۸ھ تاریخ خوارج (عمر ابوالنصر) طبع بیروت، ص ۵۸ -

۹ھ طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۲۴۸،

۱۰ھ السیاسۃ الشرعیۃ (علامہ عبدالوہاب خلاف، طبع مصر) ص ۸۵

۱۱ھ طبری ج ۳، ص ۲۰۷، ۲۰۹ -

۱۲ھ مقدمۃ ابن خلدون، ص ۱۵۳ - ۱۵۴ -

۱۳ھ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۵۵ -

۱۴ھ زادالمعاد (ابن قیم) ج ۲، ص ۱۸۵، طبع مصر -

---

(۵)

شرطِ اطاعت

حاکم ضلع ہو، والی صوبہ ہو، یا سربراہِ مملکت، امیر ہو، امام، یا خلیفہ، بلاشبہ واجب ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے عائلی زندگی سے لے کر نظم مملکت تک ہر معاملے میں، ہم قرآن اور سنت نبویؐ کی روشنی ہی میں کوئی قدم اٹھا سکتے اور کوئی راہِ عمل متعین کر سکتے ہیں۔ ہم اگر جمہوریت کے قائل ہیں تو صرف اس لیے کہ اسلام یہی سکھاتا ہے۔ مطلق العنانی، بے آئینی اور لادستور سے دُور ہوتے گئے، اتنے ہی وہ غلط روی پر مائل ہوتے چلے گئے، انھوں نے اسلام کی روح کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، صرف چند الفاظ کو متاعِ عزیز بنا کر اسی محور پر گردش کرنے لگے ؟

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بڑی جماعت مفکرین اور اصحابِ علم وفضل کی اس طرف گئی ہے کہ اطاعت غیر مشروط ہونی چاہیے، گویا ہمیں از خود ایک بُت بنا لینا چاہیے اور اس کی پرستش شروع کر دینی چاہیے، ہمیں از خود ایک "ملک معظم" کی تخلیق کر لینی چاہیئے، اور اپنی فہم و دانش کو الگ رکھ کر، اس کے سامنے سر جُھکا دینا چاہیئے اور اسلام نے جو حریت فکر و نطق اور اقدام و عمل عطا کی ہے، اس سے دست بردار ہو کر اپنے بادشاہ کا ہر حکم بے چون وچرا مان لینا چاہیئے خواہ وہ حکم کتنا ہی غلط اور ناصواب کیوں نہ ہو۔ اس سے اسلام کی روح کتنی ہی مجروح کیوں نہ ہو رہی ہو، اور اس کی تعمیل سے مفاسد و فتن کا کتنا ہی بڑا دروازہ کیوں نہ کھل جاتا ہو ؟

ردّ و قبول کا اختیار: ادیانِ عالم میں اسلام وہ پہلا اور آخری مذہب ہے جس نے اپنی دعوت میں یہ کبھی نہیں کہا کہ:

"مجھے مان لو، اس لیے کہ میں کہتا ہوں کہ مجھے مان لو!"

قرآن حکیم کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ وہ بار بار "تفکر" کی دعوت دیتا ہے، تعقّل کی طرف بلاتا ہے، تدبّر کی تبلیغ کرتا ہے وہ جذبات سے نہیں، لوگوں کے فہم و فراست سے اپیل کرتا ہے، وہ اپنے نہ ماننے والوں کو عذاب الیم کی بشارت تو دیتا ہے، لیکن دنیا میں ان کے لیے کوئی سزا تجویز نہیں کرتا نہ صرف سزا تجویز نہیں کرتا، بلکہ صاف اور واشگاف الفاظ میں فرما دیتا ہے:

"لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی" — "یعنی دین کے معاملے میں جبر و اکراہ روا نہیں کہ ہدایت گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔"

جب ہدایت کھل کر سامنے آگئی تو اسے تسلیم نہ کرنا یا تو نادانی ہے یا یہ امر طغیان پر مبنی ہے۔ پہلی صورت میں خدا "غفور رحیم" ہے اور دوسری صورت میں وہ "ذوانتقام شدید" ہے۔ اس طرح کے لوگوں سے وہ خود نمٹ لے گا۔ اسلامی حکومت کو یا حکمران کو اس کا حق نہیں کہ جبر و جور سے کام لے کر نادانوں کو دانا بنا دے یا طغیان و عدوان کا شعار رکھنے والوں کا سر کچل دے۔ یہ تو خوشی کا سودا ہے۔ جو حق کو قبول کرنا چاہتا ہے قبول کر لے، جو نہیں قبول کرنا چاہتا نہ کرے۔ لکم دینکم ولی دین!

تو جب خدا دین یعنی اپنی حکومت کے معاملے میں عقل و فہم کی دعوت دیتا اور ردّ و قبول کا اختیار دیتا ہے تو خالص دنیاوی معاملات میں مطلق اور غیر مشروط اطاعت کا حکم کسی حاکم یا فرماں روا کے لیے کیسے دے سکتا ہے؟

تعاون اور عدم تعاون کی شرط: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نہایت صراحت کے ساتھ فرما دیا ہے:

"تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا — یعنی نیکی اور تقویٰ کے معاملے تعاون ضرور کرو،

تعاونوا علی الاثم و العدوان ۔ لیکن اثم و معصیت کے معاملے میں تعاون ہرگز نہ کرو۔[۳۵]

جب باہمی زندگی میں روزمرہ کے معاملات میں سماجی اور جماعتی زندگی کے مختلف امور میں اسلام کی تاکید یہ ہے کہ تعاون نیکی اور پرہیزگاری میں کرنا چاہیئے گناہ اور معصیت میں ہرگز ہرگز نہ کرنا چاہیے تو کسی ایسے نظامِ حکومت سے وہ تعاون کیونکر پسند کر سکتا ہے جو نیکی اور پرہیزگاری کی نفی پر مبنی ہو؟

ظلم، حقوق کی پامالی، عدمِ مساواتِ خلق، عدل سے کنارہ کشی، بیت المال میں تصرف اور خیانت، بے خدا دستور اور خدا بیزار نظام، اگر کسی امیر، یا حاکم اور فرماں روا کی خصوصیات بن جائے تو کیا اس کی اطاعت بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے کی جاتی رہے گی؟ اور اگر ایسا ہو تو کیا اسلام زندہ رہ سکے گا؟ اسلام کی روح قائم رہ سکے گی؟ جس تطہیرِ علم و فکر کا اسلام داعی ہے کیا اسے ثبات و استحکام حاصل ہو سکے گا؟ وہ اقدار کیا باقی رہ سکیں گے جنھیں اسلام غیر معمولی اہمیت دیتا اور جن پہ بار بار عمل کرنے کی تاکید کرتا ہے؟

جواب ظاہر ہے نفی ہی میں ہو سکتا ہے؟

اور جب جواب نفی میں ہو سکتا ہے تو پھر یہ بات بھی غلط ہے کہ کسی فرماں روا یا حاکم کی اطاعت غیر مشروط ہو سکتی ہے۔

یقیناً اسلام پر اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ "اولی الامر" کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیتا ہے۔

راعی اور رعایا کا "معاہدہ": قرآن کریم اور سیرت نبوی سے جو بات واضح اور منقح ہو کر سامنے آتی ہے، یہ ہے کہ اطاعتِ اولی الامر درحقیقت ایک معاہدہ ہے جس کے طرفین پابند ہیں۔ اگر راعی ان حدود و شرائط کا پابند ہے جو اسلام نے مقرر کر رکھے ہیں تو رعایا بھی اس کی اطاعت پہ مجبور ہے، بصورتِ دیگر معاہدہ منسوخ!

نبیؐ کی طاعت امر معروف میں: اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو صرف سربراہِ مملکت ہی نہیں تھے، خدا کے برگزیدہ رسولؐ بھی تھے، اسوہ کیا تھا؟

آپؐ کسی کو مسلمان کرتے وقت جب بیعت لیتے تھے تو وہ پانچ چیزوں پر مشتمل ہوتی تھی۔

—: صرف خدائے واحد کی عبادت اور شرک سے اجتناب کامل۔

—: چوری اور زنا نہ کرنے کا عہد۔

—: وفورِ غیرتِ بے جا، خوفِ افلاس کے باعث اولاد (فرزند و دختر) کو قتل نہ کرنے کا وعدہ۔

—: تہمت، غیبت اور لگائی بجھائی سے اجتناب۔

—: نبیؐ کی اطاعت ہر امر معروف میں ؐ۔

بیعت کی آخری شرط پر غور فرمائیے:

شرط کیا ہے؟ —— امرِ معروف (اچھے کام) میں نبیؐ کی اطاعت —!

کیا نبیؐ کسی ایسے کام کا حکم کبھی دے سکتا ہے جو اچھا نہ ہو؟

آدمؑ سے لے کر مسیحؑ تک کیا کوئی ایسا نبیؑ گذرا ہے جس نے کسی غیر معروف یعنی ناجائز کام کا حکم اپنی اُمت کے کسی فرد کو دیا ہو؟

کیا نبوت کا مرتبہ، اور اس کی جلالتِ شان اس کی متقاضی ہو سکتی ہے کہ اس سے ناجائز حکم صادر ہو؟

یہ بات تو کوئی معمولی خدا ترس آدمی بھی نہیں کر سکتا، پھر نبیؐ جو معصوم ہوتا ہے کیونکر اور کس طرح یہ کر سکتا ہے؟

بات بالکل صاف اور ظاہر ہے کہ جب نبیؐ کی اطاعت بھی مشروط ہے، اور "معروف" کے ساتھ مشروط ہے تو ایک غیر نبیؐ کی اطاعت تو بدرجۂ اولیٰ اس شرط کے ساتھ مؤکد طور پر مشروط ہو گئی، عام اس سے کہ وہ لشکر کا سالار ہو یا حاکم

جبّار و ستم گار!

حقِ طاعت کب ساقط ہوتا ہے؟: درحقیقت اپنی بیعت میں یہ شرط رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک یہ بات واضح فرما دی کہ اطاعت مشروط ہے "معروف" کے ساتھ!

اس کے بعد بھی اگر کوئی اس کے خلاف سرکشی کرتا ہے، خروج کرتا ہے، بغاوت کرتا ہے، تو بلاشبہ وہ کشتنی اور گردن زدنی ہے، لیکن "معروف" کے بجائے اگر "غیر معروف" کی اطاعت کا حکم دیتا ہے تو ظاہر ہے وہ واجب التعمیل نہیں۔

استاذ سید قطب شہید نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ یعنی اے مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو، اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں[۵]"

اس آیۂ کریمہ میں اللہ اور رسولؐ اور اولی الامر کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ امیر کی اطاعت اس کی ذات خاص کے لیے نہیں ہوتی، بلکہ اس اساس پر ہوتی ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولؐ کی عطا کی ہوئی شریعت پر قائم رہتا ہے، اور اس کا اجراء اور نفاذ کرتا ہے، لیکن اگر (اس اپنے اصل کام سے) وہ روگرداں ہو جاتا ہے تو فوراً ہی اطاعت کا حق بھی سوخت ہو جاتا ہے اور اس کے ذاتی اور غیر شرعی احکام کی پابندی اور تعمیل لازمی نہیں رہ جاتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"ہر مسلمان کے لیے واجب ہے کہ وہ حاکم کا حکم تسلیم کرے، خواہ (شخصی طور پر) اسے ناپسند کرتا ہو۔ بجز اس صورت کے کہ اسے گناہ کا حکم دیا جائے۔

نیز آپؐ نے فرمایا: "حاکم کا حکم سنو، اور اس کی اطاعت کرو، اگرچہ تم پر کوئی ایسا حبشی غلام حاکم مقرر کر دیا جائے جس کا سر کشمش کی طرح (چھوٹا سا) ہو، جب تک کہ وہ کتاب اللہ کے احکام نافذ کرتا ہے[۶]!"

بصورتِ دیگر نہ حکم کا سننا واجب ہے، نہ اس کی اطاعت[۷]!

ماوردی کا استدلال: ماوردی بھی بالواسطہ طور پر اس مسئلے کو زیر بحث لاتے ہیں۔ "اہلِ اختیار میں تین صفات کا اعتبار کیا جاتا ہے:

۱۔ حق پژوہی اپنے تمام شرائط کے ساتھ۔

۲۔ علم جس سے لوگوں کو معلوم ہو کہ امامت کا، اس کی تمام شرائط کے ساتھ کون استحقاق رکھتا ہے۔

۳۔ دانائی و فکر، کیونکہ یہ باتیں بہترین اہلیت رکھنے والے آدمی کے انتخاب میں ممد ہوتی ہیں۔

پھر ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے:

"جو لوگ امام کے شہر میں سکونت رکھتے ہیں، انھیں اس معاملے میں دوسرے شہر والوں پر تفوق حاصل نہیں ہے مگر چونکہ یہی ہوتا چلا آرہا ہے کہ اس شہر کے باشندے ہی امام کے اختیار کرنے کے اہل سمجھے گئے ہیں، اس لیے یہ حق انھیں محض رسماً حاصل ہو گیا، لیکن شرعاً اس کے جواز کی کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔"[۳۷]

خلیفۂ اوّل کا پہلا فیصلہ اور اس کے مضمرات: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رض تھے۔ سقیفۂ بنی ساعدہ میں بیعت کے فوراً بعد آپؓ نے جو خطبہ دیا، وہ اپنی معنویت اور اہمیت کے لحاظ سے تاریخ اسلام کا ایک ناقابلِ فراموش خطبہ ہے:

حضرت ابوبکر رض نے اس خطبے میں اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے اور کئی باتیں ارشاد فرمائی ہیں، ہم صرف دو باتوں کا ذکر کریں گے۔ آپؓ نے فرمایا:

۱۔ اگر مجھ سے اچھے کام سرزد ہوں تو میری اطاعت کرو، جب تک میں اللہ اور رسول اللہ صلعم کی اطاعت کروں، لیکن اگر مجھ سے کسی ایسے کام کا ارتکاب ہو جو اللہ اور رسول اللہ کے خلاف ہو، پھر تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔[۳۸]

ان ارشادات پر جتنا جتنا غور کیا جائے گا، اتنی ہی اتنی یہ حقیقت واضح ہوتی چلی جائے گی کہ:

۱۔ حکمران یا سربراہِ مملکت سے اگر کسی غلط کام کا صدور ہو تو نہ صرف یہ کہ اس کو ٹوکا جا سکتا ہے، بلکہ خود پہلا خلیفہ راشد دعوت دیتا ہے کہ ایسا ہو تو مجھے ٹوکو۔

۲: دوسرے حکمرانوں اور سربراہانِ مملکت کا ذکر، پہلا خلیفۃ الرسولؐ بہ الفاظ واضح ارشاد فرماتا ہے کہ شرطِ طاعت یہ ہے کہ میں کتاب و سنت پر عمل کرتا رہوں اگر ایسا نہیں کرتا، تو پھر اطاعت ساقط ہو جائے گی، اور میں اپنے مطاع ہونے کا حق کھو دوں گا!

اور حضرت ابوبکرؓ ایسا کیوں نہ فرماتے، جب کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے واقف تھے۔

"امرِ معصیت میں سمع و طاعت روا نہیں![۹۹]

اور اس سے بھی واقف تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"طاعت صرف امرِ معروف ہی میں ہے[۱۰۰]!"

حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ: حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ برسرِ منبر انھوں نے حاضرین سے سوال کیا:

"اگر میں دنیا کی طرف مائل ہو جاؤں تو تمھارا رویہ کیا ہو گا؟"

یہ سنتے ہی مجمع میں سے ایک شخص کھڑا ہوا، اور اس نے میان میں سے تلوار نکالتے ہوئے جواب دیا:

"ہم تمھاری گردن اڑا دیں گے!"

حضرت عمرؓ نے اسے یوں ٹٹولنے کے لیے زجر و توبیخ کے لہجے میں فرمایا:

"یہ الفاظ تو میرے لیے استعمال کر رہا ہے؟"

بے جھجک اس نے جواب دیا: "ہاں! تمھارے لیے!"

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "خدا کا شکر ہے کہ قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو میری کجی کو سیدھا کر سکتے ہیں[۱۰۱]!"

علامہ محمد عبدہٗ کا تبصرہ: حضرت علیؓ کے ساتھ خوارج کا رویّہ کیا تھا، یہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے، وہ انھیں نعوذ باللہ کافر تک کہتے تھے اور ان کے ماننے والوں کو بے دریغ قتل کر دیتے تھے، لیکن خود حضرت علیؓ نے خوارج کے بارے میں کیا فرمایا:؟

"میرے بعد خوارج کو ہلاک نہ کرنا، جو حق کا طالب ہو، اور طلبِ حق میں اس سے خطا ہو جائے، تو وہ اس شخص کے مانند نہیں ہے جس نے باطل کو چاہا اور اسے حاصل بھی کر لیا"![12][13]

اس ارشاد پر علامہ عبدہٗ فرماتے ہیں:

"حضرت امیرالمومنینؓ کی مراد یہ ہے کہ خوارج اگرچہ اپنے سوءِ عقیدہ کے باعث گمراہ ہیں، لیکن یہ گمراہی اس شبہ کے باعث پیدا ہوئی ہے جو ان کے نفوس میں جاگزیں ہو گیا ہے، یعنی ان کی نیت غلط نہیں، اگرچہ اقدام و عمل میں غلطی ان سے سرزد ہوئی ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ امام پر خروج جائز ہے یہ عقیدہ غلط ہے اور امام برحق پر خروج ہے بھی ناواجب، لیکن میری وفات کے بعد صورتِ حال بدل جائے گی۔ اب خلافت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو گی، جو برسرِ باطل ہیں، اور باطل کی کمک پر انھوں نے مسندِ خلافت پر قبضہ کیا ہے، لہٰذا ایسے ملوک کے خلاف خروج جائز ہے، کیونکہ جن لوگوں کے خلاف اب یہ خروج کریں گے، یہ وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے غلط طور پر حق کو دبا کر اور باطل سے مدد لے کر اس منصب کو حاصل کیا ہے، پس ان کے خلاف خروج و بغاوت بالکل جائز ہے، لہٰذا خوارج ان کے ساتھ جو کچھ کریں گے، عین مناسب اور مستحسن اقدام ہو گا"۔[14]

علامہ فیض الاسلام کی تصریح: اس پر علامہ فیض الاسلام علی نقی (طہران) فرماتے ہیں:

"حضرت نے خوارج کی نفی فرمائی ہے اس لیے کہ مقصود اصلی تو ان کا حق

ہے، البتہ اس کے حصول کا راستہ غلط ہے، اور یہی ان کی گمراہی ہے۔ پس وہ لوگ سزاوار کشتن نہیں ہیں، جو معاویہؓ اور اصحاب معاویہؓ کے خلاف تلوار اٹھائیں۔ اس لیے کہ ان لوگوں نے خلافت کے نام سے حکومت حاصل کی ہے۔ باطل کی مدد سے حاصل کی ہے، غلط مقاصد کے تحت حاصل کی ہے۔

"خود امیر المومنینؓ نے جو خوارج سے جنگ فرمائی تو اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کبھی خود انھوں نے پیش قدمی نہیں کی، بلکہ بار بار ان کی اصلاحِ احوال کی کوشش فرمائی۔ جب بھی امیر المومنینؓ نے ان کے خلاف تلوار اٹھائی ان کے فتنہ و فساد سے مجبور ہو کر ان کے قتل و غارت کے مقابلہ میں کوئی اور چارۂ کار نہ دیکھ کر، چنانچہ ان لوگوں نے عبداللہ بن خباب کو جو اصحاب امیر المومنین میں بڑے پایہ کے بزرگ تھے، بڑی طرح ہلاک کیا، ان کی اہلیہ کو جو پیٹ سے تھیں، قتل کیا اور شکم چاک کر دیا۔ اس موقع پر قتلِ خوارج کی جو نفی فرمائی ہے وہ اس شرط سے مشروط ہے کہ اگر یہ فتنہ و فساد نہ کریں تو محض عقیدہ کی بنا پر انھیں قتل نہ کرو۔ کیونکہ جنگ اسی وقت جائز و مناسب و مباح ہوتی ہے جب خونِ ناحق بہایا جا رہا ہو، یا فتنہ و فساد کی گرم بازاری شروع ہو چکی ہو[۱۱]!"

چند قابلِ غور مثالیں: حضرت عثمانؓ اور امیر معاویہ کا ایک واقعہ بھی اس سلسلے میں توجہ طلب ہے:۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے سیاستِ عہدِ عثمانؓ پر بحث و گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے ایک مرتبہ اپنے ایک قرابت دار کو خاصی بڑی رقم عطیہ دینے کا حکم صادر فرمایا تو خازن نے تعمیل ارشاد سے یعنی اس باب خاص میں تعمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے کہا:

تم ہمارے خازن ہو۔ تعمیل حکم کیوں نہیں کرتے!"

اس نے جواب دیا: آپؓ کا خازن آپ کا غلام ہو گا۔ میں تو مسلمانوں کا خازن ہوں۔!"

پھر اس نے بیت المال کی چابیاں منبرِ نبویؐ پر رکھ دیں اور خانہ نشین ہو گیا۔[16]
مصر کے عامل وردان کو امیر معاویہؓ نے حکم بھیجا کہ ہر قبطی سے ایک قیراط زیادہ وصول کیا کرو۔

وردان نے جواب لکھ کر بھیجا۔ "قبطیوں سے معاہدہ ہے کہ رقم بڑھائی نہیں جائے گی۔ تعمیل ارشاد کس طرح کروں؟"[17]

اور وردان کو یہ جرأت اس لیے ہوئی کہ ان کے دل میں نورِ اسلام روشن تھا اور وہ جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:
"اطاعت امیر صرف معروف میں ہے!"[18]

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا ایک اہم سوال: اسی طرح حضرت ابوذر غفاریؓ نے جب سرمایہ داری کے خلاف لب کشائی فرمائی تو مروان کی شکایت پر حضرت عثمانؓ نے انھیں اس آتش نوائی سے باز رکھنے کی کوشش کی، انھوں نے اپنی روش بدلنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور فرمایا:
"اللہ کی رضا حاصل کرنے کے سلسلے میں عثمانؓ کی ناراضی مول لینا میرے لیے زیادہ پسندیدہ ہے۔"[19]

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب میں حضرت عثمانؓ کا نہایت مؤثر اور کامیاب دفاع کیا ہے اور ان کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں، انھیں دُور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اور ان کے اقدام و عمل کو دیانت فکر پر مبنی قرار دیا ہے۔ اور بالکل بجا کیا ہے لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے تمہید کے طور پر انھوں نے جو سوال اٹھایا ہے وہ شرطِ طاعت کی بڑی اچھی وضاحت کرتا ہے، وہ فرماتے ہیں:
"سوال یہ ہے کہ آیا حضرت عثمانؓ نے کتاب و سنت اور سیرتِ ابوبکرؓ و عمرؓ کی پیروی کی یا نہیں؟ اگر نہیں تو مسلمانوں سے طاعت کی ذمے داری ساقط ہو جاتی ہے، اگر کی تو مسلمان نافرمانی کا حق نہیں رکھتے۔"

ان مباحث سے یہ بات صاف ہو گئی کہ اطاعتِ امیر اسلام میں غیر مشروط نہیں ہے۔ وہ جانبین کا ایک معاہدہ ہے جس پر دونوں کو عمل پیرا رہنا چاہیے۔

شارع کی نظر میں جس طرح انفرادی طور پر طلاق ابغض المباحات یعنی جائز چیزوں میں حد درجہ نامرغوب اور غیر پسندیدہ چیز ہے اسی طرح اجتماعی طور پر خروج اور بغاوت بھی حد درجہ نامطبوع اور ناگوار چیز ہے، غور کیجئے تو دونوں چیزیں امن وسکون، اطمینان وعافیت اور تعمیر واصلاح کی غارت گر ہیں۔ طلاق صرف دو ہستیوں کی جدائی کا نام نہیں ہے، ایک پورے کنبے کے لیے تباہی وبربادی کا پیام ہے۔ مرد کے سکون، عورت کی زندگی اور اولاد کے مستقبل پر اس کا بہت گہرا اور دور رس اثر پڑتا ہے، اس لیے کئی حد بندیوں کے ساتھ اسے صرف اس صورت میں جائز رکھا ہے کہ کوئی صورت مفاہمت اور مصالحت کی باقی نہ رہ گئی ہو۔

یہی کیفیت خروج وبغاوت کی ہے۔ اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں نکلتا، کہ ایک جماعت نے بغاوت کی اور ایک شخص مسند حکومت سے دست بردار ہو گیا، یا معزول کر دیا گیا، بلکہ یہ نکلتا ہے کہ ایک مدت کے لیے عوام میں بے اطمینانی پیدا ہو جاتی ہے، کاروبار معطل ہو جاتا ہے، نظام حکومت کی استواری متزلزل ہو جاتی ہے، نشاط کار کا جذبہ مفقود ہو جاتا ہے، شورش پسندوں کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں، امن وامان غارت ہو جاتا ہے، غرض طرح طرح کے مفاسد رونما ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس کی اجازت بھی شاذ صورتوں میں ہے، اور وہ بھی نہایت کراہت کے ساتھ، کیونکہ اس کا سب سے بڑا اور برا اثر شیرازہ بندی پر ہوتا ہے، تنظیم اور ملی وحدت کا سمجھنا چاہیے خاتمہ ہو جاتا ہے، انارکی، طوائف الملوکی اور انتشار کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔

وحدتِ ملّی کا قیام سب پر بالا ہے: عوام کو اور فرد کو، اسلام کی طرف سے جتنے جمہوری حقوق حاصل ہیں، ان سب کو قربان کر کے بھی اگر جمعیۃ قائم رہتی ہے

اور وحدت ملی میں رخنہ نہیں پڑتا، تو بغاوت اور خروج سے احتراز کرنا واجب ہے۔ البتہ جب کوئی چارۂ کار باقی نہ رہ جائے، اور اسلام کو یکسر معطل کر دیا جائے اور کتاب وسنت کو نظرانداز کر دیا جانے لگے تو ہتھیار اٹھانا جائز ہے۔ اس لیے کہ خالق کی معصیت میں مخلوق کی طاعت جائز نہیں، لیکن ہتھیار اٹھانا بھی غیر مشروط طور پر جائز نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ اقدام صرف اس وقت کیا جائے، جب کامیابی کا پورا یقین ہو، اور ایسے وسائل میسر آجائیں، جو حصولِ مقصد میں فیصلہ کن حد تک معین و مددگار ثابت ہوں، بغیر اس کے خروج بغاوت کی سعی ذاتی طور پر بھی نقصان دہ اور ضرر رساں ہے اور اجتماعی طور پر بھی۔ ذاتی طور پر یوں کہ جان دے دینے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا، اور اجتماعی طور پر بایں صورت کہ ایک اچھے مقصد کی بری طرح ناکامی آئندہ دوسرے اصحاب عزیمت کے لیے بھی ہمت شکن ثابت ہو سکتی ہے۔ پس یہ قدم صرف آخری چارۂ کار کے طور پر اٹھایا جا سکتا ہے، اور وہ بھی متوقع کامیابی کے تمام وسائل فراہم کر لینے کے بعد۔

جمہوریت مذہب میں: اسلام مذہبی معاملات تک میں کس درجہ جمہوری ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے جمودِ فکر اور شخصیت پرستی کو مکمل طور پر اجتہاد، اور اجماع کا دروازہ کھول کر ختم کر دیا ہے، دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس نے اتنے وسیع اور ہمہ گیر پیمانے پر اجتہاد کو جائز رکھا ہو۔ اجماع کو ارکانِ دین میں شمار کیا ہو ـــ پس جب دین کے معاملے وہ اتنا وسیع القلب ہے تو دنیا کے معاملے میں ظاہر ہے اسے اور زیادہ فراخ حوصلہ ہونا چاہیے۔ اور وہ ہے بھی کتاب وسنت کی پابندی کے ساتھ، اس نے انسان کو وہ حقوق دے دیے ہیں۔ جو آج تک نہ کسی مذہب نے دیے ہیں نہ کسی سوسائٹی نے نہ کسی حکومت نے۔

ماوردی اور عزل وخوارج: ماوردی نے عزل اور خروج وبغاوت کے

موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

اگر دو باتوں میں ایک بات بھی خلیفہ میں پیدا ہو جائے تو وہ امامت سے خارج ہو جائے گا۔

پہلی بات اس کے اخلاق (یعنی عدالت) کی خرابی ہے، دوسری جسمانی نقص، عدالت (یعنی اخلاق) میں خرابی پیدا ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ فاسق ہو جائے، ممنوعاتِ شرعیہ کا ارتکاب کرنے لگے، اور ہوس ذاتی سے مغلوب ہو کر ناروا باتیں اس سے سرزد ہونے لگیں، یہ ایک ایسا حق ہے۔ جس کے باعث نہ کوئی شخص امام بن سکتا ہے، نہ رہ سکتا ہے، جب کسی امام پر یہ حالت طاری ہو جائے گی وہ امامت سے خارج ہو جائے گا، اور پھر گو وہ اپنے اخلاق درست کر کے عادل بن جائے، مگر جب تک تجدید بیعت نہ ہو، وہ مسندِ خلافت و امامت پر متمکن نہیں ہو سکتا[20]۔"

سمع و طاعت: عزل و خروج کے موضوع پر گفتگو کرتے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سمع و طاعت پر بحث کر لی جائے۔

اسلام نے امکان و استطاعت کے مطابق سمع و طاعت پر بہت زور دیا ہے، قرآن کریم میں سمع و طاعت سے متعلق متعدد آیات وارد ہوئی ہیں:

اطیعوا اللہ والرسول	یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت کرو![21]
اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول	یعنی اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو۔[22]
اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول	یعنی اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو[23]
اطیعوا اللہ و رسولہ	یعنی اللہ کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول کی اطاعت کرو[24]!
اطیعوا اللہ والرسول	یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت کرو[25]،

اطیعوا اللہ و رسولہ — یعنی اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی پیروی کرو۔[۲۶]

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول — یعنی اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔[۲۷]

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم — یعنی اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اس حاکم کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہو۔[۲۸]

کسی غیر مذہب اور عقیدے کا پیرو ہو تو ظاہر ہے اس کے احکام، معصیت خالق پر مبنی ہوں گے۔ جن کی تم پیروی نہیں کر سکتے، اس کے علاوہ وہ تمھارے دینی مزاج سے بھی ناواقف ہوگا، اس لیے نیک نیتی کے، باوجود وہ تمھارا صحیح سربراہ نہیں بن سکتا۔ لیکن اگر وہ حاکم جو "منکم" ہو۔ اور فسق و معصیت اختیار کرلے تو اس کی بیعت ساقط ہو جائے گی، وہ امامت کے حق سے محروم ہو جائے گا۔ اور جب بیعت ساقط ہوگی اور حقِ امامت سوخت ہوگیا، تو اب سمع و طاعت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اسے معزول بھی کیا جا سکتا ہے، اور اگر وہ مقابلے پر اتر آئے اور تم مقابلے کی سکت رکھتے ہو تو اس کے خلاف خروج و بغاوت بھی جائز ہے۔

احادیث کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سمع و طاعت کی زیادہ سے زیادہ تاکید کی گئی ہے، اور ناگوار حالات برداشت کرلینے کی بھی تلقین کی گئی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس نے امیر کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی، جس نے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی۔ اور امام ڈھال کی طرح ہوتا ہے جس کے پیچھے جنگ لڑی جاتی ہے، اور اس سے پناہ لی جاتی ہے۔ پس اگر وہ اللہ سے ڈرنے کا حکم دے اور عدل و انصاف کرے تو اس کا ثواب ملے گا، اور اگر اس کے خلاف کرے گا تو گناہ گار ہوگا![۲۹]

حضرت انس رضؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"حاکم کی سنو، اور مانو، خواہ تم پر کوئی ایسا حاکم بنا دیا جائے جس کا سر خشک انگور یا کشمش کی طرح ہو!"[30]

ساتھ ہی ساتھ احتساب کی اجازت بھی فرمائی۔ حضرت انسؓ سے مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم!

لوگوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ مظلوم کی مدد کرنا تو ممکن ہے لیکن ظالم کی مدد ہم کس طرح کر سکتے ہیں"؟

آپؐ نے فرمایا: "اس کا ہاتھ پکڑ لو!"[31]

یعنی ظالم کو ظلم سے روکنا، درحقیقت اس کی مدد کرنا ہے!

حضرت علیؓ کا ارشاد: جماعت اور جمعیت سے رشتہ قائم رکھنے کی تائید خلفاء راشدین بھی کرتے رہے، حضرت علیؓ کا ارشاد ہے:

"تم عذاب الٰہی سے اگر بچنا چاہتے ہو تو بدعتوں کے پرچم اور فتنوں کے نشان نہ بن جانا، اس قانون پر ہمیشہ استوار رہنا، جس پر نظام جماعت مبنی ہے، اور پایۂ طاعت و بندگی قائم ہے، خدا کے حضور میں ستم کش بن کر پہنچنا۔ ستم گر بن کر نہیں، شیطان کے راستوں اور ظلم و ستم کے مقامات سے دور رہنا لقمہ ہائے حرام کو اپنے شکم میں داخل نہ ہونے دینا"[32]

حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو جماعت سے ایک بالشت بھی الگ ہوا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا جوا اتار دیا۔"[33]

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"میری امت گمراہی پر اکٹھی نہیں ہوگی، لہٰذا تم جماعت سے وابستہ رہو، کیونکہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے"[34]

معزولی اور ولی عہدی: خلافت کے شروط معتبرہ میں سے جو شخص متفق علیہ

شرائط کو پورا کرتا ہو، وہ بھی اس وقت تک مستحق اطاعت نہ ہوگا، جب تک اہل حل وعقد اس کی بیعت نہ کرلیں، جنھیں امت نے صاحب عدالت، حامل علم ورائے سمجھ کر اس کام کے لیے منتخب کیا ہو۔

امام بیعت، امام استخلاف نہیں: بعض علماء کا خیال ہے کہ جس طرح امام، امام بیعت ہوتا ہے، اسی طرح امام، امام استخلاف و ولایت عہد بھی ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح اس کے تمام احکام واجب التعمیل ہوتے ہیں، اسی طرح اپنی جانشینی کے سلسلہ میں جسے اپنا خلیفہ یا ولی عہد وہ بنا دے، اس کی تعمیل بھی کرنی چاہیے لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں، اس لیے کہ خلیفہ نے اپنے بعد کے لیے جو خلیفہ بنایا ہو، یا جسے ولی عہد مقرر کیا ہو، اگر اہل حل وعقد اس کی تائید نہ کریں تو وہ ہرگز امام اور خلیفہ نہیں بن سکے گا۔ اور نہ اس کی بیعت جائز ہے۔ نہ کہ استخلاف اور ولایت عہد، اگر مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کو بہتر پایا اور ان کی بیعت کرلی تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوا۔ باقی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت ابوبکرؓ کا حضرت عمرؓ کو اپنا ولی عہد بنانا، مسلمانوں کے لیے کوئی حجت یا دلیل یا حکم واجب الطاعت نہیں تھا، اسی طرح استخلاف عمر کے بارے میں مسلمانوں کو حق تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کی بیعت کر لیتے جو ان لوگوں میں نہ تھا، جنھیں خلافت کے لیے حضرت عمرؓ نے نامزد کیا تھا، لہٰذا استخلاف اور ولایت عہد، سلف کا کوئی ایسا حکم نہیں ہے، جو خلف کے لیے واجب اور ضروری ہو۔ اس کے بعد بھی امت کو پورا پورا اختیار رہتا ہے، اور اسی کا قول قول فیصل ہوتا ہے کہ وہ جسے چاہے اپنا امام اور خلیفہ بنا لے جس طرح امت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس خلیفہ یا امام کو دیکھے کہ وہ راہِ صواب سے ہٹ رہا ہے۔ معزول اور برخاست کر دے۔

لہٰذا خلیفہ کے تقرر کے بارے میں اصل رائے اہل حل وعقد کی ہے کسی

فرد واحد کی نہیں ہے، خواہ وہ کوئی ہو۔[۳۵]

خوارج نے "الائمۃ من قریش" کو کبھی نہیں مانا:

"پہلے وہ ہر آزاد عرب کو اس منصب کا مستحق قرار دیتے تھے، بعد میں انھوں نے ہر مسلمان کے لیے یہ حق تسلیم کر لیا، خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، البتہ اس کا عادل ہونا ضروری تھا۔

شاید اس کا سبب یہ تھا کہ خوارج کے ساتھ غیر عرب بھی ان کا جمہوری رجحان دیکھ کر شریک ہونے لگے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس اصول میں لچک پیدا کی، اور ہر مسلمان کے لیے خواہ وہ آزاد ہو یا غلام رہ چکا ہو، یہ حق تسلیم کر لیا۔[۳۶]

خوارج کا نظریہ: بلکہ انھوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور عزل و خروج سے متعلق ان کا نظریہ تھا،

"خوارج کے نظریہ کے مطابق بیعت کے بعد خلیفہ کا معزول کرنا جائز نہ تھا، لیکن اگر خلیفہ ظلم کا مرتکب ہو تو اس کا عزل یا بتقاضائے ضرورت قتل کرنا بھی جائز تھا، بعد کو خوارج نے اپنی شرط اوّل میں ترمیم کی۔ عربیت و حریت کی جگہ صرف اسلام و عدالت کی شرط کو ضروری قرار دیا، یہ وہ وقت تھا کہ جب کثرت سے عجمی مسلمان ان کی جماعت میں داخل ہو گئے تھے۔ اس نظریہ کی بنیاد پر انھوں نے تمام مسلمانوں کو خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام، خلافت میں برابر کا حق دار قرار دیا۔[۳۷]

حضرت عمرو رضؓ بن العاص بھی ان لوگوں میں تھے، جو اگرچہ بعد میں قصاص عثمانؓ کے مدعیوں کے ساتھ ہو گئے، لیکن شروع میں مخالفین عثمانؓ کے ساتھ تھے، اور عزل عثمانؓ کے مؤید تھے جیسا کہ اس سے پہلے گذر چکا ہے۔

عمرو بن العاص رضؓ نے حضرت عثمان رضؓ سے کہا۔

آپؓ کے طرزِ عمل نے لوگوں کو دیانت کے ساتھ احتجاج پر اکسایا ہے۔

اس صورت حال کا مداوا صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ یا تو عدل و انصاف سے کام لیجیے، ورنہ پھر مسندِ خلافت خالی کر دیجیے، اور اگر ان میں سے کوئی بات منظور نہیں تو آپ جانیں، آپ کا کام۔

امام ابو حنیفہؒ ان لوگوں میں تھے، جنھوں نے اس خلافت کو جو منہاج خلافتِ راشدہ سے جدا ہو، نہ صرف قبول نہیں کیا بلکہ جب کبھی اس کے خلاف کوئی صالح تحریک عالم وجود میں آئی تو اس کی علی الاعلان تائید کی، امام زید نے جب خروج کیا تو انھوں نے اسے "جنگ بدر" سے مشابہ قرار دیا۔ امام صاحب ان اکابر میں تھے، جو خلیفہ اور امام کو عدل اور بیت المال کے پیمانے سے ناپتے تھے، یعنی اگر خلیفہ یا امام بیت المال میں غلط قسم کا تصرف نہیں کرتا، اسے فلاح امت پر خرچ کرتا ہے، اور خود قوت لایموت پر کفایت کرتا ہے اور ظلم و جور کو اپنا شعار نہیں بناتا تو وہ سمع و طاعت کا مستحق ہے۔ اور اگر ایسا نہیں کرتا، ظلم کرتا ہے، اور بیت المال کی رقم ناجائز طور پر صرف کرتا ہے تو اس کی بیعت ساقط ہو جاتی ہے۔ اور وہ خلیفہ نہیں رہتا۔[۳۸] بلکہ خوارج تو اس کے بھی قائل ہیں کہ ایسے خلیفہ کے خلاف مسلح بغاوت کی جا سکتی ہے۔[۳۹] خوارج کا مسلک یہ ہے:

"قتل عثمان رضؓ نے اس جماعت کو ایک نیا مسلک بہم پہنچایا، جو سیاست و حکومت سے تعلق رکھتا تھا، یعنی یہ کہ اگر خلیفۂ وقت جماعت کی رائے سے انحراف کرے۔ اپنے منصب سے دست بردار نہ ہو، بلکہ اصرار کرے کہ وہ اپنی مسند پر قائم رہے گا۔ عامۂ مسلمین اس کی سیاست کو ناپسند کرتے ہوں تو بھی وہ ان سے بے پرواہ رہے۔ عوام اس کی خلافت و حکومت کو ناقابلِ برداشت سمجھتے ہوں، پھر بھی وہ اپنی جگہ پر قائم رہے تو ایسی صورت اسے قتل کیا جا سکتا ہے۔"[۴۰]

خروج کی تائید و حمایت کب؟ امام اعظم ابو حنیفہؒ کو ہم دیکھتے

ہیں کہ انھوں نے نفس زکیہ اور نفس رضیہ کے خروج کے موقع پر خلیفہ منصور کی سطوت و جبروت سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر علی الاعلان اور برسرِ عام ان کی تائید کی، انھیں امام حق قرار دیا، ان کا ساتھ دیا، پھر لوگوں کو اکسایا، بلکہ اس خروج میں شرکت کی، ایسے حج سے پچاس گنا زیادہ افضل خیال فرماتے تھے جو نفل کے طور پر کیا جا رہا ہو[۴۱]۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قید کیے گئے اور اسی حالت میں وفات پائی۔

امام مالکؒ اس باب میں امام ابو حنیفہؒ سے بھی آگے تھے، ان کے نزدیک خلیفۂ وقت کی بیعت اصل بیعت ہی نہیں تھی، جبری بیعت تھی اور انھوں نے طلاق جبری اور بیعت جبری کے خلاف فتویٰ دے دیا جس کی سزا یہ ملی کہ انھیں کوڑے مارے گئے اور تشہیر کرائی گئی۔ اس حالت میں بھی ان کی زبان سے جو الفاظ نکل رہے تھے وہ یہ تھے:

”جو جانتا ہے، وہ جانتا ہے، اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالکؒ بن انس فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری ناجائز اور بے اثر ہے[۴۲]!“

امویوں اور عباسیوں کے خلاف شورش اور خروج و بغاوت کی تحریکوں کا سلسلہ غیر منقطع طور پر جاری رہا، لیکن اس دَور کی سب سے زیادہ ہوشربا لرزہ خیز اور ناقابلِ فراموش تحریک وہ تھی جو کربلا میں اختتام پذیر ہوئی۔

واقعۂ کربلا: اس خروج کو غیر معمولی اور یادگار حیثیت اس لیے حاصل ہوئی کہ وقت کی منظم، محکم اور مستحکم حکومت سے جس شخص نے ٹکر لی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نواسا تھا، فاطمۃ الزہرا کا لختِ جگر، علیؓ مرتضیٰ کا فرزندِ ارجمند اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نورِ عین، جس کے لیے آپؐ نے ”سردارِ جوانانِ جنت“ فرمایا تھا، اور عبداللہ رضؓ کی روایت کے مطابق ان دونوں بھائیوں کو ”ریحانتای من الدنیا“، یعنی میرے ”پھول دنیا کے“ فرمایا تھا[۴۳]۔ اور جن لوگوں نے اسے اور اس کے مختصر سے کنبے کو انتہائی

شقاوت اور سنگدلی کے ساتھ قتل کیا، وہ کافر اور مشرک نہ تھے۔ محمدؐ کے امتی اور اسلام کے مدعی تھے۔

دیکھنا چاہیے کہ اس تحریک کی بنیاد کیا تھی؟

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یزید کی حکومت درست نہ تھی، اس کی بنیاد جبری بیعت پر تھی[43] اور ابھی اوپر امام مالکؒ کا فتوٰی مذکور ہو چکا ہے کہ جبری بیعت، جبری طلاق اور جبری یمین کی شرعاً کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں ہے۔ لہٰذا ایک ایسے شخص کے خلاف جس کی خلافت شرعاً نادرست ہو، اگر کوئی شخص یا گروہ صف آرا ہوتا ہے تو اسے باغی نہیں کہہ سکتے۔ "باغی" تو اس کو کہیں گے جو ایک جائز حکومت کے خلاف صف آرا ہو۔

ماوردی، تفتازانی اور ابن حجر کے افکار: دوسری یہ چیز پیش نظر رکھنی چاہیے کہ شخصی اور ذاتی طور پر یزید ان شرائط کو پورا نہیں کرتا تھا، جو ایک خلیفہ کے لیے ضروری ہیں۔ جن کا ذکر ماوردی نے اپنی کتاب "الاحکام السلطانیہ" میں کیا ہے، اور جن کا ذکر اپنے موقع پہ کیا جا چکا ہے، اس کی سیرت اور کردار کو مؤرخین کے کسی گروہ نے بھی نہیں سراہا، بلکہ اسے مورد طعن و قدح قرار دیا، اور یہی وجہ ہے کہ اسے اور امیر معاویہؓ کو خلیفہ برحق کسی نے بھی نہیں مانا ہے، البتہ ملک اور سلطان ضرور تسلیم کیا ہے "شرح عقاید" میں علامہ تفتازانی نے لکھا ہے:

"فمعاویۃ ومن بعدہٗ لا یکونون خلفاء بل ملوکا وامراء"	یعنی معاویہ اور ان کے بعد کے حکمران خلیفہ نہیں، بادشاہ اور امراء تھے۔

علامہ ابن حجر نے فتح الباری، شرح صحیح بخاری میں تحریر فرمایا ہے:

واما معاویۃ ومن بعدہ	یعنی معاویہ اور ان کے بعد کے حکمران

فعلیٰ طریقة الملوك ولو سمّوا الخلفاء
جس راستے پر چلے وہ بادشاہوں کا راستہ تھا۔ اگرچہ انھیں خلیفہ کہا جاتا رہا ہو۔

ابن خلدون کی رائے: ابن خلدون امویوں کے زیر بارِ احسان تھے، ان کے ممنونِ کرم تھے، ان کی تائید و حمایت میں انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے ان کی ساری زندگی امویوں کے زیر سایہ گذری، اور یہ اثر اُن کی تحریروں میں جگہ جگہ نمایاں ہے، لیکن اس کے باوجود فرماتے ہیں:

"معاویہ نے افضل کو چھوڑ کر مفضول کو اختیار کیا، تاکہ مسلمانوں کی جمعیۃ قائم رہے۔"

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تصریحات: ڈاکٹر طٰہٰ حسین (مصر) نے یزید کے کردار اور شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یزید اپنے دادا ابوسفیان کی ہو بہو تصویر تھا۔ وہ ہر چیز کو عصبیت کے نکتۂ نظر سے دیکھنے کا عادی تھا، یزید ہی وہ شخص تھا جس کی بدولت حرّہ (پامالی مدینہ منورہ) کا سانحہ پیش آیا، جس میں قریش (بنوامیہ) نے چن چن کر ان ہی انصار سے بدلہ لیا، جنھوں نے جنگِ بدر میں ان کے خلاف دادِ شجاعت دی تھی، اسی واقعہ میں اسّی کے قریب وہ انصاری قتل کیے گئے، جنھوں نے جنگِ بدر میں شرکت کی تھی، یعنی جنھوں نے اس جنگ کے موقع پر قریش (بنوامیّہ) کو شکست دی اور انھیں نیچا دکھایا تھا۔"

یزید کے بارے میں اہل مدینہ کا جو وفد تحقیق احوال کے لیے گیا تھا اس کے سربراہ ایک عابد و زاہد شخص عبداللہ بن حنظلہؓ (انصاری) تھے، ان کے ساتھ ان کے آٹھ بیٹے بھی تھے۔ یزید نے وفد کی شاندار طریقے سے پذیرائی کی، اور انعام و اکرام سے نوازا، تاکہ یہ لوگ مدینے واپس جا کر اس کے گن گائیں، مگر ایسا نہیں ہوا، اہل وفد نے واپس آکر بیان کیا:۔

"ہم ایسے شخص کے پاس سے آرہے ہیں جس کا کوئی دین نہیں ہے۔

وہ شراب پیتا ہے، طنبورہ بجاتا ہے، مغنّی و مطرب اس کے پاس بیٹھے گاتے بجاتے رہتے ہیں، وہ کتوں سے کھیلتا رہتا ہے۔ رات میں اس کے پاس اخلاق باختہ لوگ آ کر مجلس آرائی کرتے ہیں!"

رئیس وفد عبداللہ بن حنظلہ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

"خدا کی قسم! یزید شراب پیتا ہے، بخدا وہ اتنا متوالا ہو جاتا ہے کہ نماز ترک کر دیتا ہے![۴۵]"

ابن خلدون نے لکھا ہے:

"جب یزید میں فسق و فجور پیدا ہو گیا تو صحابہ اس کے بارے میں مختلف الرائے ہو گئے۔ بعض نے اس کے خلاف صف آرا ہونا ضروری خیال کیا، جیسے حسین رضؓ اور عبداللہ رضؓ بن زبیر رضؓ۔ بعض اس لیے خاموش بیٹھ رہے کہ باہمی کشت و خون اور فتنہ و فساد سے گریزاں تھے[۴۶]"

یہ حالات تھے جب حضرت حسین رضؓ نے یزید کے خلاف صف آرا ہونے کا فیصلہ کیا۔

ظاہر ہے، اس فیصلے میں کوئی ذاتی غرض پنہاں نہیں تھی، نہ حبِ جاہ و اقتدار کا جذبہ کارفرما تھا، یہ بات ہوتی تو وہ امیر معاویہ رضؓ کے خلاف بھی صف آرا ہوتے لیکن چونکہ امیر معاویہ رضؓ سے معاہدہ ہو چکا تھا اور از روئے معاہدہ انھیں یقین تھا کہ وہ یزید کو ولی عہد نہیں بنائیں گے، اس لیے اس دَور کی بعض غیر شرعی باتوں کو انھوں نے گوارا کر لیا، لیکن جب یزید کی جبری ولی عہدی عمل میں آ گئی اور یزید خلیفہ بن گیا، اور اسلامی اصول نظر انداز کیے جانے لگے تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ اتنی بڑی قوت سے وہ عہدہ برآ نہیں ہو سکیں گے۔ انھوں نے دین کی حرمت پر زندگی قربان کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

امام حسین کی تقریر سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہ سبطِ رسول تاج و تخت کا جویا نہیں تھا، مال و دولت کا طلب گار نہیں تھا، اسلامی حکومت کا

علمبردار تھا - دینِ محمدیؐ کے اصولوں اور قدروں کو مٹتے ہوئے ہرگز نہیں دیکھ سکتا تھا۔
اس نے کربلا کی طرف جاتے ہوئے بیضہ کے مقام پر ایک خطبہ دیا اور اور اس میں اپنا دل کھول کر رکھ دیا، اس نے کہا:
لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس نے کسی ظالم، محرماتِ الٰہی کو حلال کرنے والے، خدا کا عہد توڑنے والے، احکامِ خدا اور رسولؐ کی مخالفت کرنے والے، خدا کے بندوں پر زیادتی کرنے والے بادشاہ کو دیکھا، اور قولاً و فعلاً اس پر غیرت نہ آئی، تو خدا کو حق ہے کہ اس شخص کو اس بادشاہ کی جگہ دوزخ میں داخل کر دے۔
لوگو! خبردار ہو جاؤ۔
ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت اختیار کر لی، اور رحمان کی اطاعت چھوڑ دی ہے، ملک میں فساد پھیلایا ہے، حدودِ الٰہی کو معطل کر دیا ہے۔ مالِ غنیمت میں اپنا حصہ بڑھا لیا ہے، خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام اور حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر دیا ہے، اس لیے مجھے غیرت آنے کا حق ہے![47]
اور بالآخر وہ حادثۂ عظیم ۔۔۔ شہادتِ حسینؓ ۔۔۔ رونما ہو گیا۔
چشمِ فلک نے ایک نبیؐ کے نواسے کو، اسی نبیؐ کے امتیوں کے ہاتھوں حرفِ احیاءِ دین کے جرم میں قتل ہوتے، کاہے کو کبھی اس سے پہلے دیکھا ہو گا؟
"یہ ایسا حادثہ تھا، جس پر شجر و حجر اور زمین و آسمان تا قیامت خون کے آنسو روئیں گے۔ دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم!"
یزید کی مدتِ حکومت چار سال سے زیادہ نہیں، اس کے بعد خاندانِ ابوسفیان کا خاتمہ ہو گیا، کیونکہ یزید کا بیٹا معاویہ بن یزید یہ ہولناک مناظر دیکھ کر اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی دست برداری اختیار کر لی، اور خانہ نشین ہو کر بیٹھ رہا۔ اور کچھ عرصے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

مروان نے یزید کی بیوی سے نکاح کیا، اور تختِ حکومت پر متمکن ہوگیا اس طرح حکومت سفیان کے خاندان سے مروان کے خاندان میں منتقل ہوگئی، اور عبدالملک بن مروان وغیرہ نے جو کچھ کیا، وہ تاریخ کے کس طالب علم یا مطالعہ کرنے والے کو نہیں معلوم؟

عمر بن عبدالعزیز کا استصواب اپنی خلافت کے لیے: اسی خاندان کے ایک فرد عمر بن عبدالعزیز سریر آرائے خلافت ہوئے، ان کا دورِ خلافت درحقیقت بالواسطہ طور پر ان تمام سنگین اور شنیع الزامات کی تصدیق تھا جو اس خاندان کے ملوک و سلاطین پر مؤرخوں کی طرف سے لگائے جا رہے تھے۔

عمرؓ بن عبدالعزیز نے اپنی پہلی تقریر میں فرمایا:

"خدا نے جو چیز حرام کردی، وہ قیامت تک کے لیے حرام ہے، جو حلال کردی وہ قیامت تک کے لیے حلال ہے۔ میں صرف احکامِ الٰہی کو نافذ کرنے والا ہوں، کسی کو یہ حق نہیں کہ خدا کی نافرمانی میں اس کی اطاعت کی جائے۔"

عمرؓ بن عبدالعزیز نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ یہ بھی فرمایا کہ "چونکہ میری نامزدگی اور بیعت شورائے عام سے نہیں ہوئی ہے، لہٰذا میں اپنی بیعت سے تمھیں آزاد کرتا ہوں، جسے چاہو، اپنا خلیفہ منتخب کرلو!"

اتنے دنوں کے بعد، ایسا باخدا اور خدا ترس خلیفہ میسر آیا تھا، کون خلع بیعت پر آمادہ ہوتا، سب نے تجدیدِ بیعت کرلی، گویا شورائے عام کے بعد انھوں نے زمامِ کار سنبھالی۔

غرض جب رائے عامہ کی توثیق حاصل کرلی، اور اپنے آپ کو امارت و خلافت کا مستحق بنالیا، تب وہ انقلاب انگیز قدم اٹھایا جو بنو امیہ کے قصرِ امارت کے لیے زلزلہ فگن ثابت ہوا۔

اموالِ مغصوبہ اور جاگیرات کی ضبطی: اس خاندان کے لوگوں کے پاس

بہت سی جاگیریں تھیں، جو اموالِ مغصوبہ کی حیثیت رکھتی تھیں، ان جاگیروں کو ضبط کر لیا، خود اپنی جاگیر بھی حکومت کو واپس کر دی، لوگوں نے پوچھا:

"آپ کی اولاد کا کیا ہوگا؟"

فرمایا: "وہ خدا کے حوالے ہیں"[۳۱]۔

اس کے بعد تمام مسلمانوں کے سامنے مسجد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"اموی خلفا نے ہم خاندان والوں کو جاگیریں بخشیں، خدا کی قسم نہ وہ دینے کے مستحق تھے، نہ ہم لینے کے، اب میں ان جاگیرداروں کو واپس کرتا ہوں اور آغاز اپنی جاگیر سے کرتا ہوں"۔

اس کے بعد جاگیروں کے پروانے منگائے، قینچی لی اور انھیں کاٹ کاٹ کر پھینکنا شروع کر دیا[۳۲]۔

عبدالملک کی بیٹی، فاطمہ آپؒ کی بیوی تھیں۔ ان کا بیش قیمت ہار بھی بیت المال میں داخل کر دیا[۳۳]۔

باغِ فدک کو عبدالملک نے اپنی جاگیر بنا لیا تھا۔ وہ بھی واپس کیا گیا[۳۴]۔

تمام مال مغصوبہ واپس کر دیا، عراق میں حکومت کو اتنا زیادہ مال واپس کرنا پڑا کہ اخراجات کے لیے مرکز سے روپیہ روانہ کرنا[۳۵]۔ اپنا سارا ذاتی سامان بھی جو جائداد منقولہ اور غیر منقولہ کی صورت میں تھا، بیت المال کو واپس کر دیا[۳۶]۔

حجاج بن یوسف نے نومسلموں سے بھی جزیہ لینا شروع کر دیا تھا۔ آپ نے یہ رسم فوراً بند کر دی۔ چنانچہ مصر میں اس کثرت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا، کہ جزیہ کی آمدنی میں معتدبہ کمی ہو گئی۔

عامل نے لکھا۔ "اب کیا کروں؟"

جواب دیا: "نومسلموں سے جزیہ تو کسی صورت میں بھی نہیں لیا جا سکتا رسول اللہؐ کو ہادی بنا کر خدا نے بھیجا تھا محصّل بنا کر نہیں"[۳۷]۔

اس کے علاوہ آپؓ نے گورنروں اور حاکموں کو تاکید کی کہ جزیہ دینے والوں کو اسلام کی دعوت دی جائے۔[۱۹]

ظاہر ہے ایسی حکومت کے خلاف خروج و بغاوت عند اللہ بھی جرم قرار پائے گا اور عند الناس بھی!

ماخذ:

۱؎ سورہ مائدہ، رکوع ۱، آیت ۳ ۲؎ طبری ج ۱، ص ۲۳۵

۳؎ سورۂ نساء، آیت ۵۹۔ ۴؎ صحیح بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی عن ابن عمرؓ۔

۵؎ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (طبع مصر) ص ۱۸۰

۶؎ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۱۲۔

۷؎ طبری، ابن اثیر، مسعودی، کنز العمال، یعقوبی، ابن خلدون اور دوسری عام کتابوں میں یہ خطبہ مذکور ہے۔

۸؎ طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۱۲۹، ۹؎ نسائی کتاب البیعۃ

۱۰؎ کتاب الخراج، (امام ابو یوسفؒ) طبع مصر، ۱۱؎ مراد خوارج ہیں

۱۲؎ مراد امیر معاویہ اور ان کے اصحاب ہیں، ۱۳؎ شرح نہج البلاغۃ از علامہ محمد عبدہٗ طبع مصر ص؟

۱۴؎ شرح و ترجمہ فارسی از علامہ فیض الاسلام، سید علی نقی، مطبوعۂ تہران، ص ۱۳۲۔

۱۵؎ الفتنۃ الکبریٰ ـــ عثمانؓ (طٰہٰ حسین) طبع مصر۔

۱۶؎ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (استاذ سید قطب شہیدؒ)

۱۷؎ زاد المعاد (علامہ ابن قیمؒ) طبع مصر، ج ۲، ص ۲۴)

۱۸؎ الفتنۃ الکبریٰ ـــ عثمانؓ (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) طبع مصر،

۱۹؎ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۳۴، ۳۵۔

۲۰ سورۂ آلِ عمران، پارہ ۳، رکوع ۴، آیت ۳۴،
۲۱ سورۂ نور، پارہ ۱۸، رکوع ۷، آیت ۵۵۔
۲۲ سورہ محمدؐ، پارہ ۲۶، رکوع ۷، آیت ۵۵۔
۲۳ سورۂ انفال، پارہ ۹، رکوع ۱، آیت ۲، ۲۴ سورۂ آلِ عمران، پارہ ۳۔
۲۵ سورۂ انفال، پارہ ۹، رکوع ۶، آیت ۴۷، نیز سورہ مجادلہ رکوع ۲، آیت ۱۴۔
۲۶ سورۂ نور، پارہ ۱۸، رکوع ۷، آیت ۵۷،
۲۷ سورۂ مائدہ، پارہ ۶، رکوع ۱۲، آیت ۹۳، نیز سورۂ تغابن رکوع ۲، آیت ۱۳
۲۸ سورۂ نسا، پارہ ۴، رکوع ۸، آیت ۱۰،
۲۹ باب الدعا، الی الاسلام، (صحیح بخاری) عن ابی ہریرۃ
۳۰ باب الاذان (صحیح بخاری) عن انس رضؓ بن مالک۔
۳۱ کتاب النکاح (صحیح بخاری) عن انسؓ بن مالک۔
۳۲ نہج البلاغۃ (تہذیب علامۂ عبدہٗ) طبع مصر، ص ۱۰۴۷۔
۳۳ سنن ابی داؤد عن ابی ذر غفاری رضؓ ۳۴ جامع کبیر، عن عبداللہ بن عمر رضؓ
۳۵ السیاسۃ الشرعیہ (علامۂ خلّاف) طبع مصر، ۱۴۲، ۱۴۳
۳۶ تاریخ خوارج (عمر ابوالنصر) طبع بیروت، ص ۱۹۲،
۳۷ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۴۸ - ۴۹)
۳۸ مناقب الامام اعظمؒ ابی حنیفہ، ص ۱۰، ج ۲ - (الموفق المکی)
۳۹ احکام القرآن (جصاص) طبع مصر، ج ۱، ص ۸۱،
۴۰ تاریخ خوارج (عمر ابوالنصر) طبع بیروت، ص ۵۸، ۵۹،
۴۱ الیافعی الشافعی، ج ۱، ص ۳۰۰ ۴۲ طبقات ابن سعد: (سوانح مالک)
۴۳ صحیح بخاری، مناقب قرابۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۴۴ الکامل (ابن اثیر) ج ۳، ص ۲۲۰ — ۲۲۱،
۴۵ ادب الجاہلی (ڈاکٹر طٰہٰ حسین)، شائع کردہ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ ص ۲۰۷، ۲۰۸

۴۶؎ تاریخ الکامل، لابن اثیر، ج ۴، ص ۲۲۵۔
۴۷؎ تاریخ ابن خلدون، ج ۱، ص ۱۷۷، ۴۸؎ الطبری، ج ۴، ص ۴۰-۱۴۱۔
۴۹؎ سیرت عمرؓ بن عبدالعزیز (ابن الجوزی) ص ۱۰۸
۵۰؎ طبقات ابن سعد، ج ۵، ص ۲۵۲ -
۵۱؎ تاریخ الخلفاء - (سیوطی) ص ۲۳۳
۵۲؎ ابوداؤد، کتاب الخراج والامارہ -
۵۳؎ طبقات ابن سعد، ج ۵، ص ۲۵۲،
۵۴؎ تہذیب الاسماء، ج ۱، ص ۲۱ -
۵۵؎ المقریزی، طبع مصر، ج ۲، ص ۱۲۵ -
۵۶؎ طبقات ابن سعد، ج ۴، ص ۳۱۵ -

---

(۶)

سربراہِ مملکت

مشرق ہو یا مغرب، جنوب ہو یا شمال، جمہوریت کا چلن ہر کہیں جاری و ساری ہے، اور ہر جگہ جمہوریت کو اور عوامیت کو زیادہ سے زیادہ فروغ و استحکام بخشنے کا عمل بھی جاری ہے، یقیناً یہ ایک مبارک اور نیک اقدام ہے، اور بلاشبہ زمانے کے ساتھ ساتھ فروغ و استحکام کے اس سلسلے میں مزید ترقی ہوگی۔

صدرِ مملکت کی ذات اور شخصیت: ہر جمہوریت کا ایک صدر مملکت ہوتا ہے۔ اس موقع پر صدر کے حدود و اختیارات سے بحث نہیں، گفتگو صرف بہ حیثیت صدر اس کی ذات اور شخصیت سے ہے۔

روس کی شورائیت، فرانس اور برطانیہ کی محدود، امریکہ کی لامحدود، لاطینی امریکہ کی لامحدود تر، ایشیا اور افریقہ کی ترقی پسند اور وسعت پذیر جمہوریت کے سربراہِ مملکت پر ایک نظر ڈالیے۔ یہ منصب کسی سربراہ کو موروثی طور پر نہیں ملتا۔ انتخاب کے ذریعے، ووٹ کی سیڑھی چڑھ کر وہ اس بام بلند تک پہنچتا ہے اور پہنچتے ہی بلند بام ہو جاتا ہے۔ سربراہِ مملکت بننے سے پہلے اس کی حیثیت کتنی ہی معمولی اور حقیر کیوں نہ ہو، لیکن قصرِ صدارت میں داخلے کے بعد، اس میں اور ایک سلطان والاشان کے کروفر، جاہ و جلال اور دبدبے و طنطنے میں کوئی مابہ الامتیاز باقی نہیں رہ جاتا۔ اس کے پاس باڈی گارڈ ہوتے ہیں۔ اس کے تصرّف میں بے حد و نہایت دولت ہوتی ہے وہ گراں قدر مشاہرہ پاتا ہے، جو ہر طرح کے محاصل سے بَری ہوتا ہے، اس کی تنخواہ خزانے میں جمع

ہوتی رہتی ہے اور اس کے جملہ مصارف حکومت کے خزانے سے ادا کیے جاتے ہیں۔ وہ انعام دے سکتا ہے۔ لطف و عنایت کی بارش کر سکتا ہے تمغے اور خطاب عطا کر سکتا ہے۔ ریل پر سفر کرتا ہے تو اسپیشل ٹرین اس کے لیے جاری ہوتی ہے، موٹر پر نکلتا ہے تو دُور دُور تک سڑک خس و خاشاک یعنی رہرووں سے پاک کر دی جاتی ہے۔ وہ کسی مجمع میں جلوہ فرما ہوتا ہے تو اس کی آمد سے پہلے لاکھوں روپے صرف کر کے استقبال کی تیاریاں کی جاتی ہیں۔ اس کے خیر مقدم کو، بے شمار لوگ حاضر کیے جاتے ہیں، اور رو و رویہ صف باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سفراء کو باریاب کرتا ہے۔ انھیں بیش قیمت تحائف دیتا اور ان سے لیتا ہے، انھیں مدعو کرتا ہے اور ان کی دعوت پر طرح طرح کے الوانِ نعمت دستر خوان پر جمع کر دیئے جاتے ہیں، انھیں سیر و شکار کی دعوت دیتا ہے اور اس ادائے مہمان نوازی پر بھی بے اندازہ روپیہ صرف ہو جاتا ہے، غرض جب تک وہ اس منصب پر فائز ہے، اس میں اور ایک بادشاہ ذی جاہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ بادشاہ ماں کے پیٹ سے تاجِ خسروی پہن کر نمودار ہوتا ہے اور اس کے سر پہ تاجِ ہمایونی رکھنے والے لوگ قوم کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ورنہ عملاً اس میں اور ایک خسرو حشمت مآب میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سربراہِ مملکت اپنی قوم کا اپنے ملک کا سب سے اہم فرد ہوتا ہے، اس کی زندگی اور طرزِ رہائش میں اگر شان و شوکت کا جلوہ نہ ہو تو داب حکومت میں فرق آتا ہے، اس کی وقعت کم ہوتی ہے، اور اس کی وقعت کم ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ حکومت کی، ملک کی اور قوم کی سبکی ہوتی ہے۔

اسلامی جمہوریت کا صدر اور اس کے خصائص: سربراہِ مملکت کے طرزِ ماند و بود اور اس کی ذات والا صفات کے ٹھاٹھ اور تجمل کے بارے میں

جو "اعتذار" پیش کیا جاتا ہے ممکن ہے وہ اپنی جگہ وزن رکھتا ہو اور بالکل بجا اور درست ہو۔ اس کی مدح و قدح سے متعلق کچھ عرض کرنا مقصود نہیں، گفتگو کا موضوع تو یہ ہے کہ "اسلامی جمہوریت" میں صدرِ مملکت کی ذات اور شخصیت کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ اس کا طرزِ رہائش کیا ہوتا ہے؟ اس کے مصارف کے مدّات کیا ہوتے ہیں؟ اور ان پر کس طرح عمل درآمد کیا جاتا ہے؟ آیا وہ بھی مذکورہ بالا حقوق و مراعات سے بہرہ یاب ہے کہ نہیں؟ آیا اسے بھی اپنی منصبی حیثیت میں بے تحاشہ خرچ کرنے اور عیش و تنعم کی زندگی بسر کرنے کا اختیار ہے کہ نہیں؟ آیا اپنے منصب پر فائز رہنے کے دَوران میں یعنی وقتی اور عارضی طور پر وہ شاہانہ زندگی بسر کر سکتا ہے کہ نہیں؟

آنحضرتؐ کی سیرت طیبہؐ کا نمونہ: صرف منطق اور فکر اور نظریے کے مقابلے میں حقائق و واقعات اور مشاہدات زیادہ کارگر اور مستند ہوا کرتے ہیں، لہٰذا ہم سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ گرامی کو پیش کریں گے کہ آپؐ دوگانہ حیثیت کے حامل تھے۔ نبی برحق بھی سربراہِ مملکت بھی، آپؐ جس طرح کی زندگی چاہتے بسر کر سکتے تھے کسی کو یارائے دم زدن نہ تھا۔ ایک سربراہِ مملکت پر تو اعتراض کیا جا سکتا ہے اور قانون پاس کر کے یا دوسرے ذرائع سے قدغن لگائی جا سکتی ہے لیکن ایک نبیؑ کی حیثیت ان سب چیزوں سے بالا ہوتی ہے اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہو سکتی، نہ اس کا احتساب کیا جا سکتا ہے نہ اس پر پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ خدا کا فرستادہ ہوتا ہے اور

گفتۂ او، گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

دیکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اس باب خاص میں ہماری کیا رہنمائی کرتی ہے؟

آدمی کی سب سے بڑی کسوٹی اس کے فرزند و زن ہوتے ہیں، وہ خود تکلیف اٹھا سکتا ہے مگر اپنے اہل و عیال کی تکالیف برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ خود دکھ جھیل

سکتا ہے لیکن اپنی آل و اولاد کو دکھ جھیلتے نہیں دیکھ سکتا۔ اور اگر اسے اختیارات حاصل ہوں، اس کے قبضے اور تصرف میں خزانۂ عامرہ ہو وہ غیر مسئول طور پر خرچ اور مصارف کے باب میں آزاد ہو، اور اسباب تنعم فراوانی کے ساتھ اسے حاصل ہوں تو زیادہ سے زیادہ جس پر وہ خرچ کرتا ہے وہ اس کی اولاد ہوتی ہے، خود بھی ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے چہیتوں کو اپنے سے زیادہ ٹھاٹھ کی زندگی بسر کراتا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہونے کے باوجود "بشر" بھی تھے اور آپ کو اپنے اہل و عیال سے غیر معمولی اُلفت اور محبت بھی تھی۔ حضرت فاطمہؓ اور حضرات حسنینؑ کے ساتھ آپؐ کو جو محبت تھی، اس سے تاریخ و سیر اور حدیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں، اسی طرح ازواج مطہرات سے بھی آپؐ کو گہرا لگاؤ تھا، ان کی خاطر اور دل جوئی میں کوئی دقیقہ آپؐ فرو گذاشت نہیں کرتے تھے، اور جو حدود آپؐ نے مقرر کر لیے تھے، ان کے اندر رہتے ہوئے انھیں زیادہ سے زیادہ سکھ اور آرام پہنچانے کی کوشش فرمایا کرتے تھے۔

الفقر فخری: عسرو فقر، یعنی مکہ مکرمہ کی پُرمحن زندگی اور مدینۂ منورہ کے عالم مہاجرت میں ازواج مطہرات نے بڑی استقامت اور عزم و ثبات کے ساتھ تمام تکلیفیں برداشت کیں، فاقے کیے۔ نیم گرسنگی کے شب و روز خاموشی کے ساتھ بسر کیے، گوشت، گندم اور اس طرح کی دوسری چیزوں سے مدتوں کوئی سروکار نہ رکھا، کبھی روکھی سوکھی کھالی اور کبھی کھجوروں پر گذارہ کرلیا۔

لیکن جب حالات بدلے، خوش حالی اور فتوحات کا دور شروع ہوا، مالِ غنیمت بہ افراط اور بکثرت آنے لگا تو قدرتاً ان کے دل میں خیال پیدا ہوا، جب خوش حالی کا دور شروع ہو چکا ہے تو ہم بھی اس سے کیوں نہ بہرہ ور ہوں؟ اب کیوں فاقے کریں؟ اب کیوں روکھی سوکھی کھائیں؟ اب کیوں پیوند لگے اور پرانے کپڑے پہنیں؟ اب کیوں نہ خادموں اور چاکروں، خادماؤں اور باندیوں سے کام لیں؟ یہ کوئی غلط جذبہ نہ تھا، تقاضائے بشریت کے عین مطابق تھا، لیکن جب نبیؐ نے

"الفخر فخری" کہہ کر فقر پر فخر کا اظہار فرمایا تھا، وہ اپنی زندگی میں کسی طرح کی تبدیلی کرنے پر تیار نہیں تھا، حضرت فاطمہ رضؓ آپؐ کی چہیتی بیٹی تھیں وہ جب آتیں آپؐ کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے، انھیں بٹھا کر بیٹھتے، لیکن انہی حضرت فاطمہ رضؓ کے ہاتھ میں جب چکی پیستے پیستے گھٹے پڑ گئے تو ایک روز حاضر ہوئیں، شرم سے کچھ نہ کہہ سکیں، حضرت علی رضؓ نے ان کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک باندی کی استدعا کی۔ آپؐ نے یہ استدعا منظور نہیں کی، ایک دعا بتادی اور رخصت کر دیا۔[1]

اصولاً حضرت فاطمہ رضؓ کی راحت و آسایش کے ذمے دار حضرت علی رضؓ تھے لیکن ازواجِ مطہرات کا نفقہ اور راحت اور آسایش کا سرو سامان تو آپؐ کے ذمے تھا۔ بدلے ہوتے حالات دیکھ کر انھوں نے بھی توسیعِ نفقہ چاہی اور اس پر اصرار بھی کیا۔ پیش پیش حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت حفصہ رضؓ یعنی ابو بکر صدیق رضؓ اور عمر فاروق رضؓ کی صاحبزادیاں تھیں۔

لیکن آپؐ نے ان کا یہ مطالبہ بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ مطالبہ آپؐ کی حیاتِ فقر و استغناء سے میل نہیں کھاتا تھا، اور جو اسوۂ حسنہ آپؐ اُمت کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے اس سے ہم آہنگ نہ تھا۔

ازواجِ مطہرات کی طرف سے مطالبے نے جب اصرار کی صورت اختیار کر لی تو آپؐ نے بظاہر ان سے قطع تعلق کر لیا اور حجرہ نشین ہو گئے، جہاں کسی اور کو آنے کی اجازت نہ تھی، اس سے لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ آپؐ نے ازواجِ مطہرات کو طلاق دے دی ہے۔

حضرت عمر رضؓ کی بیان کردہ تفصیل: اس واقعہ کی پوری تفصیل حضرت عمر رضؓ نے اپنے خاص انداز میں بیان کی ہے وہ فرماتے ہیں:

"اسلام سے پہلے ہمارا سلوک عورتوں سے اچھا نہیں تھا، انھیں کسی طرح کے حقوق حاصل نہ تھے، ہم عورتوں کو بے حقیقت اور لاشے سمجھا کرتے تھے؛ پھر اسلام آیا اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے حقوقِ نسواں کے متعلق احکام صادر فرمائے، اور ہم

پر اُن کے حقوق قائم کر دیئے، اس کے بعد تو بالکل ہی عورتیں تبدیل ہو گئیں اور طلبِ حقوق میں ان کی جراُت بڑھ گئی، ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کسی بات پر اپنی عادت کے مطابق مَیں نے اپنی اہلیہ سے درشت الفاظ میں بات چیت کی، بات بڑھی تو انھوں نے بھی اُلٹ کر ویسا ہی جواب مجھے دے ڈالا۔ مَیں نے جھڑکا اور ان سے کہا:

"کچھ ہوش میں ہو؟ میری باتوں کا جواب اس انداز میں دے رہی ہو!"

وہ کہنے لگیں، "تم میں ایسی کون سی بات ہے کہ چپ چاپ سنتی رہوں اور جواب نہ دوں، ذرا اپنی بیٹی پر بھی تو نظر ڈالو، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برابر سے جواب دیتی ہے، بعض دفعہ تو روٹھ جاتی ہے۔

یہ سُن کر مَیں نے دل میں سوچا، یہ تو عجیب ماجرا ہے، چنانچہ مَیں اُٹھا اور سیدھا حفصہؓ کے پاس پہنچا اور ان سے سوال کیا۔

"کیوں بیٹی! کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تکرار کرتی ہو؟ اور کیا دوسری ازدواج بھی ایسا ہی کرتی ہیں؟"

حفصہؓ نے جواب دیا۔ "ہاں! یہ سچ ہے، ہم یہ کرتے ہیں!"

مجھے غصہ آگیا، مَیں نے کہا: "تو خدا کے عتاب اور رسول اللہ علیہ وسلم کے غصہ سے نہیں ڈرتی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خفگی سے خدا بھی ناخوش ہوتا ہے۔ واللہ! اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا خیال نہ ہوتا، تو وہ تجھے طلاق دے چکے ہوتے، تو اپنی ضرورت مجھ سے بیان کر دیا کر، جو مانگے گی دوں گا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان مت کیا کر"!

حفصہؓ کے پاس سے اُٹھ کر مَیں ام المؤمنین ام سلمہؓ کی خدمت میں آیا، ان سے بھی مَیں نے وہی کہا جو حفصہؓ سے کہہ آیا تھا، میری بات سنتے ہی وہ بول پڑیں۔

"خطاب کے بیٹے! تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم ہر معاملے میں دخل دینے لگے ہو۔

اور اب نوبت یہ آپہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی بیویوں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے لگے ہو؟

ام سلمہؓ نے یہ بات کچھ اس انداز میں کہی کہ پھر میں کچھ نہ کہہ سکا، چپ ہو رہا اور واپس چلا آیا۔

اسی زمانے میں میرا ایک انصاری پڑوسی تھا، ہم دونوں باری باری سے ایک ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گذارا کرتے تھے اور پھر باہم دگر اپنے اپنے واقعات و مشاہدات سنادیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ پہ ہر آن یہ کھٹکا لگا رہتا تھا، کہیں دشمن چڑھائی نہ کردیں۔ خود میں بھی فرمانروائے غسّان کی طرف سے فکر مند رہا کرتا تھا۔

ایک شب خلافِ معمول اور خلاف وقت میرے انصاری پڑوسی نے میرے دروازے پہ دستک دی، اور بہ آواز بلند کہا۔ "دروازہ کھولو!"

میں فوراً باہر نکلا اور پوچھا۔ "خیر تو ہے، کیا غسّانی مدینے پر حملہ آور ہوئے ہیں؟"

انصاری پڑوسی نے جواب دیا۔ "غسّانیوں نے حملہ تو نہیں کیا ہے، مگر ایک سانحہ اس سے بھی بڑھ کر ہوگیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے!"

میں نے خیال کیا، یہ سب عائشہؓ اور حفصہؓ کی باتوں کا نتیجہ ہے۔

میں نے لباس تبدیل کیا، اور فوراً دربارِ رسالت میں پہنچا، آپؐ نمازِ فجر کے بعد بالاخانے پر تشریف لے گئے تھے۔ مسجد میں جو لوگ بیٹھے تھے، حد درجہ ملول اور دلگیر، یہ منظر دیکھ کر میں ضبط نہ کرسکا۔ بالاخانے کے نیچے سے میں نے بلالؓ سے کہا۔

"آنحضرت صلعم کو میری حاضری کی اطلاع دے دو!"

مگر حضوری کی اجازت نہ ملی۔

کچھ دیر انتظار کے بعد پھر میں نے بلال رضؓ سے کہا، "آنحضرت صلعم کو میری اطلاع کر دو!"

مگر اس مرتبہ بھی اذن باریابی نہ ملا۔

آخر میرا پیمانۂ صبر چھلک پڑا، مَیں نے بہ آواز بلند کہا۔

"شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہے کہ مَیں حفصہؓ کا سفارشی بن کر آیا ہوں، بخدا! مَیں تو صرف رضائے رسولؐ کا آرزومند ہوں، اگر ان کا ارشاد ہو تو اپنے ہاتھ سے حفصہؓ کی گردن اڑا دوں!"

اس مرتبہ مجھے اجازت ملی، اور مَیں بالاخانے پر پہنچا، مَیں نے دیکھا، آپؐ ایک کھرّی چارپائی پر لیٹے ہیں، جسم اطہر پر بانوں کے نشان نظر آرہے ہیں، ایک طرف تھوڑے سے جَو رکھے ہیں، ایک گوشے میں کسی جانور کی کھال لٹکی ہوئی ہے۔

یہ منظر دیکھ کر مَیں ضبطِ گریہ پر قادر نہ رہا، میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

آپؐ نے دریافت فرمایا: "عمرؓ یہ گریہ کیسا؟"

میں نے عرض کیا۔ "کیا یہ رونے کی بات نہیں ہے کہ قیصر و کسریٰ عیش اور راحت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ حالانکہ خدا سے غافل اور بے بہرہ ہیں، اور آپؐ کہ خدا کے نبیؐ اور رسول ہیں، حالت یہ ہے کہ آرام کی کوئی چیز بھی میسّر نہیں، کھرّی چارپائی پر لیٹے ہیں اور بانوں کے نشانات جسم پر صاف نظر آرہے ہیں۔"

آپؐ نے میری باتیں سُن کر فرمایا: "ہاں ٹھیک ہے، مگر کیا تم اس پر رضامند نہیں ہو کہ قیصر و کسریٰ کے حصّے میں دنیا آئے اور ہمارا حصہ عقبیٰ ہو؟

مَیں نے دریافت کیا۔ "کیا آپؐ نے ازواجِ مطہرات کو طلاق دے دی ہے؟"

جواب میں فرمایا: "نہیں"!

جوشِ مسرت سے بے اختیار "اللہ اکبر" کا نعرہ میری زبان سے بلند ہوا۔ پھر مَیں نے عرض کیا۔

ہم قریشی ہمیشہ عورتوں پر غالب رہے، مگر اب تو رنگ ہی دوسرا ہے۔ یہ

سُن کر آپؐ نے تبسّم فرمایا، پھر میں نے وہ باتیں دہرائیں، جو حفصہؓ اور ام سلمہؓ سے میں نے کی تھیں۔ یہ سُن کر پھر لب مبارک آشنائے تبسّم ہوئے۔

پھر میں نے عرض کیا۔ "مسجد میں لوگ ملول و دلگیر بیٹھے ہیں، اجازت ہو تو انھیں اطلاع دے دوں کہ طلاق کی خبر غلط ہے[۲]!"

حضرت عائشہ کا جواب: اس کے بعد آیۂ تخییر نازل ہوئی:

"اے محمدؐ! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے، اگر تم دنیا کی زندگی اور زینت کی طلبگار ہو تو صاف صاف کہہ دو۔ میں تمھیں احترام و عزت کے ساتھ رخصت کر دوں، اور اگر اللہ اور رسولؐ کی رضامندی اور آخرت کی طلبگار ہو تو پھر اسی کی ہو رہو، خدا نے تم میں سے نیکوکار عورتوں کے لیے بڑا درجہ رکھا ہے[۳]!"

اس کے بعد آپؐ ازواج مطہرات کے پاس تشریف لے گئے، اور حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو کہ یہی اضافۂ نفقہ کے مطالبے میں پیش پیش تھیں، یہ آیۂ مبارک سنائی اور فرمایا۔

"جلدی کی ضرورت نہیں، سوچ سمجھ کر بلکہ اپنے والد سے مشورہ کر کے جواب دو۔"

حضرت عائشہؓ بے ساختہ کہہ اٹھیں۔ "مشورہ کیسا؟ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے دو راستے رکھ دیئے ہیں ـــ فقر و استغنا، یا عیش و تنعم ـــ تو جواب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ دنیا اور نعائم دنیا کی قدر و قیمت بھلا آپؐ کی رفاقت کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتی ہے، میں نے سب کچھ چھوڑا، میں تو اللہ اور رسول اللہؐ کی محبت ہی کو ترجیح دیتی ہوں!"

دوسری ازواج مطہرات نے بھی اسی طرح کی باتیں کیں[۴]۔

یہ تھا اسلامی جمہوریہ کے سربراہ کا اسوۂ حسنہ جو تا قیام قیامت سورج کی طرح تاباں اور درخشاں رہے گا۔

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ وفات سے ایک دن پہلے:

"آپؓ نے سات درہم ــــ جو کل پونجی تھی ــــ غربا کو بانٹ دیے، اس روز عائشہ صدیقہ رضؓ نے گھر میں چراغ جلانے کے لیے ایک ہمسائی سے تیل قرض منگوایا ہے[5]

آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے پاس چند صاع جَو کے عوض رکھی ہوئی تھی،[6]

جس مملکت کو اس اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے والے اور اس سربراہِ مملکتؐ کی سنت پر عمل پیرا ہونے والے مل جائیں، کیا وہ اب بھی ساری دنیا پر چھا نہیں سکتی ؟

جواب دہی عوام کے سامنے بھی خدا کے سامنے بھی : حقیقت یہ ہے کہ سربراہِ مملکت کے لیے آپؐ نے جو اسوۂ حسنہ چھوڑا، اور پھر خلفائے راشدین نے اس پر جس طرح عمل کیا، اس کا جلوہ تاریخ کے کسی دور میں بھی نظر نہیں آتا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی جمہوریت کا سربراہ نہ صرف عوام کے سامنے جواب دِہ ہوتا ہے، بلکہ خدا کے سامنے بھی جواب دہ ہوتا ہے، عوام کی نگاہ سے تو بعض چیزیں چھپ سکتی ہیں، بہت سے کام اور بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں، جو چشمِ مردم سے پنہاں رہتی ہیں، اور رہ سکتی ہیں لیکن خدا سے تو کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی، وہ سب کچھ جانتا، سب کچھ دیکھتا، اور سب کچھ سنتا ہے، وہ خبیر ہے، علیم ہے، سمیع ہے، اس سے تو کچھ بھی نہیں چھپایا جا سکتا، لہٰذا اگر خدا کے سامنے جواب دہی کا واضح تصور موجود ہو تو غلط کاری کا امکان ہی نہیں۔

رسول اللہؐ کا اسوۂ حسنہ : آپؐ کی حالت یہ تھی کہ:

"کبھی آپؐ بستر پر ہوتے، کبھی چمڑے پر، کبھی چٹائی پر، بلکہ زمین پر بھی سو جاتے، کبھی چارپائی پر، اور کبھی سیاہ کمبل پر آرام فرماتے ۔ عباد بن تمیم رضؓ فرماتے ہیں ۔میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں چت لیٹے دیکھا کہ آپؐ نے ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھا ہوا تھا اور آپؐ کا بستر چمڑے کا تھا، جس میں

کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ آپؐ کے پاس بالوں کا ایک کمبل تھا، جسے دوہرا کرکے بچھا دیا جاتا۔

حضرت جابرؓ کا واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک اونٹ خریدا پھر اس کی قیمت ادا فرمائی اور زیادہ قیمت عطا فرمائی، مزید برآں اونٹ بھی واپس کر دیا۔

انصار نے اجازت چاہی کہ عمِ رسولؐ حضرت عباسؓ سے فدیہ کی رقم نہ لی جائے آپؐ نے فرمایا: "ایک درہم بھی نہ چھوڑو!"

حالانکہ کتب تاریخ و سیر سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے کہ آپؐ کو اپنے عمِ محترم سے بہت زیادہ محبت تھی، گرفتاری کے بعد ان کی کراہ کی آواز سنی، تو رات بھر نیند نہیں آئی، لیکن یہ گوارا نہیں فرمایا کہ عمِ رسولؐ ہونے کے باعث وہ فدیہ سے مستثنیٰ کر دیے جائیں۔ اور دوسرے لوگوں سے لے لیا جائے۔

فرنچ مؤرخ سدیو کا اظہارِ حقیقت: مشہور فرنچ مؤرخ سدیو نے آنحضرت صلعم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ اظہارِ عقیدت نہیں کہ وہ مسلمان نہ تھا، صرف اظہارِ حقیقت ہے، وہ لکھتا ہے:

"آپؐ خندہ رُو، ملنسار، اکثر خاموش رہنے والے، بکثرت ذکرِ خدا کرنے والے لغویات سے دُور، بیہودہ پن سے نفور، بہترین رائے اور عقل رکھنے والے تھے"۔

انصاف کے معاملے میں قریب و بعید، آنحضرتؐ کے نزدیک برابر ہوتا تھا مساکین سے محبت فرمایا کرتے تھے۔ غرباء میں رہ کر خوش ہوتے اور کسی فقیر کو اس کی تنگدستی کی وجہ سے حقیر نہ سمجھتے تھے، اسی طرح کسی بادشاہ کو بادشاہی کی وجہ سے بڑا نہ جانتے، اپنے پاس بیٹھنے والوں کی تالیفِ قلوب فرماتے، جاہلوں کی حرکات سے صبر فرمایا کرتے کسی شخص سے خود علیحدہ نہ ہوتے جب تک وہ خود نہ چلا جاتا، صحابہؓ سے کمال محبت فرمایا کرتے، اپنے جوتے کو خود گانٹھ لیتے اور کپڑے کو خود پیوند لگا لیا کرتے تھے۔[۹]

"بندہ و آقا اور سفید فام و سیاہ رنگ کسی شخص کے ساتھ امتیازی برتاؤ نہ کرتے، سب سے یکساں خوش روئی اور خوش خلقی کے ساتھ ملاقات فرماتے[۹]۔"

حضرت انس رضؓ کا بیان ہے کہ میں نے دس سال تک آپؐ کی خدمت کی، مگر کبھی آپؐ نے ڈانٹنا تو کجا، کبھی میری غلطی پر اُف تک نہیں کی[۱۰]۔

ایک مرتبہ ایک شخص بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا، جلالتِ نبویؐ دیکھ کر ہراساں ہوگیا۔

آپؐ نے اس کی دلدہی کرتے ہوئے فرمایا: "کیا میں کوئی بادشاہ ہوں؟ میں تو قریش کی ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں[۱۱]۔"

انصار کا اپنے "سربراہ مملکت" پر اعتراض اور اس کا جواب:

مؤلفۃ القلوب کو یعنی نومسلموں کو آپؐ نے ایک مرتبہ مال غنیمت میں بہ نسبت انصار کے زیادہ حصہ دیا بعض نوجوان انصاریوں کو یہ بات گراں گذری، آپؐ نے انھیں طلب فرمایا اور کہا:

"اے جماعت انصار! مجھے تمھاری ایک بات پہنچی ہے کہ تمھارے قلوب میں وہ چیز کھٹکتی ہے، کیا تم گمراہ نہ تھے؟ پھر اللہ نے میری وجہ سے تمھیں ہدایت دی؟ کیا تم مفلس نہ تھے؟ اللہ نے میری وجہ سے تمھیں غنا عطا کیا؟ کیا تم آپس میں دشمن نہ تھے، پھر اللہ نے میری وجہ سے تمھارے دلوں میں محبت بھر دی؟"

انھوں نے جواب دیا: "اللہ اور اس کے رسولؐ کا بہت بڑا احسان اور فضل ہے!"

پھر فرمایا: "اے انصار کی جماعت، تم مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟"

انھوں نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسولؐ! ہم کیا جواب دیں؟ اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کا احسان اور فضل ہے۔"

آپؐ نے فرمایا: "بخدا! اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو، اور تم سچ کہو گے، اور میں تمھاری تصدیق کروں گا۔ کہ اے محمدؐ! تو ہمارے پاس آیا، ہم نے تجھے پناہ دی جب قریش نے تیری تکذیب کی تھی۔ ہم نے تیری تصدیق کی، تو کمزور تھا، ہم نے تیری مدد کی۔

تجھے وطن سے نکال دیا گیا، ہم نے تجھے پناہ دی تھی، تو مفلس آیا تھا، ہم نے تیری مؤاساۃ کی۔

کیا تمھارے دلوں میں دنیا کی محبت ہے؟ میں نے اس مال غنیمت سے ایک قوم کا دل رکھا ہے، تاکہ وہ اسلام میں پختہ ہو جائے، اور تمھیں تمھارے اسلام کے سپرد کیا ہے۔

اے جماعت انصار! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ لوگ بکریاں اور اونٹ لے جائیں اور تم اپنے ساتھ اللہ کے رسول کو لے جاؤ، اُس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، جو کچھ تم لے کر جا رہے ہو، وہ اس سے بہتر ہے جسے وہ لے کر جا رہے ہیں، اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار کا ایک آدمی ہوتا اور اگر لوگ ایک علاقہ اور وادی میں چلیں اور انصار دوسرے علاقہ اور وادی میں چلیں، تو میں انصار کے علاقے اور ان کی وادی میں چلوں گا۔ انصار (شعار) (اصل) ہیں، اور لوگ وثار (بڑی چادر) ہیں۔ اے اللہ! انصار پر، انصار کے بیٹوں پر، اور انصار کے پوتوں پر رحم فرما۔"

راوی کا بیان ہے کہ انصار رو پڑے، حتیٰ کہ ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں۔ اور کہنے لگے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم پر راضی ہیں، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے، اور لوگ بھی منتشر ہو گئے[۱۱۱]

اور جو دوسروں کو دینے میں اتنا فیاض تھا، اس کی اندرون خانہ زندگی کا کیا حال تھا؟

حضرت فاطمہ کا ایک واقعہ: ایک مرتبہ آپؐ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے، ہند بنت ہبیرہ کو وہ اپنی گردن سے اتار کر طلائی مالا دکھا رہی تھیں، اور کہہ رہی تھیں۔

"یہ مجھے علیؓ نے دیا ہے!"

آپؐ نے بیٹی کے ہاتھ میں یہ ہار دیکھا اور اُلٹے پاؤں تشریف لے گئے، باپؐ

کہ مزاج شناس بیٹی رض نے سمجھ لیا، اس طرح واپس چلے جانے کا سبب کیا ہے؟ فوراً ہار بیچ ڈالا۔ اس رقم سے ایک غلام خریدا، پھر اسے آزاد کر دیا، آپ ؐ کے سمع مبارک تک یہ بات پہنچی تو مسرور ہوئے، اور فرمایا۔ "الحمد للہ!"[۱۳]

"میں بادشاہ نہیں تم ہی کا ایک فرد ہوں ...": داعیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اور جمہوریت اسلامیہ کے بانی ؐ کے نزدیک بادشاہت یعنی شخصی اور مطلق العنان فرماں روائی کی حیثیت کیا تھی، اس کا اندازہ اس روایت سے ہو سکتا ہے۔

ایک مرتبہ آپ ؐ نے ایک ازار خریدا، بیچنے والا محبت سے دست بوسی کے لیے جھکا، آپ ؐ نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا:

"میں کوئی بادشاہ تو نہیں، تمھیں میں سے ایک ہوں!"[۱۴]

وفات سے پانچ روز پہلے (جمعرات کے دن) آپ ؐ کو یاد آیا کہ حضرت عائشہ رض کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں، دریافت فرمایا: "عائشہ رض! وہ اشرفیاں کہاں ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا: "رکھی ہیں۔"

فرمایا: "کیا محمد ؐ خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا؟ جاؤ ان کو خدا کی راہ میں خیرات کر دو!"[۱۵]

آں حضرت ؐ فرمایا کرتے تھے: "جو حکام کے جھوٹ کی تصدیق اور ظلم میں مدد کرے وہ مجھ سے نہیں، نہ حوضِ کوثر پر مجھ سے ملے گا۔"[۱۶]

اور یہ ؐ جو بادشاہ نہیں تھا، مگر سرورِ کائنات اور فخرِ موجودات تھا۔ اس کی زندگی یہ تھی:

حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا![۱۷]

خلفائے راشدین کا اُسوہ: جب زمامِ کار خلفائے راشدین کے

ہاتھوں میں آئی، تب بھی جس جادۂ صواب پر وہ گامزن رہے، وہ اسوۂ رسولؐ کے سوا کچھ نہ تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ جب اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے فرمایا: "بارِ خلافت اٹھانے کے بعد میرے مال اور املاک میں جو اضافہ ہوا ہے، اسے پرکھ لو، جو چیزیں زیادہ نظر آئیں، وہ سب میری وفات کے بعد، میرے بعد ہونے والے خلیفہ کو دے دو، بیت المال سے میں اسی قدر لیتا تھا، جتنا اپنی تجارت سے کما لیا کرتا تھا، حضرت عائشہ رضؓ کا بیان ہے۔

"وفات کے بعد جب ہم نے آپؓ کے ترکے کو جانچا، تو دو چیزیں ملیں، ایک غلام اور ایک اونٹنی، یہ دونوں چیزیں ہم نے عمر رضؓ کو بھیج دیں[۱۸]۔"

خلیفۂ دوم حضرت عمر رضؓ کے مزاج و طبیعت میں جو سختی اور شدت تھی وہ تاریخ کے ہر طالب علم کو معلوم ہے۔

حضرت عمر رضؓ کی ایک عہد آفرین مجلس مشاورت: با ایں ہمہ مشورت پر آپؓ بھی عامل تھے، آپ نے کبھی اپنی رائے دوسروں پر تھوپنے اور اپنے فیصلے کو زبردستی منوانے کی کوشش نہیں کی، اس سلسلے میں سوادِ عراق کا واقعہ خاص اہمیت رکھتا ہے جس کی تفصیل امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں بیان فرمائی ہے:

"جب عمر رضؓ بن خطاب کے پاس سعد بن ابی وقاص کی طرف سے جیش عراق آیا، تو آپؓ نے اصحابِ رسول سے اس زمین کی تقسیم کے بارے میں مشورہ فرمایا، جو عراق و شام میں مسلمانوں کے ہاتھ آئی تھی، ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ یہ زمین جن مجاہدوں نے فتح کی ہے، انھی میں تقسیم کر دی جائے۔

یہ سن کر حضرت عمر رضؓ نے اس بات سے اختلاف کیا۔

عبدالرحمٰن رضؓ بن عوف نے پوچھا، آپؓ کی رائے کیا ہے؟ حالانکہ زمین پر تو انہی لوگوں کا حق ہے جنھوں نے اسے فتح کیا ہے!

حضرت عمر رضؓ نے فرمایا: "اگر میں ارضِ شام اور ارضِ عراق کو فتح کرنے

والی افواج میں تقسیم کر دوں تو پھر سرحدوں کی حفاظت، افواج کی تیاری، امن و امان کی بحالی اور نظم و انتظام کرنے کے مصارف کہاں سے آئیں گے"؟

حضرت عمرؓ سے اختلاف کرنے والوں کا کہنا تھا، کہ جو کچھ ہماری تلوار نے فتح کیا ہے وہ ہمارا حصّہ ہے، اس کے بعد کے آنے والوں کا حصّہ کیسے ہو سکتا ہے!

لیکن حضرت عمرؓ اپنی رائے پر قائم رہے۔

لوگوں نے کہا: "اچھا مشورہ کیجیے"۔

چنانچہ مہاجرین اوّلین سے مشورہ کیا گیا، یہاں بھی اختلاف رونما ہوا عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی رائے تھی کہ زمین فوج میں تقسیم کر دی جائے۔ عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ اور ابنِ عمرؓ کی رائے، حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق تھی۔

اب حضرت عمرؓ نے دس انصار کو بھی شریک مشورہ کیا، پانچ نمائندے قبیلۂ اوس کے تھے اور پانچ قبیلۂ خزرج کے، یہ حضرات اپنے اپنے قبیلہ کے کبار و اشراف تھے، جب یہ سب حضرات جمع ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے بعد حمد و ثنا، فرمایا۔

حضرت عمرؓ کی معرکۃ الآرا تقریر: "آپ کے معاملات کا جو بار میں نے اُٹھا رکھا ہے، اور جو امانت میں نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے، اس میں شرکت کے لیے میں نے آپ کو تکلیف دی ہے۔ میں بھی آپ میں سے ہوں، آج آپ حق کا فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ خواہ کسی کو مجھ سے اختلاف ہو یا اتفاق، میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ صرف میری رائے کی پیروی کریں، آپ کے پاس خدا کی کتاب ہے۔ جو حق ہی کہتی ہے، پس خدا کی قسم میں جو کچھ کہتا ہوں، میرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ حق کے مطابق ہو، لوگوں نے کہا:

"ہم سُن رہے ہیں، فرمائیے یا امیر المومنین!"

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "آپ نے ان حضرات کی رائے سُن لی، جن کا

خیال ہے کہ مَیں ان کے حقوق پر چھاپہ مار رہا ہوں اور مَیں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ سے کوئی ظلم سرزد ہو، اگر مَیں نے ان پر ذرا بھی ظلم کیا ہو اور ان کا حق کسی اور کو دے دیا ہو تو یقیناً مَیں نے شقاوت کی، لیکن میرا خیال ہے کہ ارضِ کسریٰ کی فتح کے بعد اب کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کی زمین ان کے مال اور ان کی املاک کا مالک بنا دیا ہے، اہل لوگوں کے درمیان مَیں نے مالِ غنیمت تقسیم کر دیا اور خمس نکال لیا، لیکن زمین کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ فوج میں تقسیم نہ کی جائے اور اسے خراج پر وہیں کے رہنے والوں کو سونپ دیا جائے۔ اور جزیہ بھی ان پر عائد کر دیا جائے۔ یہ مقاتلہ کرنے والے مسلمانوں کے لیے ہو گا، اور ان مسلمان نسلوں کے لیے بھی جو بعد میں آئیں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ سرحدوں کی حفاظت کرنے کے لیے سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان بڑی بڑی متمدن مملکتوں مثلاً شام، جزیرہ، کوفہ بصرہ، مصر ــــــ کے لیے مکمل اور بہت بڑی فوج کی ضرورت ہر وقت رہے گی اب اگر یہ زمین تقسیم کر دی جائے تو ان واجبات، دفاع، حفاظت اور حملہ، ہجوم کے مصارف کہاں سے آئیں گے؟"

حاضرین نے بالاتفاق کہا۔ "آپؓ کی رائے بہتر اور انسب ہے، جو آپؓ نے کہا، وہ ٹھیک ہے، جو آپ نے سوچا وہ درست ہے۔ اگر ان ممالک کی سرحدوں کا انتظام نہ کیا گیا۔ انھیں قابو میں رکھنے کے لیے فوج کا بندوبست نہ کیا گیا، تو اہلِ کفر پھر ان ممالک پر چڑھ دوڑیں گے۔

قرآن سے استدلال: حضرت عمرؓ نے فرمایا: "ہاں اب حقیقت منکشف ہو گئی!"

پھر آپؓ نے فرمایا: "کوئی ایسا عقیل و فہیم آدمی چاہیے جو اس زمین کا صحیح بندوبست اور پیمائش کر سکے"!

لوگوں نے کہا: "عثمانؓ بن حنیف اس کام کے لیے موزوں ہیں۔ انھیں

آپ اس سے بھی اہم کام سونپ سکتے ہیں، وہ عقل، بصیرت، تجربہ، ہر چیز رکھتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے سلسلۂ بحث میں یہ بھی فرمایا: میں اس خیال کی تائید، کلام پاک سے بھی دیکھ رہا ہوں، پھر آپؓ نے سورۂ حشر کی وہ آیات تلاوت فرمائیں جو فئے سے رکھتی ہیں[۱۹]۔"

اپنے عاملوں اور گورنروں کو کبھی بھی حضرت عمرؓ نے عیش و عشرت اور جاہ و جلال کی زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں دی۔

امام ابو یوسف کی ایک روایت: امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں لکھا ہے: "مصر کے عامل عیاض بن غنم کے بارے میں معلوم ہوا کہ دروازے پر پہرے دار مقرر کر رکھے ہیں۔ آپؓ نے انھیں واپس بلوایا اور بکریاں چروانے کا کام سونپ دیا۔

وہ کہنے لگے۔ "اس سے موت بہتر ہے؟"

یہ سن کر فرمایا: "بکریاں چراتے ہوئے تجھے شرم دامن گیر ہے؟ تیرے باپ کا نام غنم پڑا ہی اس لیے تھا کہ وہ بکریاں چرایا کرتا تھا۔"

آخر عیاض تائب ہوئے اور آیندہ پھر کبھی ایسی جرأت نہ کی[۲۰]۔

حضرت عمرؓ جب کسی کو عامل یا گورنر بناتے تو اس کے مال و منال کی فہرست لے کر رکھ لیتے جو اضافہ ہوتا، وہ بیت المال میں داخل کرا دیتے۔

ابنائے عمرؓ اور گورنر مصر: اسلامی جمہوریت میں سربراہِ مملکت کے سر پہ امارت و ریاست کا جو تاج ہوتا ہے وہ ہیرے اور جواہرات کا نہیں، کانٹوں کا ہوتا ہے۔ وہ مساواتِ عام کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن اپنے اور اپنے کنبے کے معاملے میں اس درجہ محتاط ہوتا ہے کہ کسی فردِ خاندان کے ساتھ خواہ وہ اس کا لختِ جگر ہی کیوں نہ ہو، کسی طرح کی رعایت اور سلوک کا برتاؤ نہیں کر سکتا۔

۲۱ھ میں حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمن

بن عمرؓ مصر گئے، یہاں کے گورنر عمرو بن العاص تھے۔ حضرت عمرؓ نے انھیں لکھ بھیجا، خبردار میرے خاندان کا کوئی آدمی اگر تمھارے پاس آئے تو نہ اسے تحفہ دینا۔ نہ سوغات، نہ اس کے ساتھ خصوصی اور امتیازی برتاؤ روا رکھنا۔

عمروؓ بن عاص کا بیان ہے، میں نے تعمیل حکم کی،

ایک روز عبدالرحمنؓ بن عمرؓ آئے اور شراب نوشی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے اوپر حد جاری کرنے کی درخواست کی اور کہا۔

"اگر آپ نے مجھ پر حد جاری نہ کی تو میں مدینہ منورہ جا کر امیرالمؤمنین کو مطلع کر دوں گا۔ اتنے میں ان کے بھائی عبداللہ بن عمرؓ آگئے، میں نے انھیں خوش آمدید کہا اور صدرِ مجلس میں بٹھانا چاہا، لیکن انھوں نے معذرت کر دی، اور کہا:"

"والد نے مجھے آپؓ سے ملنے کی ممانعت کر دی ہے، بجز اس صورت کے کہ ملاقات ناگزیر ہو، اور اس وقت ایسی ہی صورت پیش آگئی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرے بھائی عبدالرحمٰن کا سر برسرِ عام نہ مونڈا جائے، حد جہاں چاہیے جاری کر دیجیے، میں نے گھر کے صحن میں حد لگائی۔

پھر عبداللہ بن عمرؓ بھائی کو لے کر ایک کمرے میں گئے اور وہاں ان کا سر مونڈ دیا۔

اس واقعہ کو تھوڑی ہی مدت گذری تھی کہ مجھے امیرالمومنین کا یہ مکتوب ملا۔ لکھا تھا:

"عبداللہ عمر امیرالمؤمنین کی طرف سے، عاصی بن عاصی کو سلام علیک، مجھے حیرت ہے تم پر اور تمھاری جرأت پر کہ تم نے میری ہدایات کی خلاف ورزی کی۔ میں نے اصحابِ بدر اور تم سے بہتر لوگوں کو نظر انداز کر کے تمھیں منتخب کیا، تم گم نام تھے، مگر تم کو پچھلی صف سے نکال کر پہلی صف میں لا کھڑا کیا، لوگوں نے مجھ سے کہا تھا تم جرأت و ہمت سے کام نہ لو گے اور میں دیکھ رہا ہوں، ویسا ہی ہوا، جیسا انھوں نے کہا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے، تم کو بری طرح معزول کرنا پڑے گا۔ تمھارا برا ہو

عبدالرحمٰن کو اپنے گھر میں حد لگاتے ہو اور اس کا سر بھی گھر کے اندر مونڈتے ہو حالانکہ تم کو معلوم تھا کہ یہ بات میری مرضی کے خلاف ہو گی۔ عبدالرحمٰن رضؓ تمھاری رعیت کا ایک فرد تھا، اور تم کو اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا چاہیئے تھا، جیسا کہ کسی دوسرے مسلمان کے ساتھ، لیکن تم نے کہا، امیرالمومنین کا لڑکا ہے، اس کے ساتھ رعایت کریں، حالانکہ تم جانتے ہو حقوق اللہ میں مَیں کسی کی رعایت نہیں کرتا۔"

یہ خط پاتے ہی عبدالرحمٰنؓ کو عبا (بالوں کا لمبا کوٹ) پہنا کر اور بغیر کجاوہ کے اونٹ پر سوار کر کے روانہ کر دو، تاکہ اپنی بدکرداری کا مزہ چکھ سکے۔[۲۱]

حضرت عمرؓ کی چند اور مثالیں: حضرت عمرؓ نے باہمہ جلالتِ شان اپنے آپ کو کبھی غیر مسئول نہیں سمجھا، یہی نہیں کہ ان پر اعتراضات کیے گئے، اور ٹھنڈے دل سے ان کا جواب دیا اور معترض کو ساکت کر دیا۔ بلکہ وہ خود لوگوں کو ترغیب دیا کرتے تھے کہ اگر انھیں کوئی بات قابلِ گرفت نظر آئے اور اپنے حقوق پامال ہوتے دیکھیں تو بازپرس کریں۔[۲۲]

حضرت عمرؓ ایک بہت بڑی مملکت کے سربراہ تھے، قیصر و کسریٰ کا خزانہ ان کے تصرف میں تھا اور دنیا کا بہت بڑا حصہ ان کے زیرنگین تھا، بڑے بڑے ممالک کے سفیر کبیر آستانۂ عمرؓ پر حاضر ہوا کرتے تھے، اور یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے کہ جس کا نام سن کر وہ ہیبت سے لرزنے لگتے تھے۔ وہ سر کے نیچے تکیے کے بجائے اینٹ رکھے لیٹا ہے، عمامہ دریدہ ہے، لباس میں اَن گنت پیوند، پاؤں کے چپلوں کا یہ حال کہ گھسے ہوئے اور ٹوٹے ہوئے۔

قحط کے زمانے میں اپنے لڑکے کو پھل کھاتے دیکھا تو بہت خفا ہوئے۔ فرمایا: "لوگ بھوکے مر رہے ہیں تو پھلوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے"[۲۲]

علی مرتضیٰ کی نگاہ میں سربراہ مملکت کا تصور: علی مرتضیٰؓ نے سربراہِ مملکت کی خصوصیات یہ بتائی ہیں:۔

"اور تم جانتے ہو، وہ شخص ناموس و خونِ مردم، غنیمت، احکام اسلام اور

امانتِ مسلمین کا سزاوار نہیں، جو بخیل ہو کہ وہ طمع و حرص میں مبتلا ہو جائے گا۔ نہ اسے جاہل ہونا چاہیے، ورنہ اپنی نادانی سے دوسروں کو گمراہ کر دے گا۔ ستم گر نہ ہونا چاہیے ورنہ اپنے ظلم و جور سے لوگوں کو پریشان کرے گا، نہ تغیّر ایام سے ڈرنے والا ہونا چاہیے، ورنہ ایک طاقتور گروہ سے مل کر دوسرے کمزور گروہ کو ذلیل و خوار کرے گا، نہ اسے رشوت لینے والا ہونا چاہیئے کہ مال لے کر باطل کو حق اور حق کو باطل کر دے گا اور حقوق ضائع ہو جائیں گے، حدودِ الٰہی نافذ نہ ہو سکیں گے، سنت کا معطل کرنے والا نہ ہونا چاہیئے ورنہ امت کو ہلاک کر دے گا"!

پھر ایک موقع پر فرمایا: "اے لوگو! اپنے نفوس امارہ پر میری اعانت کرو، ہوائے نفس کی پیروی نہ کرو، میری اطاعت کرو، خدا کی قسم میں ستم گر سے ستم دیدہ کا حق حاصل کرنے کے لیے از روئے عدل و انصاف حکم کرتا ہوں گا اور ستم گار کو با حلقہ بینی کھینچوں گا، اونٹ کی طرح کہ اس کی ناک میں حلقہ ڈال دیتے ہیں، اور پھر مہار سے پکڑ کر کھینچتے ہیں، یہاں تک کہ اسے چشمۂ حق پر لے آؤں گا، اگرچہ یہ بات اسے گراں کیوں نہ گذرے۔ [۲۴]"!

حیات حضرت علیؓ کے چند نمونے: حضرت علی مرتضیٰ رضؓ سردی سے ٹھٹھرتے رہے لیکن بیت المال کے روپے سے سرمائی لباس بنا ناپسند نہ فرمایا۔ آپؓ کی احتیاط پسندی کا اس باب میں یہ عالم تھا کہ پورے عہدِ خلافت میں کوئی نیا کپڑا، اپنے لیے نہ بنوایا نہ پہنا [۲۵]!

ایک مرتبہ آپؓ کی صاحبزادی نے بیت المال سے کچھ شہد منگوایا، آپ کو پتہ چلا تو اس کا بھاؤ معلوم کر کے قیمت بیت المال میں داخل کرا دی [۲۶]۔

آپؓ کا ارشاد تھا اور اس ارشاد پر عمل بھی تھا:

"اے لوگو! مَیں کسی طاعت کی تمھیں ترغیب نہ دوں گا، مگر یہ کہ تم سے پہلے مَیں خود اس پر عمل پیرا ہو لوں، اور کسی معصیت سے تمھیں نہ روکوں گا جب تک خود

اس سے کنارہ کشی اختیار نہ کر لوں [۲۷]۔

آپؓ کا لباس کیا تھا؟ معمولی کپڑے کا تہہ بند قمیص کی آستین چھوٹی، اور دامن اونچی کہ بیت المال کا روپیہ اپنی ذات پر کم سے کم خرچ ہو۔ خلیفہ کی حیثیت سے گشت پر نکلتے تو اسے پسند نہ کرتے کہ خود آگے آگے ہوں، اور لوگ پیچھے پیچھے، فرماتے:

"اس میں فرماں روا کے لیے فتنہ اور مومن کے لیے ذلت ہے [۲۸]!"

سربراہِ مملکت کا یہ معیار موجودہ زمانے میں کہیں بھی نہیں ملتا، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ ناقابلِ عمل ہے، اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا اپنے آپ کو فنا کر دینا ہے، اور اس کے لیے نہ جمہوریت کو تیار کیا جا سکتا ہے، نہ عوامیت کو، نہ شورائیت کو، پھر بھلا آمریت اور بادشاہت کے ایوانِ گہر بار میں اس پر عمل پیرا ہونے کا خیال کون دل میں لا سکتا ہے۔؟

سربراہِ مملکت کے لیے ماوردی کی شرطِ انتخاب: خلافت یا سربراہِ مملکت کے استحقاق کے لیے ماوردی نے لکھا ہے کہ اس کی لازمی شرط انتخاب ہے ـــ جمہور فقہا اور متکلمین کہتے ہیں کہ جب تک اس کا باقاعدہ انتخاب نہ کیا گیا ہو اور اسے لوگوں نے پسند نہ کر لیا ہو اس کی امامت صحیح نہیں پھر اہل حل وعقد کے لیے ضروری ہے کہ وہ باضابطہ طور پر بھی انتخاب کے بعد امام کی بیعتِ عام لیں اگر سب نے اتفاق کیا تو اس کی امامت مکمل ہو جائے گی [۲۹]!

امویوں کا دورِ حکومت جیسا کچھ تھا، ظاہر ہے، لیکن اس عہد میں بھی روشن اور تابناک مثالیں مل جاتی ہیں۔

عبدالملک رشوت خوری کو بے حد ناپسند کرتا تھا، اسے ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ اس کے ایک کاتب نے ہدیہ قبول کر لیا ہے۔ اس نے کاتب کو بلا کر کہا:

"خدا کی قسم اگر تم نے یہ اس نیت سے قبول کیا ہے کہ ہدیہ پیش کرنے والے کو تمھیں اس کا کچھ بدلہ نہیں دینا ہے تو تم لئیم ہو۔ اگر تم نے اس ارادے سے

اسے قبول کیا ہے کہ اس آدمی کی وہ حاجت پوری کر دو گے جسے ہدیہ نہ ملنے کی صورت میں تم پورا نہ کرتے تو تم خائن ہو۔ اگر تمہارا منشا یہ ہے کہ اس شخص سے ہدیہ کا عوض تم اسے ضرور دو گے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ اس کی خاطر تم امانت میں خیانت کرو گے، اپنی ساکھ پر آنچ بھی نہ آنے دو گے تو تم نے جو کچھ قبول کیا ہے اس کا کم سے کم یہ نقصان ضرور ہو گا کہ جن لوگوں کے ساتھ تمھارا معاملہ ہے، ان کی زبان تم پر دراز ہو گی، جن لوگوں کے ساتھ تمھاری نشست و برخاست ہے، وہ تمھارے سامنے دلیر ہوں گے، اور تمھاری قوت و اقتدار کی ہیبت جاتی رہے گی، اس کے بعد اس کو برطرف کر دیا۔[۳۰]

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مثال : اور حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے تو اس خاندان کی مجموعی زیادتیوں کی تلافی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

آپؓ نماز پڑھنے کے لیے باہر تشریف لائے، ایک شخص نے جو یمن سے آیا تھا، استغاثہ کیا، اور ایک شعر پڑھا، جس کا ترجمہ یہ ہے:

"امیر المومنین! آپ پریشان مظلوم کو اپنے دروازہ پر بلاتے ہیں، یہ لیجیے ایک دور سے آیا ہوا مظلوم آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

آپؓ نے پوچھا: "تم پر کیا زیادتی ہوئی ہے؟"

اس نے عرض کیا: "حضور! عبداللہ بن ولید بن عبدالملک نے میری زمین دبا لی ہے!"

"آپؓ نے رجسٹر منگا کر اسے دیکھا، تو اس میں لکھا ہوا تھا، عبداللہ بن ولید بن عبدالملک نے فلاں شخص کی زمین اپنے لیے انتخاب کی ہے۔ آپؓ نے حکم دیا کہ اسے کاٹ کر لکھ دو، اصل مالک کو واپس دی گئی، اور اسے دوچند خرچہ دیا جائے۔[۳۱]"

عباسی خلفاء میں منصور "سفاح" کے نام سے مشہور ہے، یعنی خوں ریز! لیکن اس کے دور میں کچھ روشن چنگاریاں بھی نظر آتی ہیں۔

"منصور کی آنکھیں بیدار رہا کرتی تھیں۔ وہ اپنے عمال کی طرف سے بے فکر غفلت کی نیند نہیں سوتا تھا، برا یا بھلا جو کام بھی وہ کرتے، اس کی اسے خبر رہتی۔ ایک مرتبہ حامل البرید نے اسے اطلاع دی کہ حضرموت کا والی کثرت سے شکار کو جاتا ہے۔ اس پر منصور نے والی کو لکھا:

"تمہاری ماں تم کو روئے اور تمہارا خاندان تم سے ہاتھ دھو بیٹھے جنگلی جانوروں کو زخمی کرنے کے لیے یہ کیا انتظامات تم نے کر رکھے ہیں، میں نے تو مسلمانوں کی ذمے داریاں تمہارے سپرد کی تھیں، جنگلی جانوروں کی قسمتوں کا مالک تمہیں نہیں بنایا تھا، اپنے عہدہ کا چارج فلاں شخص کو دے دو، اور مطعون اور راندۂ درگاہ اپنے گھر واپس آجاؤ!"[۳۲]

سربراہِ مملکت کے شرائط استحقاق پر ماوردی کا تبصرہ:

ماوردی نے امام، خلیفہ، یا سربراہِ مملکت کے شرائط استحقاق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"امامت کی اہلیت کے لیے ان سات شرطوں کا ہونا ضروری سمجھا گیا ہے:-

۱- حق پژوہی (اپنی تمام شرطوں کے ساتھ)

۲- علم۔ (امام ایسا عالم ہو کہ وہ عام حالات اور غیر معمولی واقعات کے وقت اجتہاد کر سکے)۔

۳- صحت، حواس و نطق۔

۴- صحت اعضاء تاکہ وہ اسے حرکت سے نہ روکے، اور بہ آسانی اٹھنے، بیٹھنے میں حارج نہ ہو۔

۵- عقل و فراست (جو رعیت کی نگہبانی اور مصالح ملکی کے روبکار لانے میں معین ہو)۔

۶- شجاعت و دلیری (جس سے ملک کی حفاظت اور دشمن سے جہاد کیا جائے)

۷- نسب، (یعنی امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ قریش سے ہو، کیونکہ اس

بارے میں نص موجود ہے، دوسرے یہ کہ اس پر اجماع امت ہو چکا ہے"۔[۳۳]
یہ آخری شرط یعنی شرط قرشیت درست نہیں ہے، اس پر ہم نے ایک مستقل باب قائم کر کے مفصل گفتگو کی ہے!

ماخذ:

۱ھ صحیح بخاری، باب مناقب اصحاب النبی ؐ ۲ھ صحیح مسلم "کتاب الطلاق"، صحیح بخاری "کتاب العلم"
۳ھ سورۂ احزاب، پارہ آیت ۴ھ صحیح نسائی "کتاب النکاح"
۵ھ صحیح بخاری عن عمرؓ ۶ھ صحیح بخاری عن عائشہ رضؓ
۷ھ زاد المعاد، ج ۲، (ابن قیم) ص ۱۲۵، ۳۴؛ ۱۴۷
۸ھ تاریخ عرب (سدیو)، شائع کردہ الناظر پریس لکھنؤ ص ۴۲۔
۹ھ کیمیائے سعادت (امام غزالی) ص ۲۷۹ ۱۰ھ حجۃ اللہ البالغہ (شاہ ولی اللہ) ص ۳۸۴
۱۱ھ صحیح بخاری و دیگر کتب صحاح ۱۲ھ زاد المعاد، ج ۲، ص ۲۲۳، ۳۲۴
۱۳ھ صحیح نسائی۔عن ثوبانؓ ۱۴ھ ترمذی (شمائل نبیؐ) عن ابی ہریرۃؓ
۱۵ھ کتاب الشفاء (قاضی عیاض) ص ۶۳ ۱۶ھ مسند امام حنبلؒ، ج ۴، ص ۴۹۔
۱۷ھ صحیح بخاری عن ابی ہریرہؓ، نیز مسلم عن ابی سعید خدریؓ ۱۸ھ طبری ج ۲، ص ۵۔
۱۹ھ سیاستِ شرعیہ (علامہ عبد الوہاب خلاف) طبع مصر، ص ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۸۸،
۲۰ھ تاریخ الخلفاء (سیوطی) ص ۱۲۷۔
۲۱ھ طبری، ج ۴، ص ۲۴۹ و شرح نہج البلاغۃ (طبع مصر) ص ۱۲۳۔
۲۲ھ کتاب الخراج (امام ابو یوسفؒ) ص ۶۶، ۲۳ھ کنز العمال، ج ۶، ص ۳۴۳، ۳۵۰،
۲۴ھ نہج البلاغۃ (طبع مصر) ص ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۶۰،
۲۵ھ مروج الذہب (مسعودی) ج ۳، ص ۹۲۹، ۹۳۰، نیز ۹۶۰،

۲۶ کامل ابن اثیر ج ۵، ص ۱۵۹،
۲۷ نہج البلاغۃ (طبع مصر) ص ۱۱۴۹-۱۱۵۰ء
۲۸ طبری، ص ۲۲۴۸-
۲۹ الاحکام السلطانیہ، ص ۱۷
۳۰ الاحکام السلطانیہ، ص ۱۳۱، نیز السیاسۃ الشرعیہ (علامہ عبدالوہاب خلاف) (طبع مصر) ص ۵۴-
۳۱ الاحکام السلطانیہ، ص ۱۳۲
۳۲ طبری، ج ۹، ص ۳۱۱- مروج الذہب (مسعودی) ج ۲، ص ۲۲۳
۳۳ الاحکام السلطانیہ، ص ۱۳-

(۷)

بنیادی حقوق

دنیا کی ہر جمہوریت کی گراں بہا پونجی وہ ہے جسے بنیادی حقوق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

لیکن یہ مایۂ فخر و ناز "بنیادی حقوق" تحفے کے طور پر نہیں دیے گئے تھے انھیں حاصل کرنے میں خون کی ندیاں بہ گئی تھیں اور بہتی رہی تھیں، کشت و خون ہوا تھا، اور ہوتا رہا تھا، خانہ جنگی برپا ہوئی تھی اور ایک طویل مدت تک اس کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا۔ باپ نے بیٹے کو قتل کیا، عمارتیں جلائی گئیں، اور جل کر خاکستر ہو گئیں۔ امن و امان درہم برہم ہوا۔ عافیت نے کنارہ کشی اختیار کر لی، انارکی اور طوائف الملوکی کا سلسلہ شروع ہو گیا، تب جا کر کہیں یہ گلِ سر سبد حاصل ہوا۔

یہ بھی یاد رہے "بنیادی حقوق" عہد مظلمہ کی پیداوار نہیں ہیں۔ اس دور کے گزر چکنے کے بعد ہی جمہوریت وجود میں آئی، اور رفتہ رفتہ بنیادی حقوق نے بھی ایک خاص وضع و ہیئت اختیار کر لی، عرصہ دراز تک ان کی نوک پلک درست ہوتی رہی، اور اب جا کر انھوں نے ایک معین اور متعین صورت اختیار کی ہے۔ اور اس کے باوجود "ہنگامی حالات" کی صورت میں یہ معطل ہوتے رہتے ہیں، اور اسے جمہوریت کی نفی نہیں سمجھا جاتا، عین جمہوریت قرار دیا جاتا ہے۔

اسلام کے شاندار روایات: لیکن اسلام نے "عہدِ مظلمہ"

میں پوری دریادلی کے ساتھ بنیادی حقوق عطا کر دیے تھے، اور داعیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام، نیز خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور بہت سے دوسرے مسلمان فرماں رواؤں نے ان پر عمل درآمد کرکے بھی دکھایا تھا۔ یہ سب چیزیں احترام آدمیت سے تعلق رکھتی ہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سلسلے میں اسلام نے ایسے شاندار روایات قائم کیے ہیں۔ جن کی مثال نہیں مل سکتی۔

بنیادی حقوق جو کچھ اور جتنے کچھ بھی متعین کیے گئے ہیں اور بہرحال درست ہیں۔ لیکن ہم امکانی حد تک انھیں زیادہ سے زیادہ وسعت دے کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسلامی جمہوریت کے اندر ان کی نوعیت کیا ہے اور ان کا نفاذ کس طرح ہوتا رہا ہے؟

بنیادی حقوق کا لب لباب: بنیادی حقوق کی پوری فہرست سامنے رکھ لیجیے، اس فہرست کا لب لباب جس چیز میں پوشیدہ ہے، وہ ہے مساوات!

اگر حقیقی معنیٰ میں کوئی حکومت اپنے باشندوں کو مساوات عطا کرتی ہے تو بلاشبہ وہ فلاحی مملکت بھی ہے، اور کامیاب ترین حکومت بھی، یہ دوسری بات ہے کہ اب تک دنیا کی پہلی اسلامی جمہوریہ کے سوا کوئی دوسری مملکت اور حکومت اس معیار پر پوری نہیں اتر سکی۔

آزادیٔ عامہ: ہم جملہ بنیادی حقوق پر اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ گفتگو کی کوشش کریں گے لیکن سب سے پہلے آزادیٔ عامہ کو، اور اس کے بعد مساوات کو زیر بحث لائیں گے، بعد ازاں دوسرے حقوق پر گفتگو ہوگی۔

پردۂ عالم پر نمودار ہوتے ہی اسلام نے وہ تمام بوجھل بیڑیاں کاٹ کر پھینک دیں، جو مذہب یا حکومت کے نام پر انسان کے پاؤں میں ڈالی گئی تھیں چنانچہ کلام مجید میں اللہ تعالیٰ رسول اکرم کے بارے میں فرماتا ہے:

ویضع اصرھم والاغلال التی ‍ ‍ ‍ یعنی وہ نبی اُمّی لوگوں کی گردن پر سے (غلامی کا)

کانت علیھم[۱] بوجھ اور طوق الگ کر دیتا ہے[۱]

اور اس کی تعلیم یہ اور صرف یہ ہے:

ان الحکم الا للہ یعنی حکمران تو صرف خدا ہے[۲]

گویا اسلام کا کام ہی یہ تھا کہ لوگوں کے پاؤں میں دیر و کلیسا اور قیصر و سلطان کی غلامی اور عبودیت مطلقہ کی جو بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں، انھیں کاٹ کر پھینک دے، اور خدائے واحد کے آستانہ کبریائی پہ لا کر کھڑا کر دے، اور اس آستانے پر سر جھکانے کے بعد وہ سب کچھ ماننا پڑے گا، جس کا اسلام حکم دیتا ہے اور وہ سب کچھ چھوڑ دینا پڑے گا جس سے اسلام منع کرتا ہے۔ آزادی عامہ کا یہ کتنا روشن پہلو ہے۔

نیز ارشاد ہوتا ہے:

ضرب اللہ مثلاً عبداً مملوکاً لا یقدر علیٰ شیء ومن رزقناہ منا رزقاً حسناً فھو ینفق منہ سراً و جھراً، ھل یستون[۱]

یعنی اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک غلام ہے۔ مملوک کہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا، اور ایک دوسرا شخص ہے جسے ہم نے اچھی روزی دی ہے، اس میں سے وہ پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے، کیا یہ دونوں اس طرح کے آدمی برابر ہو سکتے ہیں؟[۳]

کیا اس سے بڑھ کر بھی آزادی عامہ کا کوئی پروانہ ہو سکتا ہے؟ اب بنیادی حقوق کو لیجیے:۔

حریت ذات اور مساوات بین الافراد: اگر غور کیجیے تو جمیع حقوق انسانی دو چیزوں پر مبنی ہیں:

۱۔ حریت شخصی، یعنی ذاتی آزادی

۲۔ مساوات بین الافراد یعنی افراد قوم کے مابین مکمل مساوات، مساوات سے کیا مراد ہے؟

حقوق مدنی اور سیاسی میں بالکل یکسانیت، مساوات اور برابری؛ نہ کسی کے ساتھ رعایت، نہ کسی پر ظلم[۴۷]

علامہ خلاف کی یہ تعیین اگر غور کیا جائے تو بالکل درست اور صحیح نظر آئے گی۔ دیکھنا چاہیے، مساوات بین الافراد یعنی افرادِ قوم کے مابین مکمل مساوات سے متعلق اسلام کا اصول کیا ہے؟ اور یہ اصول اسلامی جمہوریہ میں سکہ رائج الوقت کبھی بن سکا یا نہیں؟

سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ مساوات فی نفسہ ہے کیا؟

ظاہر ہے مساوات کے معنی یہ تو نہیں ہو سکتے کہ نیک اور بد، شریف اور رذیل، باکردار اور بے کردار، پاک نہاد اور عصیاں شعار، سب ایک ہی صف میں کھڑے نظر آئیں۔ مساوات کا مفہوم یہ اور صرف یہ ہے کہ سماجی، قانونی اور اخلاقی طور پر ہر فرد کو بغیر امتیازِ رنگ و نسل اور بلا تفریقِ دین و مذہب، یکساں اور مساوی حقوق حاصل ہوں، کوئی فرد، اس لئے ممتاز نہ مانا جائے کہ وہ اکثریت کا، یا حکمران اور فاتح کا ہم مذہب ہے، کسی کو اس لیے حقیر اور کم مایہ نہ قرار دیا جائے کہ اقلیت یا محکوم طبقے کا ایک فرد ہے، قاتل کو ہر حالت میں پھانسی پر لٹکنا چاہیے، خواہ وہ کسی مذہب اور قوم سے تعلق رکھتا ہو، مجرم کو ہر حالت میں سزا ملنی چاہیے، خواہ اس کا دین اور مذہب کچھ ہی ہو، اور اسے دفاع کا پورا حق بھی ملنا چاہیے، ذہانت، قابلیت، اہلیت اور استعداد کی ہر حالت میں قدر ہونی چاہیے۔ خواہ اس کا تعلق کسی فرقے، کسی قوم، کسی مذہب سے کیوں نہ ہو، ترقی کے مواقع سب کو یکساں طور پر حاصل ہونے چاہئیں، اور اس راستے میں دین و مذہب اور قوم و ملت کا سوال ہرگز نہیں پیدا ہونا چاہیے۔

سیکولرازم؛ قول اور عمل: جہاں تک افراد و اعتراف کا تعلق ہے "ہر جمہوریت"، نظری طور پر مساوات کو تسلیم کرتی ہے، بلکہ وہ جمہوریتیں جو اپنی انتہا پسندی کے باعث "سیکولر" ہونے پر فخر کرتی ہیں، اس باب میں بہ طور خاص اپنے

آپ کو فراخ حوصلہ اور فراخ دل منوانے کی کوشش کرتی ہیں؟

لیکن عمل کیا ہے؟

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ کسی جمہوریت میں بھی، خواہ وہ سیکولر ہو یا نہ ہو، اعلیٰ ترین مناصب اور کلیدی عہدے صرف اکثریت یا حکمران قوم ہی کو حاصل ہوتے ہیں اور اقلیت یا محکوم قوم، ہر طرح کی قابلیت اور اہلیت کے باوجود محروم رہ جاتی ہے۔

فکری، ذہنی، مالی اور عملی اعتبار سے آج یہودیوں کا دنیا میں کون ہمسر ہے؟ کتنے بڑے بڑے ملک ہیں جو ان کے اشارہ چشم پر اپنی پالیسی میں تبدیل کر لینے کے خوگر ہیں لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ انگلستان کا، یا فرانس کا، یا جرمنی وغیرہ کا وزیر اعظم یا امریکہ کا صدر کوئی یہودی منتخب ہو جائے؟

ہمارا پڑوسی ملک بھی سیکولرازم پر نازاں ہے، اور جب تک وہ آزاد نہیں ہوا تھا، اس نے مسلمان اکابر کی شخصیت سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا لیکن اب تک کہ بیس سال کی مدت گذر چکی ہے کیا وہاں کا وزیر اعظم کوئی مسلمان ہو سکا؟ کسی صوبے کا وزیر اعلیٰ کوئی مسلمان بنایا گیا؟ آزادی سے پہلے ہر دوسرے تیسرے سال کانگرس کا صدر کوئی مسلمان منتخب ہوتا رہتا تھا، لیکن تقریباً ربع صدی کی اس مدت میں کوئی مسلمان اس عہدے پر فائز ہوا؟

کیا آئندہ بھی اس کا کوئی امکان ہے؟

یقیناً یہ مستبعد ترین چیز ہے جس کا تصور کیا جا سکتا ہے؟

پھر یہ کیسی مساوات ہے جس کی مدح و تحسین کا بازار گرم ہے؟ اگر مساوات یہ ہے تو عدم مساوات کو کیا کہیں گے؟

اصل بات یہ ہے کہ نہ فاتح اپنے حقوق بالادستی سے دستبردار ہونے پر رضامند کیا جا سکتا ہے، نہ اکثریت، اپنی قوت و اقتدار کا زعم فراموش کر سکتی ہے یہ اس کی توہین ہے کہ اس کا وزیر اعظم، یا وزیر اعلیٰ، یا اس کی سب سے بڑی سیاسی جماعت

کا سربراہ کوئی ایسا فرد منتخب ہو جائے جو اس میں سے نہ ہو۔

اربابِ اقتدار کو استثناء کا حق: یہ تو ہوا، فلسفہ دوئی، لیکن ذرا ایک نظر خود اپنے میں سے جو غیر مساویانہ نظام ابھرتا ہے اس پر ڈال لیجیے۔

کیا کسی جمہوریہ کے سربراہِ مملکت یا حکومت کے گورنر کو عدالت میں طلب کیا جا سکتا ہے؟ اس سے بیان حلفی لیا جا سکتا ہے؟ اس کے خلاف کارروائی کی جا سکتی ہے؟ اسے سزا دی جا سکتی ہے؟ — یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے منصب سے رضاکارانہ طور پر دستبردار نہ ہو جائے، یا اسے الگ نہ کر دیا جائے، اس لیے کہ دابِ حکومت کا تقاضا یہی ہے۔

کیا کوئی بڑا سرکاری ملازم، خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرم کا ملزم کیوں نہ قرار دیا گیا ہو، حکومت کی پیشگی اجازت کے بغیر گرفتار کیا جا سکتا ہے؟ یا اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے؟ یہ دونوں سوال بڑے اہم ہیں، لیکن ان کا جواب نفی میں ہے۔

نفی میں جواب دوسروں کے ہاں ہے، اسلام میں نہیں!

اسلامی جمہوریت میں، قانون سب کے لیے یکساں ہے، خواہ وہ کوئی بھی ہو اس میں ادنیٰ اور اعلیٰ، امیر اور غریب، سلطان و گدا، سرمایہ دار اور مزدور، عالم اور جاہل کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔

اسی طرح جملہ انسانی حقوق میں بھی سب برابر ہیں۔ مرد و زن، مردِ کہن سال اور جوانِ رعنا کے مابین کسی طرح کا تفاوت نہیں، سب ایک ہیں، سب یکساں ہیں۔

اسلامی مساوات کی اساس: اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے استاذ سیّد قطب نے فرمایا ہے۔ اور بڑے دل نشین انداز میں فرمایا ہے:

"اسلامی مساوات جس اساس پر قائم ہے، وہ خالص انسانی ہے، یہ مساوات ہر طرح کے تعصّب، انتہا یہ کہ مذہبی تعصب سے بھی ماورا ہے۔

مثلاً قتل کا معاملہ لیجیے، اسلام نے مشرکوں کو بھی وہی حقوق دیئے ہیں۔

جو مسلمانوں کو حاصل ہیں، بشرطیکہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان معاہدۂ صلح ہو، جنگ کی صورت نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ومن قتل مؤمنا خطأ فتحرير رقبة مؤمنة ودية مسلمة الى اهله الا ان يصدقوا فان كان من قوم عدو لكم وهو مومن فتحرير رقبة مومنة وان كان من قوم بينكم وبينهم ميثاق فدية مسلمة الى اهله وتحرير رقبة مومنة۔

یعنی، جو شخص کسی مومن کو غلطی (قتل غیر عمد) سے قتل کر دے، تو اس پر ایک مسلمان غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا، اور خون بہا ہے جو اس کے اہل خاندان کے حوالے کر دیا جائے، بجز اس صورت کے کہ وہ معاف کر دیں اور اگر وہ ایسی قوم ہو جس کے لوگ تمہارے مخالف ہیں اور وہ شخص خود مومن ہے تو ایک مسلمان غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا ہے اور اگر وہ ایسی قوم سے ہو کہ تم میں اور اس میں معاہدۂ صلح ہے تو خوں بہا ہے جو اس کے اہل خاندان کے حوالے کر دیا جائے، نیز ایک مسلمان غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا[۵]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن مشرکوں سے معاہدہ ہو، ان کے مقتول کا کفارہ بالکل وہی ہوگا، جو مسلمان مقتول کا ہے — قطعاً یکساں۔

اس مقام پر یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اسلام نے قتل غیر عمد کا کفارہ ایک غلام کو آزاد کرنا رکھا ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ غلام کو آزاد کرنا ایک انسان کو زندہ کر دینے کے مترادف ہے۔

رہ گیا قتل عمد یا قطع اعضاء کا مسئلہ، سو ایسی صورت میں "النفس بالنفس" کا قرآنی حکم جاری ہوگا، اور اس باب میں قطعاً کسی کے ساتھ، اس کی حیثیت یا مرتبے کو پیش نظر رکھ کر کوئی رعایت نہیں کی جائے گی، عام اس سے کہ وہ دولت مند ہو، یا مفلوک الحال، آقا ہو، یا غلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"اگر کسی نے اپنے غلام کو قتل کیا، ہم بھی اسے قتل کر دیں گے۔ اگر غلام

کی ناک قطع کرے گا، ہم اس کی ناک کاٹ لیں گے، اگر اسے آختہ کرے گا، ہم بھی اسے آختہ کر دیں گے[۵۶]!"

کیا اب یہ بات واضح اور روشن نہیں کہ اسلام مذہب و قبیلہ اور نسل و اعتقاد، ہر قسم کے تعصب سے مبرا ہے، اور ایسے مقام بلند پر فائز ہے کہ مغربی تہذیب کے لیے اس بلندی کو چھو لینا ممکن نہیں، جدید تہذیب کی دنیا میں نشو و نما پانے والا امریکہ اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا کہ ریڈ انڈین نسل کو فنا کر دینے کی منظم کوشش کھلے بندوں کرے۔ اسی طرح جنوبی افریقہ میں ایسے قوانین بلا جھجک وضع کیے جا سکتے ہیں جو نسلی امتیاز پر مبنی ہیں[۵۷]!

غیر مسلموں کے ساتھ عدل و انصاف کی تاکید: اسلام اسلامی مساوات کا علمبردار نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ انسانی مساوات کا داعی اور نقیب ہے، وہ تو غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک اور عدل و قسط کی تاکید فرماتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم، ان اللہ یحب المقسطین۔

یعنی اللہ تعالیٰ تمھیں ان لوگوں (غیر مسلموں) کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں فرماتا، جنھوں نے دین کے بارے میں تم سے مقاتلہ نہیں کیا، اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا، بلاشک اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے[۵۸]!

اس سے بڑھ کر انسانی مساوات اور کیا ہو سکتی ہے؟

دنیا میں جو نظام رائج ہے، اس کی رو سے عدل و مساوات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اپنوں کے ساتھ دوسرے غیروں کے ساتھ۔ اپنوں کے ساتھ کامل عدل اور مکمل مساوات، غیروں کے ساتھ صرف ایسا عدل اور ایسی مساوات جو زیب قرطاس ہے عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

لیکن اسلام اس دو رخی کو پسند نہیں کرتا، وہ دینی اور قومی یا بدرجۂ آخر ملکی

مساوات کے بجائے خالص انسانی مساوات کا علمبردار ہے، قول سے بھی اور عمل سے بھی، اور اس میں وہ اس درجہ بے لچک ہے کہ مسلمانوں کے دل میں یہ بات کچھ اس طرح راسخ ہوگئی ہے کہ انھوں نے اپنوں کے گلے تو خوب کاٹے، اور اپنوں کا خون بے دریغ بہایا، لیکن غیر مسلموں کے ساتھ کبھی موجب شکایت روش نہیں اختیار کی۔ مجھے نہیں یاد کہ تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا ہو کہ حجاج بن یوسف کے بارے میں بھی ثابت کیا جاسکے کہ اس نے غیر مسلموں کو عدل وانصاف سے کبھی محروم رکھا ہو۔

آں حضرتؐ اور انسانی مساوات: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی مساوات کو ہمیشہ ملحوظ رکھا، چنانچہ ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

"لا فضل العربی علی عجمی الا بالتقویٰ"	یعنی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے البتہ تقویٰ ضرور مابہ الامتیاز ہے۔

یہ بھی ارشادِ رسولؐ ہے جو آپؐ نے بنی ہاشم کو مخاطب کرکے فرمایا تھا:

"یا بنی ھاشم یجیئنی الناس بالاعمال وتجیئونی بالانساب ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم"	"اے بنی ہاشم! لوگ میرے پاس اپنے اعمال لے کر آتے ہیں، اور تم حسب نسب لے کر میرے پاس آتے ہو، خدا کے نزدیک معزز وہی ہے جو متقی ہے۔"

متعدد نصوص میں مساوات پر زور دیا گیا ہے اور واضح الفاظ میں اسے تسلیم کیا گیا ہے اور شعائرِ ایمان میں شمار کیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد خداوندی ہے کہ:

"انما المومنون اخوۃ"	یعنی مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"اخوانکم خدمکم"	یعنی تمھارے خادم تمھارے بھائی ہیں

یہ بھی ارشاد رسولؐ ہے کہ:

"الناس سواء کاسنان المشط لافضل لاحمر علی اسود ولا العربی علی عجمی" یعنی لوگ کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہیں۔ گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔

غرض احکام اسلامی کا مطالعہ کیجیے۔ یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ان میں مساوات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور امت کے مختلف طبقات کے مابین کسی طرح امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے۔

حج میں ہر مسلمان بلا تمیز و تفریق مجبور ہے کہ ایک لباس پہنے، سر کھلا رکھے۔ اور سلا ہوا کپڑا نہ پہنے۔

نماز میں ہر مسلمان صف باندھنے اور کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑا ہونے پر مجبور ہے۔ سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے خواہ وہ فقیر بے نوا ہو، یا سلطانِ اورنگ نشین۔

تعزیر میں مساوات: جنایات و جرائم میں، صاف قانون موجود ہے کہ:

"النفس بالنفس والعین بالعین والجروح قصاص" جان کے بدلے میں جان، آنکھ کے بدلے میں آنکھ، نیز خاص زخموں کا بھی (یکساں) بدلہ ہے۔

ہر شخص کو پوری پوری سزا دی جائے گی، ہر شخص سے پورا پورا بدلہ لیا جائے گا۔ خواہ وہ کوئی ہو۔ اس میں کبھی کسی کے ساتھ رعایت ہے نہ تخصیص۔۔۔!

اسلام کے احکام میں سب لوگ برابر قرار دیئے گئے ہیں، کوئی حکم بھی ایسا نہیں ہے جس میں کسی کے لیے تخصیص ہو، تمام قوانین میں تمام افرادِ امت برابر ہیں۔

انسانی مساوات کا روح پرور مرقع: صدر اسلام میں یہ مساوات حالت جنگ اور حالت امن، ہر حالت میں مسلمانوں کا عام شعار تھا، اس نعمت سے صرف مسلمان ہی بہرہ اندوز نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ ذمی اور معاہد بھی پوری طرح اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

"لهم ما لنا و علیهم ما لنا"

یہ بھی ارشادِ رسولؐ ہی تھا کہ:

"من اذیٰ ذمیا فانا خصمہ یوم القیامۃ" جس نے کسی ذمی کو ایذا دی تو قیامت کے دن میں اس کا مدعی ہوں گا۔

ذیل کا واقعہ انسانی مساوات کا کتنا روح پرور مرقع ہے:

غسان کے فرماں روا جبلہ بن ایہم نے اسلام قبول کر لیا، طوافِ کعبہ کے وقت اس کی چادر کا ایک گوشہ کسی بدو کے پاؤں کے نیچے آگیا، جبلہ نے اس کے منہ پہ ایک طمانچہ مارا، بدو نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا، جبلہ نے عمرؓ سے شکایت کی۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "تم نے جیسا کیا ویسا پایا"

جبلہ نے کہا: "ہم وہ ہیں کہ اگر ہم سے کوئی گستاخی کرے تو اس کی سزا قتل ہے"!

حضرت عمرؓ نے جواب دیا:- "ہاں! عہدِ جاہلیت میں ایسا ہی تھا - لیکن اسلام نے پست و بالا کو ایک کر دیا ہے"[١٠٩]!

مساواتِ انسانی اسی وقت بروئے کار لائی جا سکتی ہے، جب صحیح معنیٰ میں مساوات باہمی قائم ہو چکی ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"تم میں سے کسی شخص کا ایمان اس وقت تک قابلِ اعتبار نہیں، جب تک جو کچھ وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھی پسند نہ کرے"[١١٠]

یہ واقعہ بھی کتنا فکر آفرین ہے:

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ہم سب نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔

ایک اعرابی نے جو نماز میں شامل تھا، کہا: "اے اللہ! مجھ پہ اور محمدؐ پہ رحم

فرما، اور ہمارے ساتھ کسی دوسرے پر رحم نہ کر۔"

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو اعرابی سے فرمایا:۔

"تو نے خدا کی رحمت کو تنگ کر دیا[1]!"

آزادی رائے : بنیادی حقوق میں آزادیٔ رائے بھی شامل ہے۔ حریت رائے کے معاملے میں اسلام نے دو پہلو اختیار کیے ہیں، جس میں حریت رائے مطلوب ہے، آیا وہ امر دینی ہے یا غیر دینی؟

اگر معاملہ غیر دینی ہے تو ہر فرد کو پوری آزادی حاصل ہے کہ جو رائے مناسب سمجھے قائم کرے اور اسے جس طریقے سے چاہے بروئے کار لائے، تلاش و تفحص کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ حدود اسلام میں اور اس کے بعد بھی ایسے متعدد واقعات پیش آئے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے حریت رائے کا کس درجہ احترام کیا ہے اور کہاں تک آزادی بخشی ہے؟

مثلاً خود سرکارِ رسالتؐ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک غزوہ میں آپؐ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ فلاں فلاں جگہ پر اتریں۔ ایک صحابیؓ نے آپؐ سے سوال کیا، کیا یہ وہ منزل ہے جس کے بارے میں آپؐ کو اللہ نے وحی بھیجی ہے یا صرف آپؐ کی رائے ہے؟

آپؐ نے فرمایا: "یہ میری ذاتی رائے ہے"!

صحابیؓ نے عرض کیا: "تو یہ منزل مناسب نہیں۔ اس کے بجائے فلاں منزل مناسب ہوگی، چنانچہ اسی رائے پر عمل کیا گیا۔

اسی طرح حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا اختلاف ہے، جو جنگی قیدیوں کے بارے میں تھا، حضرت عمرؓ کی رائے تھی، انھیں قتل کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ کہتے تھے، فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ ایسا ہی صحابہؓ کا اختلاف ہے جو خلافت اور دوسرے معاملات میں رونما ہوا۔

اسلام میں اجتہاد اور قیاس کی اہمیت : اگر معاملہ دینی ہے تو ہر

شخص کو اجتہاد کا اذن عام ہے، اسے حق ہے کہ وہ رائے ظاہر کرے جس کی طرف اس کا اعتقاد رہنمائی کر رہا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اجتہاد نص سے متصادم نہ ہو اور رائے اصول دین سے متجاوز نہ ہو، اور ان قوانین کلیہ و نصوص صحیحہ سے بھی مخالف نہ ہو، جو ثابت ہیں۔

چنانچہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام نے "قیاس" کو اپنے اہم ترین اصولوں میں سے ایک اہم رکن قرار دیا ہے، بلکہ غور کیجیے تو مصادر تشریع میں سے ایک مصدر یہ بھی ہے کہ جو احکام منصوص نہ ہوں ان سے استنباط کے لیے ایک نظیر سے دوسری نظیر پیدا کر لینا، ایک واقعہ پر دوسرے واقعہ کو ڈھال لینا ایک مشابہت سے دوسری مشابہت بنا لینا، یہی اسلامی اصطلاح میں "قیاس" ہے۔ قیاس کے سلسلے میں الحاق اور استنباط کے لیے اسلام نے بڑا وسیع میدان کھلا چھوڑ دیا ہے اور رائے و نظر کو بھی پوری پوری آزادی مرحمت فرمائی۔

سنتِ رسول ﷺ سے بھی ان حقایق کی تائید ہوتی ہے فرمایا:

"ان کل مجتھد ما جور ان اخطأ فلہ اجر وان اصاب فلہ اجران" — یعنی ہر مجتہد کو اجر ملتا ہے، اگر اس نے اجتہاد میں چوک کی تو اسے ایک اجر ملے گا، اور اگر صحیح اجتہاد کیا تو دو اجر ملیں گے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ اجتہاد کبھی کبھی غلط ہی کیوں نہ ہو لیکن ہے باعثِ اجر۔ یہ بات اس کا ثبوت ہے کہ اسلام میں رائے اور قیاس کو کتنی اہمیت دی گئی ہے[۱۳]۔

آزادیٔ رائے کی چند مثالیں: آزادیٔ رائے کے سلسلے میں امثلہ ذیل بھی غور طلب ہیں۔ جو حریت ضمیر کی ترجمان ہیں، اور خوف و اندیشہ سے بے نیاز:

ابن السماک نے ایک مرتبہ ہارون الرشید سے کہا:

"یا امیر المومنین! جب آپ مر جائیں گے اور تنہا حساب کتاب (خدا کے سامنے)

دیں گے تو بھی ایسے ہی ہوں گے"؟

شبیب بن شیبہ نے خلیفہ منصور کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

"امیرالمومنین! خدا سے ڈریے، اپنے عمال کو اپنی آخرت برباد کر کے نہ نوازیے"؟

زیاد بن مالک انس سے روایت کرتے ہیں کہ خلیفہ ابو جعفر منصور نے ایک روز مجھے اور ابن طاؤس کو بلا بھیجا، ہم دونوں حاضر ہوئے، وہ مسند پر متمکن تھا، سامنے نطع[1] رکھا تھا، اور پاس ہی جلاد تلوار ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔

خلیفہ نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا، ہم بیٹھ گئے، کچھ دیر تک وہ سر جھکائے بیٹھا رہا، پھر سر اٹھایا، اور ابن طاؤس سے کہا:

"اپنے والد سے روایت کردہ کوئی حدیث سناؤ!"

طاؤس نے کہا: میرے والد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب اس شخص پر ہو گا جو شرک کا ارتکاب کرتا رہا ہو۔ اور ظلم و جور سے کام لیتا رہا ہو!

کچھ دیر ابو جعفر خاموش رہا، مالک کا بیان ہے، میں نے اپنا دامن سمیٹ لیا کہ اب ابن طاؤس کی گردن اڑا دی جائے گی اور خون کے چھینٹے مجھ پر پڑیں گے۔

پھر ابو جعفر نے کہا: "ابن طاؤس ذرا یہ دوات تو ادھر بڑھانا!"

مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے، اس نے کہا:

"آخر یہ دوات اٹھا کر مجھے کیوں نہیں دیتے؟"

ابن طاؤس نے کہا: "مجھے اندیشہ ہے، آپ کوئی ایسی بات نہ لکھ دیں جو معصیت ہو اور اس طرح میں بھی اس میں شریک بن جاؤں"۔

جعفر نے کہا: "تم دونوں چلے جاؤ یہاں سے!"

"ہم چاہتے بھی یہی تھے"، چلے آئے۔

مالک کا بیان ہے: اس دن سے طاؤس کی عظمت میرے دل میں نقش ہو گئی!
ابن سماک ہارون رشید کی طلب پر اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور فرمایا: "یا امیرالمومنین! اللہ نے آپ کو جو رتبہ دیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو خدا کی پسند ہو وہ بھی محبوب ہو، جو خدا کو ناپسند ہو وہ آپ کے لیے بھی مبغوض ہو — لیکن خدا کی قسم خدا جس گھر (جنت) کو پسند کرتا ہے آپ اسے ناپسند کرتے ہیں۔ اور خدا جس گھر (جہنم) کو ناپسند کرتا ہے، آپ اسے پسند کرتے ہیں۔

امیرالمومنین! یاد رکھیے۔ آج جو قوت اور حشمت آپ کے ہاتھ میں ہے اگر آپ کے پیش رو کے پاس باقی رہتی۔ تو آپ کے پاس نہ پہنچتی، اور جس طرح یہ دوسروں کے پاس باقی نہیں رہی۔ آپ کے قبضے میں بھی نہیں رہے گی، پس خدا سے ڈریے — !"

حجاج نے ایک سفر میں ایک شخص سے پوچھا،
"کیا تم محمد بن یوسف کو جانتے ہو"؟
وہ کہنے لگا، "ہاں! کیوں نہیں جانتا!"
حجاج نے کہا: "کچھ اس کے چال چلن کے بارے میں بتاؤ!"
اس نے کہا: "وہ تو بڑا ہی بد آدمی ہے، اللہ کی اور اس کے احکام کی سرتابی میں فرد!"
حجاج کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا پوچھا،
"کمبخت تجھے نہیں معلوم، وہ میرا بھائی ہے"؟
اس نے جواب دیا: "ہاں جانتا ہوں، کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ میرا رب ہے، اور خدا کی قسم وہ مجھے اس سے کہیں زیادہ محبوب و مطلوب ہے۔ جتنا تجھے تیرا بھائی!"

سفیان ثوری نے خلیفہ ابوجعفر منصور سے کہا۔

"میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں کہ اگر وہ سدھر جائے تو ساری اُمّت سدھر جائے گی!"

ابو جعفر منصور نے (اشتیاق کے ساتھ) سوال کیا،

"کون ہے وہ شخص؟"

سفیان ثوریؒ نے جواب دیا: "آپ!"

ایک مرتبہ ہارون رشید حج کے لیے گیا، دوران طواف عبداللہ عمری سے آمنا سامنا ہوا، عبداللہ عمری نے آواز دی۔

"اے ہارون!"

ہارون نے جواب دیا: "عمِ محترم، خاکسار حاضر ہے!"

عبداللہ عمری نے پوچھا: "بتا سکتے ہو، حج کے لیے یہ لوگ جو آتے ہیں. ان کی تعداد کیا ہے؟"

ہارون نے جواب دیا: "بے شمار، ان کی تعداد تو خدا ہی کو معلوم ہے!"

عبداللہ عمری نے کہا: "اے شخص! اس حقیقت کو نہ بھول کہ اس انبوہ خلائق میں سے ہر ایک خدا کے سامنے صرف اپنے لیے جواب دہ ہے اور تو ان سب کا جواب دہ! ذرا سوچ محاسبے کے وقت تجھ پر کیا گذرے گی!"

ہارون رونے لگا، اتنا رویا کہ کئی رومال آنسوؤں سے تر ہو گئے۔

ابن الکوا سے ایک مرتبہ منصور نے پوچھا۔

"بتاؤ تو سہی زمانے کی تعریف کیا ہے؟"

ابن الکوا نے جواب دیا: "زمانہ تو خود آپ ہیں، اگر آپ اچھے ہیں تو وہ بھی اچھا ہے۔ آپ بُرے ہیں تو وہ بھی بُرا ہے۔"

حجاج بن یوسف ثقفی نے قطری بن فجاءة کو گرفتار کر لیا، اور کہا:

"میں تجھے قتل کر کے رہوں گا!"

قطری نے پوچھا: "وہ کس لیے؟"

حجاج نے جواب دیا ۔ "اس لیے کہ تیرے بھائی نے میرے خلاف چڑھائی کی ہے ۔!"

قطری نے کہا : "میرے پاس امیرالمؤمنین کا مکتوب ہے کہ میرے بھائی کے جرم میں آپ مجھے ماخوذ نہ کریں!

حجاج نے کہا :۔ "کہاں ہے ۔ وہ خط ؟"

قطری نے جواب میں کہا : "میرے پاس تو اس سے بھی زیادہ واجب التعمیل خط ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی"

حجاج کو یہ جواب پسند آیا اور اس نے اسے رہا کر دیا۔[15]

حقوق شہریت : بنیادی حقوق کی ایک شق یہ بھی ہے کہ مملکت کے شہریوں کو بلا امتیاز حقوقِ شہریت دیے جائیں اور انھیں ترقی کے یکساں مواقع عطا کیے جائیں ۔

ابوالفرح یعقوب بن کلس کی وفات کے بعد خلیفہ عزیز باللہ نے عیسے نسطوریس مسیحی کو وزیر مالیات کے منصب پر فائز کیا۔[16]

حاکم بامر اللہ کے زمانے میں یہ شخص منصب وزارت پر فائز ہوا، اس سے پہلے کاتب کا منصب رکھتا تھا، اور رئیس کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا یہ شخص مسلمانوں کے لیے مصیبت اور عیسائیوں کے لیے رحمت ثابت ہوا ۔

خلیفہ حافظ کے عیسائی وزیر کا جب انتقال ہوا تو خلیفہ کو بہت صدمہ ہوا ۔ اس کے تابوت پر ریشم کی چادریں ڈالی گئیں ۔ اردگرد عیسائی لوبان اور عود کی دھونی دیتے ہوئے چل رہے تھے ۔ اعیانِ حکومت اور امرائے دولت نے جنازہ کی مشایعت کی ۔ خود خلیفہ بہ نفسِ نفیس ساتھ ساتھ چل رہا تھا ۔ اس کے پیچھے راہبوں اور قسیوں کی ایک جماعت انجیل کی تلاوت کرتی چلی آرہی تھی ۔ جب لاش قبر میں رکھی گئی تو خلیفہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔[17]

فاطمی خلفاء میں الحاکم تعصب میں بدنام ہے، لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس نے غیر مسلموں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حُسنِ سلوک کا برتاؤ کیا جس کا غیروں کو بھی اعتراف ہے۔ موسیو لیبان لکھتے ہیں:

"جو امور عام معاشرت سے متعلق تھے، مثلاً معاملات، جائداد اور وراثت وغیرہ وغیرہ ان کو عربوں (فاطمیوں) نے اس عمدگی سے رسم و رواج ملک کے مطابق ٹھہرا دیا تھا۔ کہ نارمن بھی بالالتزام انھیں قواعد کی پابندی کرتے رہے۔

عربوں کی حکومت میں عیسائیوں کو مذہب و رسم و رواج اور قانون کی پوری آزادی ملی۔ ایک راہب جو پلرمو کے کلیسا کا قسیس ہے۔ لکھتا ہے کہ پادریوں کو پوری آزادی تھی کہ وہ اپنا مذہبی لباس پہن کر بیماروں کو تسلّی دینے کے لیے جایا کریں۔

ایک دوسرا قسیس سوردکول بیان کرتا ہے کہ سینا میں عام رسومات مذہبی کے وقت دو جھنڈے کھڑے ہوتے تھے۔ ایک جھنڈا مسلمانوں کا اور دوسرا عیسائیوں کا، فتح کے وقت جتنے کلیسا موجود تھے قائم رکھے گئے تھے۔ البتہ اندلس کی طرح نئے کلیسے بنانے کی یہاں اجازت نہ تھی۔[18]

مسٹر اسکاٹ کا بیان: مسٹر اسکاٹ بیان کرتے ہیں:

"عرب جاہلیت کے قصائد اور نظمیں نہ صرف پلرمو (بلرم) میں بلکہ ہمسایہ شہر روم میں اسی قدیم شان اور لب و لہجہ میں پڑھی جاتی تھیں اور مسلمان اور غیر مسلمان دونوں تحسین و آفرین کرتے اور داد دیتے تھے۔[19]

جیساکہ معاہدۂ عمرانی میں روسو نے لکھا ہے:

"حکومت کی بنیاد اکثریت کا اس کے وجود اور قیام پر اتفاق ہے"۔!

اور یہ اتفاق اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب تک حکومت عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم نہ کرے۔ بنیادی حقوق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

اس وسیع دائرے کے تمام مقتضیات کا پورا کرنا حکومت کے فرائض، اور واجبات میں داخل ہے۔

ضروریاتِ زندگی کی ذمے داری: اسلامی جمہوریت نے اس پہلو کو بڑی شدت اور اہمیت سے پیش نظر رکھا ہے، اور اس سے ذرا بھی تغافل نہیں کیا ہے اسلامی نظریات کے ایک مفکر کا ارشاد ہے:

"ضروریاتِ زندگی کی فراہمی حکومت کا فرض ہے[۱۹ الف]!"

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صاحب جوامع الکلم تھے یعنی آپؐ کی گفتگو ایسی ہوتی تھی کہ بات مختصر ہوتی۔ لیکن اس کے اندر ایک جہانِ معنی پنہاں ہوتا تھا جتنا جتنا اس کی معنویت اور افادیت و اہمیت کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا جائے گا معلوم ہوگا جس پہلو کو مدنظر رکھیے وہ ہمہ پہلو ہے۔ کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اس میں نہ آگیا ہو، کوئی امر ایسا نہیں ہے۔ جو تشنہ رہ گیا ہو۔

ضروریاتِ زندگی کی فراہمی سے متعلق حکومت کے فرائض کا جہاں تک تعلق ہے، اس پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صرف چند بول ہیں جن سے تمام باتیں صاف ہو گئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اگر کوئی شخص مقروض ہو اور مر جائے اور کوئی مال باقی نہ چھوڑے، تو ہم اسے ادا کریں گے۔ اگر کوئی مال چھوڑ کر مرے تو وہ حق وارثوں کا ہے[۲۰]"

معلّی بن زیاد حسنؓ سے راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں ایک سائل آیا، فرمایا، بیٹھ جاؤ، اللہ دینے والا ہے۔ پھر دوسرا، اور پھر تیسرا آں حضرت صلعم نے سب سے بیٹھ جانے کو فرمایا، اس وقت آپؐ کے پاس کچھ نہ تھا کہ ان لوگوں کو عطا فرماتے، اسی اثناء میں ایک شخص آیا اور اس نے چار اوقیہ چاندی آپؐ کی خدمت میں پیش کی، آپؐ نے ایک ایک اوقیہ ان تینوں میں تقسیم فرما دی، ایک اوقیہ جو بچ رہی تھی اس کے لیے پوچھا، کون لینے والا ہے؟ مگر

کوئی نہ اُٹھا۔

رات ہوئی تو آپؐ نے وہ چاندی اپنے سرہانے رکھ لی؟

حضرت عائشہ رضؓ نے دیکھا کہ آپؐ استراحت نہیں فرماتے، بار بار اٹھتے ہیں اور نماز کی نیت باندھ لیتے ہیں، نماز پڑھ کر ذرا دیر استراحت فرماتے ہیں، پھر نماز پڑھنے لگتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضؓ نے دریافت کیا: "کچھ مزاج تو ناساز نہیں؟"

فرمایا "نہیں!"

حضرت عائشہ رضؓ نے پھر عرض کیا: "کیا خدا کا کوئی خاص حکم آیا ہے جو موجب اضطراب بن گیا ہے؟

فرمایا "نہیں!"

حضرت عائشہ رضؓ نے کہا: "پھر آپؐ استراحت کیوں نہیں فرماتے؟"

آپؐ نے وہ چاندی نکال کر دکھائی اور فرمایا۔

"یہ ہے وہ چیز جس نے مجھے وقف اضطراب کر رکھا ہے کہ مبادا یہ میرے پاس رہ جائے اور میرا بلاوا آجائے"[۲۱]

آزادئ فکر اور آزادی عقیدہ: بنیادی حقوق میں آزادئ فکر اور آزادئ عقیدہ بھی شامل ہے۔ اور یہ آزادی جس فراخ حوصلگی سے اسلام نے عطا کی ہے، اس کی مثال نہیں مل سکتی:۔

علامہ خلاف لکھتے ہیں:

"قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں، جن میں اکراہ و جبر کے ساتھ ایمان کی مذمت کی گئی ہے۔ مثلاً:

"لا اکراہ فی الدین ط قد تبین الرشد من الغی" | یعنی دین کے معاملے میں جبر و جور روا نہیں کہ ہدایت گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے[۲۲]

نیز دوسری جگہ قرآن پاک نے فرمایا:

"افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مومنین" یعنی کیا تم لوگوں کو مجبور کرنا چاہتے ہو کہ وہ مسلمان ہو جائیں؟"[۲۳]

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

"لکم دینکم ولی دین" یعنی تمھارے لیے تمھارا دین، اور میرے لیے میرا دین![۲۴]

پھر جبکہ اسلام میں اعتقاد کی بنیاد، غور و فکر اور آیات الٰہی پر فکر و تعمق ہے، نہ کہ محاکاۃ، نہ کہ تقلید، نہ کہ جبر و جور، تو اس سے بڑھ کر حریت اعتقاد اور کیا ہو سکتی ہے؟"

خلّاف پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:

"اسلام نے جہاں مسلمانوں کے لیے اقامتِ شعائر کی حفاظت و صیانت کے سلسلہ میں پابندیاں عائد کی ہیں۔ وہاں اس نے یہ بھی کیا ہے کہ غیر مسلموں کے لیے اس امر کی پوری آزادی تسلیم کر لی ہے کہ وہ اپنے شعائر دینی قائم کریں۔ غیر مسلموں کو اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے کہ وہ اپنے معاملات اور احوال شخصی میں دینی احکام کی پوری آزادی کے ساتھ پیروی کریں۔

اس رواداری اور اسلامی طرزِ عمل اور حریت اعتقاد کی بنیاد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے، جو آپؐ نے ذمیوں کے بارے میں فرمایا تھا:

"لھم ما علینا وعلیھم ما علینا۔" یعنی اگر ہم راحت میں ہیں تو وہ بھی آرام پائیں گے، اور اگر ہم دکھ میں ہیں تو وہ بھی دکھ جھیلیں گے۔"

"جتنے عہد نامے غیر مسلموں سے لیے گئے، ان میں جہاں ان کی حریت ذات و مال تسلیم کی گئی وہاں ان کے عقائد اور اقامتِ شعائر کی آزادی بھی مانی گئی ہے۔"[۲۵]

آزادیٔ ذات: بنیادی حقوق میں آزادیٔ ذات بھی شامل ہے، اور اسلام کا

جمہوریت میں یہ آزادی بھی پورے طور پر ملی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے :

"لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ" یعنی ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھا سکتا۔[۲۶]

چنانچہ علامہ ابن قیم رح فرماتے ہیں :

"یہ جائز نہیں کہ کسی کافر کے ظلم کی وجہ سے کسی دوسرے کافر کو پکڑ لیا جائے۔ یہ طریقہ اہلِ اسلام کے حق میں ناجائز ہے، اور یہ دونوں صورتیں ظلم کے مترادف ہوں گی"۔[۲۷]

درحقیقت :۔ "حریت ذات سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنے معاملات اور شخصی حالات میں بالکل آزاد ہو، نیز ان تمام امور میں بھی اسے آزادی حاصل ہو، جو اس کی ذات سے متعلق ہوں، غرض وہ اپنے نفس، اپنی آبرو، اپنے مال، اپنے مقام، اپنے تمام حقوق میں بالکل آزاد ہو، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ آزادی کسی دوسرے کی آزادی اور حقوق پر اثر انداز نہ ہوتی ہو۔

حریتِ شخصی کن آزادیوں سے عبارت ہے : اس تعریف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حریت شخصی چند قسم کی "آزادیوں" سے عبارت ہے :

۱۔ حریت ذات۔ ۲۔ حریت مادی (مقام)۔ ۳۔ حریت ملک

۴۔ حریتِ اعتقاد۔ ۵۔ حریتِ رائے۔ ۶۔ حریتِ تعلیم

اگر یہ آزادیاں کسی شخص کو میسر ہیں، تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ حریت شخصی سے بہرہ ور ہے۔

آیئے! اب دیکھیں کہ اسلام نے ان آزادیوں کو برقرار رکھا ہے یا انھیں چھین لیا ہے؟

حدود اور تعزیر : اسلامی احکام کی رُو سے حریتِ ذات مکمل طور پر تسلیم کی گئی ہے اور اسے ہر ناروا پابندی اور زیادتی سے محفوظ رکھا گیا ہے البتہ اسلام نے اپنے اوامر و نواہی کے حدود ضرور مقرر کر دیے ہیں، اور ان حدود سے تجاوز کرنے پر شرعی سزائیں بھی تجویز کر دی ہیں، بعض سزائیں تو وہ ہیں جن کی

صاف صاف نوعیت اور تفصیل و کیفیت بتا دی گئی ہے، جنھیں ہم اصطلاح میں "حدود" کہتے ہیں، اور بعض سزائیں ہیں جن کو حکام کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان کا اصطلاحی نام تعزیرات ہے، اب سمجھ لینا چاہیئے کہ مجرم وہی ہے جو حدود الٰہی سے تجاوز کر جائے، اور سزا بھی وہی ہے جو شرع اسلامی کے موافق ہو۔

علماء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ عقوبات وہی جائز ہیں، جو نص سے ثابت ہوں، نہ کہ رائے اور قیاس سے چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"ولا عدوان الا علی الظلمین"!

نیز فرمایا:

"فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم"

اب ذرا غور کیجیے۔ "نہی" تو یہ ہے کہ "عدوان" ظالم کے سوا کسی اور پر نہ ہو، اور "امر" یہ ہے کہ ظالم کو جو سزا دی جائے وہ اس کی ایذا رسانی سے زیادہ نہ ہو۔ ان حقائق کی بنا پر ثابت ہوا کہ سزا شرع کے مطابق ہی دی جا سکتی ہے۔ اس میں قیاس اور رائے کو بالکل دخل نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر آزادی شخصی اور حریت ذات کا تصور کیا ہو سکتا ہے؟

جتنا جتنا بھی کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کا استقصا کیا جائے گا۔ یہی معلوم ہو گا کہ ظلم اور ایذا دہی کی ممانعت کی گئی ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی، اور حریت ذات اور امان انسان کی تائید کی گئی ہے اور اسے دوسروں کی تعدّی سے بغیر امتیاز دین و ملّت محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے[28]

علّامہ ابن قیم کی تصریحات: علامہ ابن قیم اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"بریرہ رض کا سابق شوہر کے لیے آپ ص کی سفارش پر) یہ سوال کہ آیا یہ آپ ص کا حکم ہے؟ اور آپ ص کا جواب کہ نہیں ہیں تو صرف سفارش کر رہا ہوں، پھر

بریرہؓ کا کہنا کہ مجھے اس (سابق شوہر) کی ضرورت نہیں۔ اس سے یہ احکام ملتے ہیں: ۱۔ ایک یہ کہ اگر حکم ہو تو آپؐ کا حکم وجوب کے لیے ہے، اسی وجہ سے آپؐ نے حکم اور شفاعت میں فرق فرمایا:

۲:۔ دوسرے یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ رضؓ کے انکار کا بُرا نہیں مانا، نہ آپؐ برہم ہوئے۔ جب انھوں نے آپؐ کی سفارش قبول نہیں کی۔ کیونکہ شفاعت میں مشفوع کا حق ساقط کیا جاتا ہے، اور یہ اس کی مرضی ہے کہ چاہے اس سے دست بردار ہو جائے اور چاہے تو اسے باقی رکھے، یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت نہ ماننا حرام نہیں، البتہ آپؐ کا حکم نہ ماننا حرام ہے[۲۹]

مؤطا امام مالکؒ میں حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ فرمایا:

"جس عورت کو کسی مجنون، جذامی یا مبروص کی بیوی ازراہِ فریب بنا دیا جائے تو وہ مہر کی حقدار ہے[۳۰]

مجنون کو ایک سال کی مہلت ہے، اگر اسے افاقہ ہو جائے تو ٹھیک ورنہ اس کے اور عورت کے درمیان جدائی کر دی جائے گی[۳۱]

آزادیٔ ذات کی یہ مثالیں صرف اسلامی جمہوریہ ہی میں مل سکتی ہیں اور حکومت کے فرائض کے سلسلے میں معالج کی ذمہ داری سے متعلق اور حکومت کے فرائض کے سلسلے میں بھی اسلامی جمہوریت ایک نمایاں تر نہج رکھتی ہے:

"عمرو بن شعیب نے اپنے والد سے انھوں نے اپنے دادا سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس کسی نے اپنے آپ کو طبیب ظاہر کیا، حالانکہ طب کا علم اور فن نہیں جانتا تو اس سے تاوان لیا جا سکتا ہے[۳۲]"

جاہل طبیب پر ضمان (تاوان) ڈالنے کا سبب یہ ہے کہ جب اس نے طب کا کام شروع کر دیا، اور اس نے اس سے قبل علم طب پورے طور پر نہیں سیکھا تو

گویا اس نے لوگوں کی جان سے کھیلنا شروع کر دیا، وہ گویا ایسے کام کا مرتکب ہونا چاہتا ہے جس کا اسے علم نہیں، وہ مریض سے دھوکا کرتا اور اسے مبتلائے فریب کرتا ہے۔ لہٰذا اس پر ضمان لازم آئے گی۔

اس مسئلہ میں اہل علم کا اجماع ہے، خطابیؒ فرماتے ہیں۔ میرا خیال ہے: "اگر معالج کی زیادتی کے باعث کوئی مریض ہلاک ہو جائے تو اس پر ضمان لازم آنے کے سلسلہ میں کسی کا اختلاف نہیں"۔

البتہ اگر کوئی شخص اس فن میں کچھ علم رکھتا ہو، لیکن تجربہ اور معرفت کے لحاظ سے کوئی مرتبہ نہ رکھتا ہو، اس کے علاج سے اگر کوئی ہلاک ہو جائے تو اس پر دیت (خون بہا) لازم آئے گی، قصاص ساقط ہو جائے گا

ایک قسم ایسے طبیب حاذق کی ہے، جو اجازت یافتہ بھی ہے، اس فن میں درک اور مہارت بھی رکھتا ہے، لیکن ہاتھ چوک گیا۔ اور اس نے کوئی عضو صحیح ضائع یا نکما کر دیا۔ تو اس سے ضمان (تاوان) لی جائے گی، کیونکہ اس نے قابل سزا غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاوان ملزم سے لیا جائے گا یا بیت المال سے؟ اس کے متعلق دو قول ہیں:

ایسا طبیب جو حاذق ہے اس نے فنِ طب میں پورے طور پر مہارت حاصل کی ہے۔ اب اس نے کسی آدمی یا بچے یا مجنون کا پھوڑا بغیر اس کے یا ولی کے اذن کے کاٹ دیا، یا ولی کے اذن کے بغیر بچے کا ختنہ کر دیا، اور ضرر پہنچ گیا تو ہمارے اصحاب فرماتے ہیں کہ چونکہ اس نے بلا اجازت تصرف کیا ہے۔ اس وجہ سے اس پر ضمان لازم ہو گی، اور اگر بالغ یا بچے اور مجنون کا ولی (سرپرست) اذن دے دے تو ضمان نہ ہو گی۔

اطباء کے نزدیک بعض مرض موروثی اور متعدی ہوتے ہیں۔ جذامی اور سل کے مریض کے پاس رہنے والا بھی ان امراض کی ہوا سے مبتلائے مرض

ہوسکتا ہے۔ چنانچہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت پر کمال شفقت و نصیحت کی بناء پر ان اسباب سے بھی منع فرمایا، جن سے ان کے اجسام و قلوب میں فسادِ مرض لاحق ہو، فی الحقیقت گاہے گاہے بدن میں اس مرض کے قبول کر لینے کی استعداد مخفی ہوتی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ طبیعت نقال ہونے کے باعث مجالست و مخالطت رکھنے والے امراض سے تیزی کے ساتھ منفعل اور متاثر ہو جاتی ہے[۳۳]

جب ثابت ہو گیا ہے کہ بدن کی صحت اور بقاء اور اس کا اعتدال ہی حرارت کے لیے رطوبتِ مدافعہ کا ذریعہ ہے۔ تو گویا رطوبت اس کا مادہ ہے اور حرارت اس کا نفع کرتی ہے، اور اس کے فضلات کو دور کر کے اس کی اصلاح و تلطیف کرتی ہے ورنہ بدن فاسد ہو جائے گا اور اس کا درست رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ اسی طرح رطوبت حرارت کی غذا ہے، اگر رطوبت نہ ہو تو بدن جل اٹھے اور اسے خشک کر کے ختم کر دے ——— گویا دونوں ایک دوسرے کے لیے مادہ کا کام دیتے ہیں۔ اس لیے حرارت ہمیشہ رطوبت کو تحلیل کرتی رہتی ہے اور بدل ما یتحلل کے طور پر بدن مزید رطوبت کا محتاج ہوتا ہے تاکہ اپنی زندگی کو قائم رکھ سکے۔ یہ رطوبت کھانے اور پینے سے حاصل ہوتی ہے، اگر رطوبت مقدار میں بڑھ جائے تو حرارت اسے تحلیل کرنے سے عاجز رہ جاتی ہے، اس وقت یہ رطوبت فاسد مواد کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ بدن مبتلا ہو کر بیمار ہو جاتا ہے اور مادہ کی نوعِ قبولیت اور استعدادِ مرض کے لحاظ سے مختلف انواع لاحق ہو جاتے ہیں۔ اور یہ تمام احتیاطیں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مستفاد ہیں:

"کلوا و اشربوا ولا تسرفوا" یعنی کھاؤ، پیو اور اسراف نہ کرو[۳۴]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بدل ما یتحلل کے مطابق کھانے پینے کا حکم دیا، تاکہ اس سے بدن کی کمیت اور کیفیت میں فائدہ مند

حد تک استفادہ حاصل ہو، لیکن جب یہ مقدار بڑھ جائے گی تو اسراف میں داخل ہوگی اس لیے دونوں باتیں صحت کے لیئے مضر اور مرض کی ذمے دار ہیں یعنی خورونوش، بند کر دینا، یا اس میں اسراف سے کام لینا۔

پس اللہ تعالیٰ کے ان دو کلمات طیبہ میں حفظانِ صحت کی تمام باتیں مکمل طور پر پائی جاتی ہیں، جو نبئ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتِ طیبہ کا مطالعہ کرے گا، وہ اسے حفظ صحت کے لیے سب سے زیادہ اعلیٰ اور عمدہ پائے گا، کیونکہ صحت کی حفاظت، خورونوش، لباس، رہائش، ہوا، نیند، بیداری، حرکت وسکون، نکاح، استفراغ اور احتباس، ہر بات حسنِ تدبیر پر موقوف ہے، اب اگر ان باتوں سے بدن میں عمر اور عادت کے مطابق اعتدال قائم رہا تو یہ مرنے تک بالکل صحت مند یا اس کے قریب ہی رہنے کا ذریعہ ہوگا، اور چونکہ صحت وعافیت، بندے پر اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے ایک انعام اور سب سے بہترین اور اعلیٰ عطیہ اور سخاوت ہے بلکہ صحت کاملہ علی الاطلاق تمام نعمتوں سے بڑھ کر بڑی نعمت ہے۔ اس لیے جسے اس کی حفاظت، مراعت اور دفاع کا موقع ملے، اس کے لیے اس کی حفاظت کرنا واجب ہے[۳۵]

حریّت تعلیم: حریتِ تعلیم بھی بنیادی حقوق کے ذیل میں آتی ہے:

اسلام نے علم کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اور تحصیلِ علم کے لیے کسی طرح کا امتیاز نہیں روا رکھا ہے، جس زمانے میں اسلام نمودار ہوا، عورتوں کی تعلیم بمنزلہ صفر کے تھی۔ عرب جاہلیت میں جب عورت کا کوئی خاص مقام ہی نہ تھا۔ نہ اس کے حقوق معین تھے، نہ وہ اس کی اہل سمجھی جاتی تھی کہ اس کے لیئے حقوق معین ہوں اسلام نے بڑی صفائی کے ساتھ جس طرح جہدِ حیات کے دوسرے حقوق میں مرد و زن کو ایک صف میں رکھا تھا۔ تعلیم کے معاملے میں بھی مرد اور عورت کے درمیان کوئی دیوار نہیں کھینچی ہے۔

چنانچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کی صاف اور واضح تعلیم یہ ہے کہ:

طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ
یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت کا فرض ہے،

اسلام نے "جاننے والوں" (عالموں) اور "نہ جاننے والوں" (غیر عالموں) کا درجہ بھی یکساں ماننے سے انکار کر دیا ہے، علم کے سلسلہ میں اسلام نے علم کے انواع متعینہ و مختلفہ و متعددہ کی کوئی تصریح نہیں کی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ علم جس سے دینی و دنیوی مصلحت پوری ہوتی ہو۔ بس وہی مطلوب ہے، اور حق ہے کہ اس علم کو ذکور و اناث کے درمیان شائع کیا جائے۔

یہ بات اصولِ اسلام کے قطعاً خلاف ہے کہ اس کا دائرہ کسی "خاص" "علم" کے ساتھ محدود کر دیا جائے، یا وہ تعلیم کے راستے میں روک بن کر کھڑا ہو جائے بلکہ تاریخ سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے بلاد و امصار کو مختلف علوم کا مرکز بنا رکھا تھا، اور اپنے علوم کی وسعت اور اپنے نظریات کی وسعت کے لیے اسلام کے طبقات علماء نے "غیر اسلامی" علوم سے بھی استفادہ کیا، اور انھیں بھی وسعت دی، چنانچہ ہر اہل علم جانتا ہے کہ ابن مقفع وغیرہ نے فارسی علوم کا عربی میں ترجمہ کیا، اسی طرح خلیفہ منصور، خلیفہ ہارون رشید، خلیفہ مامون رشید وغیرہ کے دربار میں یونانی علوم "معرب" بنائے گئے، چنانچہ بغداد قرطبہ اور سمرقند کے تاریخی دور میں علم اور تعلیم کی جو وسعت اور کثرت ہم دیکھتے ہیں۔ وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام نے حریتِ علم اور اشاعتِ تعلیم کو کس درجہ اہم مانا ہے۔

ایسا ہونا تعجب خیز نہیں، البتہ ایسا نہ ہونا تعجب خیز ہوتا، اسلام کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ اس کا پیش کیا ہوا ایمان "برہان" اور "حجت" اور "نظر" پر قائم ہے، وہ بار بار دعوت دیتا ہے کہ:

"ملکوت السمٰوات والارض"، دلائل و براہین پر غور کرو، انھیں دیکھو اور ان کو سمجھو، یہ "نظر" نہیں پیدا ہو سکتی، جب تک علوم مختلفہ پر نظر نہ ہو

اور بہت سے نظریات علم سامنے نہ ہوں۔

مسلمان بحث و گفتگو کی قوت میں کس طرح حریف کا مقابلہ کر سکتے تھے اگر وہ انواعِ علوم و فنون سے بے خبر رہتے، جن کی ہر زمانہ میں مختلف انداز سے ضرورت لاحق ہوتی ہے[۳۶]

قرآن کریم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"ویعلمکم الکتاب والحکمۃ ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون،	یعنی یہ رسول تمھیں قرآن اور دانش کی باتیں بتاتا ہے اور ایسا علم سکھاتا ہے جس کو تم نہیں جانتے تھے[۳۷]

علم جہل کی ضد ہے اور اس کا دامن اتنا وسیع ہے کہ اس میں جملہ اقسام کے معلومات آجاتے ہیں۔

قرآن نے مطلق طور پر علم کا ذکر کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم بجائے خود مجد و شرف کا حامل ہے، چنانچہ رسولؐ اکرم کا ایک وصف یہ ہے کہ وہ "تعلیم" دیتے ہیں۔ اور مسلمان کی خوبی یہ ہے کہ وہ علم کو سیکھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حریت تعلیم، اسلام کی ایک اہم ترین خصوصیت ہے۔

۱- کفار کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:

"مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت اتخذت بیتا وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون"ط	یعنی جن لوگوں نے خدا کے سوا اور کارساز تجویز کر رکھے ہیں۔ ان لوگوں کی مثال مکڑی کی سی ہے، جس نے ایک گھر بنایا اور بلاشبہ سب گھروں سے بودا گھر مکڑی کا ہوتا ہے اگر انھیں علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے!

۲- پھر فرمایا:

وتلک الامثال نضربھا للناس	یعنی ہم یہ مثالیں لوگوں کو سمجھانے کے

وما یعقلھا الا العالمون" ٥ — ایسے بیان کرتے ہیں اور ان مثالوں کو بس علم والے ہی سمجھتے ہیں۔

۳- پھر ارشاد ہوا :

"وما ھٰذہ الدنیا الا لھو ولعب — یعنی یہ دنیوی زندگی بجز لہو لعب کے کچھ
وان الدار الآخرۃ لھی الحیوان ط — نہیں اور اصل زندگی دار آخرت کی زندگی ہے
لو کانوا یعلمون" ط — اگر انھیں اس کا علم ہوتا تو ایسا (ہرگز) نہ کرتے۔[۳۹]

یہ ایک سورۂ مبارکہ کی تین مختلف آیات کریمہ ہیں (اور بھی بہت سی ہیں) ان سے علم کی حیثیت اور اہمیت پر کتنی روشنی پڑتی ہے۔ بسط و تفصیل اور اوراق تفسیر کھنگالنے کا یہ موقع نہیں، لیکن مختصراً ان سے جن امور پر روشنی پڑتی ہے یہ ہیں :

۱- مشرکین اگر علم صحیح سے بہرہ اندوز ہوں تو وہ خدا کے سوا کسی اور کو کارساز نہیں مان سکتے۔

۲- اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن کریم میں بہت سی مثالیں بیان فرمائی ہیں، جو تاریخ، جغرافیہ، آثار قدیمہ، نفسیات انسانی، سنت اللہ یعنی نظام قدرت وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ قرآن خود کہتا ہے کہ ان مثالوں کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، اور ان کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں، جو صاحب علم ہوں۔

۳- یہ چند روزہ زندگی بے حقیقت ہے، اصل زندگی تو وہ ہے جو اس کے بعد شروع ہوگی، لیکن لوگ اس حقیقت کو فراموش کیے ہوئے ہیں، اور اس کا سبب یہ ہے کہ علم نہیں رکھتے، اگر رکھتے ہوتے تو ایسا نہ کرتے۔

گویا کفر و اسلام کا مدار "علم" پر ٹھہرا، کفر جہل ہے، اور اسلام علم ہے!

جب صورت واقعہ یہ ہے تو ظاہر ہے اسلام میں حریت تعلیم کو غیر معمولی اہمیت ہونی چاہیئے، چنانچہ ہے، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ علم کی ترویج اور فروغ حکومت کی ذمہ داری ہے، یہ اس کا کام ہے کہ علم کو زیادہ سے زیادہ پھیلائے

اور عام کرے، تاکہ لوگ اسلام کو اور اس کی حقیقت کو سمجھ سکیں۔

اور یہ میری کوئی ذاتی رائے نہیں ہے، خود اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں:

۱۔ "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" — یعنی خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں، جو (اس کی عظمت) کا علم رکھتے ہیں![39]

۲۔ ارشاد الٰہی ہے:

"وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون اٰمنا بہ"![40]

علماء اجلّ نے اس آیت کے ترجمے ۲ طرح سے کیے ہیں:

ایک تو یہ کہ آیات متشابہات کی تاویل کا علم صرف خدا اور ان لوگوں کو ہے جن کا علم راسخ ہے، وہ کہتے ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے۔

دوسرے یہ کہ آیات متشابہات کا علم بجز حق تعالیٰ کوئی نہیں جانتا، اور جو لوگ علم میں پختہ ہیں، وہ یوں کہتے ہیں، ہم ان پر یقین رکھتے ہیں۔

دونوں ترجموں کی قدر مشترک بہرحال ایک ہی ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون ہ" — یعنی اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے، کیا علم والے اور جہل والے (کہیں) برابر ہوتے ہیں؟[41]

ان ہر سہ آیات سے کیا معلوم ہوتا ہے؟

۱۔ خدا کی عظمت وجلالت کا صحیح طور پر اندازہ کر کے وہی اس سے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

۲۔ آیات متشابہات کا علم ان لوگوں کو ہے جو علم میں راسخ ہیں۔

۳۔ یا وہ لوگ جو علم میں راسخ ہیں، اپنی معرفت الٰہی کی بنا پر کہہ اٹھتے ہیں۔ کہ ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں۔

۴۔ سب سے آخری اور فیصلہ کن بات یہ ہے کہ عالم اور جاہل برابر

نہیں ہو سکتے۔!

کیا اس سے بڑھ کر بھی علم کے بارے میں کچھ کہا جا سکتا ہے؟ علم کی فضیلت اور اہمیت کیا اب بھی کوئی مشکوک چیز رہے گی؟ جب اسلام علم کو یہ اہمیت دیتا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اسلامی جمہوریت حریتِ تعلیم کی داعی نہ ہو۔؟ کیا اس طرف سے غفلت کرنا اور اسلام کی طرف سے غفلت کرنا ہم معنیٰ نہیں ہو جاتا؟

احادیث نبویؐ اور علم کی ترغیب: احادیثِ نبوی سے بھی اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے:۔

آنحضرتؐ نے اپنے لیے "شہر علم" اور حضرت علیؓ کے لیے "بابِ شہر علم" کا لفظ استعمال فرمایا ہے، اس سے بڑی سند علم کو اور کیا مل سکتی ہے؟

آپؐ نے فرمایا: "اگر کسی کی باندی ہو اور وہ اسے تعلیم دے، حُسن سلوک کا برتاؤ کرے، پھر آزاد کر دے، پھر شادی کرے تو اس شخص کو دُہرا اجر ملے گا!"

آپؐ نے فرمایا: ۱۔ "علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے[۲]!

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا: ۲۔ جس نے حصولِ علم کے لیے راستہ طے کیا، اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دے گا!"

تاوان جنگ بھی علم کی صورت میں ادا کیا جا سکتا ہے:

"امام احمدؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ کچھ قیدی ایسے تھے جن کے پاس فدیہ دینے کے لیے مال نہ تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا فدیہ مقرر فرمایا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں[۳]"

حضرت عمرؓ اور ترویج علم: حضرت عمرؓ نے تعلیمی نظام کو بعید ترین گوشوں تک وسعت دی۔ خانہ بدوشوں کو بھی تعلیم سے مستثنیٰ نہیں رکھا، کیونکہ آپؓ کے خیال میں تعلیم و تبلیغ اسلام کا سب سے بڑا ذریعہ تھی، مگر دشواری یہ تھی کہ یہ خانہ بدوش بدّو ایک جگہ ٹکتے نہیں تھے، اور

ہر موسم میں اپنی جائے قیام بدل دیتے تھے! اس صورت میں انھیں تعلیم دینا اور ان کی تعلیمی ترقی سے مطلع ہونا کارِ دشوار تھا، پھر بھی آپؓ نے اس عقدۂ دشوار کو حل کر لیا۔

آپؓ نے گشتی نگرانوں کا سلسلہ قائم کیا جو ایک شخص ابوسفیان کی زیرِ نگرانی خانہ بدوش قبائل میں گھوم پھر کے ان کا امتحان لے کر ان کی تعلیمی ترقی کا اندازہ لگاتے تھے[۴۴]

حریتِ ملکیت: حریتِ ملکیت کو بھی اسلام بنیادی حقوق میں شمار کرتا ہے:

یاد رکھنا چاہیے ـــــ چور کے لیے جو سزا مقرر کی گئی اور غاصب کی جو تعزیر مقرر کی گئی ہے، اس کی بنیاد بھی یہی حریتِ ملکیت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"والسارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما" یعنی چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی کے ہاتھ کاٹ دو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"لا یحل لاحد ان یاخذ متاع اخیه عبادو جادا فان اخذہ فلیئودہ علیه" یعنی کسی شخص کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کا مال ہتھیا لے اور اگر ایسا کرے تو اسے چاہیے کہ واپس کر دے۔[۴۵]

آپؐ نے فرمایا: "جو کسی دوسرے کی زمین کا تھوڑا سا حصہ بھی غصب کرے گا، زمین کے ساتویں طبق سے اتنا حصہ نکال کر اس کے گلے کا طوق بنایا جائے گا۔

اس حدیث سے آزادیٔ املاک کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

زہری کی روایت: بہ روایتِ زہری: "جب آپؐ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو مسجد کا سوال پیدا ہوا، آپؐ کی تشریف آوری سے

پہلے، اسعدؓ بن زرارہ نے ایک قطعہ زمین پر نماز کا بندوبست کر رکھا تھا
آپؐ نے یہ جگہ مسجد کے لیے موزوں تصوّر کی، یہ قطعۂ ارض دو یتیم لڑکوں کا
تھا۔ ان لڑکوں کے ولی اسعدؓ تھے۔ آپؐ نے زمین کی قیمت پیش کی، لیکن
اسعدؓ نے اور یتیموں نے قیمت لینے سے انکار کر دیا، بنونجار نے خواہش
ظاہر کی کہ وہ اپنے پاس سے قیمت ادا کر دیں، آپؐ نے کوئی بات بھی نہیں مانی۔
نہ زمین مفت لی، نہ بنو نجّار کو قیمت دینے دی، قیمت دس درہم طے پائی۔
اور آپؐ نے یہ رقم ادا فرما دی[۴۶]

حکومت کی ترکیب و تشکیل میں حصّہ: حکومت کی ہیئت ترکیبی اور تعمیر و تشکیل میں حصّہ لینا، اور اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرنا ہر شخص کا بنیادی حق ہے اور اسلام نے اپنے پیروؤں کو یہ حق دیا ہے اور مسلمانوں نے اس حق کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ جدوجہد بھی کی ہے۔ اور بڑی سے بڑی قربانیاں بھی دی ہیں۔ خاص طور پر مسلمانوں کے بدنام فرقے، خوارج نے اس سلسلے میں جو سعی و کوشش کی، اور جو قربانیاں دیں وہ تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب بن چکی ہیں۔

علامہ اقبال نے جمہوریت کی جو تعریف کی ہے، خوارج اس پر بڑی حد تک پورے اترتے تھے۔ علامہ کا خیال تھا:

"اسلام نے دنیا کو جمہوریت کی روح سے روشناس کیا، اسی لیے اسلام نے وحی کا سلسلہ بند کر دیا تاکہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کریں۔ بنی آدمؑ کو حریت کی تعلیم دینے اور اس نعمت سے مالا مال کرنے کے لیے وحی کو ختم کرنا لازمی تھا — اسلام میں امارت بھی نکاح کی طرح ایک عمرانی معاہدہ ہے۔ امیر اور قوم کے درمیان۔ اسلامی جمہوریت میں رائے دہی کے لیے کلمہ شہادت ادا کرنا کافی ہے[۴۷]

خوارج کے نزدیک خلافت کا مستحق ہر وہ شخص ہو سکتا ہے، جو صالح

ہو۔ اور اپنے معاصرین میں بہتر اور برتر ہو۔ اور اس طرح یہ لوگ خلافت کو ایک جمہوری ادارہ سمجھتے ہیں۔

خوارج کا نظریۂ سیاست خلیفہ کے انتخاب اور عزل میں اس نظریے سے ملتا جلتا تھا۔ جو انقلابِ فرانس اور انقلابِ انگلستان کا محرک تھا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اہلِ مغرب نے انقلاب کا سبق خوارج سے سیکھا تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

خوارج کا دستور: خوارج کا دستور وہی تھا، جو خلفائے اولین کا تھا۔ وہ ان دونوں کے اعمال کو حجت قرار دیتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کے جوش نے ایسی شدت اختیار کر لی تھی کہ جب وہ کسی شہر پر حملہ کرتے تھے تو اپنے آپ کو مسلمین اولین قرار دیتے تھے، خوارج کا لفظ انھوں نے خود ہی اپنے لیے وضع کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ ائمہ جور کے خلاف خروج کرتے تھے۔

ابو حمزہ خارجی نے ایک موقعے پر اپنے اصحاب کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"آدھی رات کو اللہ انھیں اس حالت میں دیکھتا ہے کہ یہ قرآن کی تلاوت میں مصروف ہیں۔ جب کوئی ایسی آیت آتی ہے، جس میں جنت کا ذکر آتا ہے تو یہ وفورِ اشتیاق سے بے تاب ہو کر رونے لگتے ہیں، جب کوئی ایسی آیت آتی ہے جس میں جہنم کا ذکر ہوتا ہے تو یہ کانپنے اور لرزنے لگتے ہیں۔"

یہ لوگ غضب کے بہادر تھے، کسی حریف نے ان سے بڑھ کر دلیر اور جنگ جو کسی کو نہ پایا ہوگا، لڑنے میں تیز، حملہ کرنے میں چوکس، نیزہ بازی میں طاق تاریخ میں ان کی جرأت و بسالت اور قوت و ہمت کی داستانیں بھری پڑی ہیں۔ زیاد نے دو ہزار سپاہی دے کر اسلم بن زرعہ کو خوارج سے مقابلہ کرنے بھیجا۔ ابو بلال خارجی نے اپنے چالیس آدمیوں کی مدد سے انھیں بھگا دیا۔

"یورپ کے مستشرقین نے خوارج پر کافی توجہ کی ہے۔ وان فلوٹن کا خیال ہے کہ "یہ جمہوریت پسند جماعت تھی"۔
پروفیسر نکلسن کا قول ہے "خارجی تحریک کی بنیاد مذہب پر قائم ہے اگرچہ بظاہر وہ سیاسی معلوم ہوتی ہے"

خوارج کا سراپا:

"خالص عربی جمہوریت کے علمبردار"
عربی شجاعت و شہامت کا کامل نمونہ
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے داعی!
دفاعِ محرمات پر جان دینے کے لیے تیار!
خلفاء کے لیے عدل و انصاف، اخلاص اور احسان اور حسنِ اخلاق کی شرط لازم پر مُصر اور اس سلسلے میں بہت زیادہ سخت اور شقی[۴۸]

خوارج کے صفات کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب حجاج نے برا ابن قبیصہ کو مُہلب کے پاس بھیجا کہ اسے خوارج کے قتال پر برانگیختہ کرے، اور اس نے اپنی آنکھوں سے خوارج کا اندازِ جنگ دیکھا تو بے ساختہ مہلب سے کہہ اُٹھا:

جس قوم سے آپ لڑ رہے ہیں۔ ایسی بہادر اور ثابت قدم قوم میں نے آج تک نہیں دیکھی۔

پھر حجاج کے پاس وہ واپس آگیا تو کہا:۔ "میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جن پر خدا ہی غلبہ دے تو فتح ہو سکتی ہے[۴۹]!"

خوارج کا ایک سردار قطری ایک جنگ میں اس طرح نمودار ہوا کہ اس کے ہاتھ میں لکڑی کا ایک ڈنڈا تھا، اس نے جنگ کے لیے آواز دی، مقابل فوج کا ایک شخص سامنے آیا۔ قطری نے پوچھا:

"کہاں بھاگا جاتا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا :
"تم جیسے شخص کے سامنے سے بھاگنا کسی آدمی کے لیے موجب ندامت نہیں ہو سکتا"
حوثرہ کو اس کا باپ، معاویہ کی فرمائش سے دعوتِ طاعت دینے آیا تھا، جب وہ کسی طرح نہ مانا تو اس نے کہا :
"اے بیٹے! میں تیرا بچہ ساتھ لایا ہوں تو اسے دیکھے گا تو اس کی جدائی کے خیال سے تیرا دل تڑپے گا۔
حوثرہ نے جواب دیا :
"والد بزرگوار! خدا کی قسم! نیزے کا گھاؤ میرے لیے بیٹے کے دیدار سے زیادہ خوش گوار ہے![۵۷]"

ماخذ :

۱ سورۂ آل عمران، پارہ ۸، رکوع ۱۹، آیت ۱۵۸
۲ سورۂ انعام، پارہ ۷، رکوع ۷، آیت ۵۸؛ نیز ملاحظہ ہو، سورۂ یوسف، رکوع ۸، آیت ۶۸، نیز سورۂ انعام پارہ ۷، رکوع ۸، آیت ۶۳، نیز سورۂ قصص، پارہ ۲۰، رکوع ۹، آیت ۸۹۔
۳ سورۂ نحل، پارہ ۱۴، رکوع ۱۰، آیت ۷۶۔
۴ السیاستہ الشرعیہ (علامہ خلاف) طبع مصر، ص ۹۲، ۹۳۔
۵ سورۂ نسا، پارہ ۴، رکوع ۱۲، آیت ۹۲
۶ بخاری، ابو داؤد، ترمذی اور نسائی سب نے اسے روایت کیا ہے۔
۷ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (استاذ سید قطب شہید) طبع مصر، ص ۹۸

۸؎ سورۂ ممتحنہ، پارہ ۲۸، رکوع ۲، آیت ۸۔

۹؎ السیاستہ الشرعیہ (علامہ خلاف) طبع مصر، ص ۱۰۷، ۱۰۹۔

۱۰؎ کتاب الاموال (ابو عبید) طبع مصر، ص ۳۰۔

۱۱؎ صحیح مسلم اور صحیح بخاری دونوں کے مرویات میں شامل ہے۔

۱۲؎ صحیح بخاری، کتاب الادب و صلۃ الرحم۔

۱۳؎ السیاستہ الشرعیہ (علامہ خلاف) طبع مصر، ص ۱۰۱، ۱۰۳

۱۴؎ نطع — چمڑے کا وہ فرش، جس پر مقتول کو بٹھا کر گردن مارتے تھے، کیونکہ خیال یہ تھا کہ اگر مقتول کے خون کے چھینٹے فرش زمین پر پڑے تو بادشاہ کے لیے یہ چیز نحس ہوگی۔ لہٰذا خون نطع سے باہر نہیں نکل پاتا تھا۔

۱۵؎ سراج الملوک (طرطوشی) طبع مصر، ص ۵۲، ۵۳، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۸۳، ۸۶، ۸۷، ۱۱۳، ۱۴۴۔

۱۶؎ حسن المحاضرہ (سیوطی) ج ۲، ص ۱۱۶

۱۷؎ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین، طبع مصر، ص ۱۰۴۔

۱۸؎ تمدن عرب (موسیو لیبان) ص ۲۸۲، ۱۹؎ اخبار الاندلس (اسکاٹ) ج ۲، ص ۲۳

۱۹؎ کتاب الاخلاق (احمد امین) طبع مصر ص ۲۸، ۲۰؎ صحیح بخاری کتاب الفرائض عن ابی ہریرہ رض

۲۱؎ اعلام النبوۃ، ص ۱۵۵ ۲۲؎ سورۂ بقرہ، پارہ ۲، رکوع ۳۴، آیت ۲۵۸۔

۲۳؎ سورۂ یونس، پارہ ۱۱، رکوع ۱۰، آیت ۲، ۲۴؎ سورۂ کافرون پارہ ۳۰، رکوع ۱، آیت ۷۷

۲۵؎ السیاستہ الشرعیہ (خلاف) طبع مصر، ص ۲۹، ۱۰۱، ۱۳۱۔

۲۶؎ سورۂ اسرائیل، رکوع ۱۲، آیت ۱۶۔

۲۷؎ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۳، ص ۱۳۲، طبع مصر۔

۲۸؎ السیاستہ الشرعیہ ص ۹۳، ۹۴ (علامہ خلاف) طبع مصر،

۲۹؎ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۴، ص ۱۲۷، طبع مصر،

۳۰؎ موطا امام مالک رح عن عمر بن الخطاب رض

۳۱ھ زادالمعاد، ج ۴، ص ۱۳۴، (ابن قیم) طبع مصر۔
۳۲ھ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، عن عمرو بن شعیب رضہ
۳۳ھ زادالمعاد (ابن قیم) ج ۳، ص ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۴، ۲۹۵،
۳۴ھ سورۂ اعراف، رکوع ۲، آیت ۳۳،
۳۵ھ زادالمعاد، ج ۳، ص ۳۵۴، ۳۵۵ (ابن قیم) طبع مصر،
۳۶ھ السیاستہ الشرعیہ، ص ۱۰۴، ص ۱۰۶ (علامہ خلاف) طبع مصر،
۳۷ھ سورۂ بقرہ، پارہ ۲، رکوع ۱۸، آیت ۱۵۱
۳۸ھ سورۂ عنکبوت، پارہ ۲۱، آیات ۴۰، ۴۲، ۶۳،
۳۹ھ سورۂ فاطر، رکوع ۳، آیت ۲۹، پارہ ۲۲،
۴۰ھ سورۂ آل عمران، پارہ ۳، رکوع ۱، آیت ۸
۴۱ھ سورۂ زمر، پارہ ۲۳، رکوع ۱، آیت ۱۰
۴۲ھ ابن ماجہ، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، بیہقی، نسائی،
۴۳ھ زادالمعاد، ج ۲، ص ۱۴۸ (ابن قیم) طبع مصر،
۴۴ھ اصابہ فی احوال الصحابہ (ابن حجر دمشقی) تذکرہ اوس بن خالد
۴۵ھ السیاستہ الشرعیہ، ص ۹۷، (علامہ خلاف) طبع مصر،
۴۶ھ زادالمعاد، ج ۱، ص ۳۰۸ (علامہ ابن قیم) طبع مصر،
۴۷ھ اقبال ریویو، جولائی ۱۹۶۶ء۔
۴۸ھ تاریخ خوارج (عمر ابوالنصر) طبع بیروت، ص ۶۰، ۱۱۲، ۱۱۸
۴۹ھ وفیات الاعیان، (ابن خلکان) ج ۱، ص ۴۳۰،
۵۰ھ الکامل للمبرد، ج ۲، ص ۱۵۰،

(۸)

عورت، اس کی شخصیّت اور حقوق!

اسلام سے پہلے بھی دنیا تھی، یہی اس کے شب و روز تھے، یہی حقوق و اختیارات کے حدود تھے۔ حکومتیں تھیں، اور ان کے قائم کیے ہوئے آئین و دستور تھے، بادشاہ تھے، اور ان کے احکام و فرامین تھے، مذاہب تھے اور ان کے ارشادات و ہدایات تھے، سماج تھی، اور اس کے اصول و ضوابط تھے۔ سوسائٹی تھی، اور اس کے آداب و اطوار تھے، لیکن عورت کو ایک شہری کی حیثیت سے مساوی حقوق کبھی حاصل نہ ہوئے۔ حد بندیاں رہیں، قدغنوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے حسن و جمال کے سامنے تخت و تاج سجدے کرتے رہے۔ اس کی سحر نگاہی اور دل ربائی پر نقدِ جاں نثار کرنے والوں کی کمی بھی نہیں تھی اس کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھایا گیا۔ اسے سرِ بازار لونڈی بنا کر فروخت کیا گیا، اسے بازارِ حسن کی زینت بنایا گیا، غرض جہاں تک اس کی رعنائیوں سے بہرہ ور ہونے کا تعلق تھا اس کی قدر افزائی میں کوئی کمی نہیں کی گئی، اور اگر اس نعمت خداداد سے وہ محروم نظر آتی، تو اسے دستِ تظلّم سے بچانے والا بھی کوئی نظر نہیں آیا۔

عورت کی حیثیت اسلام سے پہلے: عائلی اور خاندانی زندگی میں اسے وہ مقام کبھی حاصل نہ ہو سکا جو ایک انسان کو حاصل ہونا چاہیے۔ اس کے بارے میں یہ تصوّر کر لیا گیا کہ نہ وہ اپنی رائے رکھتی ہے، نہ انفرادیت کی

حاصل ہے، نہ اس کی کوئی شخصیت ہے، بیوی کی حیثیت سے وہ شوہر کی نگاہِ کرم کی محتاج رہی، بیٹی کی حیثیت سے باپ نے جب اور جہاں چاہا، شادی کر دی۔ شوہر نے اگر ظلم کیا تو سعادت مندی یہ تھی کہ خاموشی کے ساتھ ہدفِ ستم بنتی رہے، باپ اور بھائی نے اس کی رائے نظر انداز کر کے اگر اسے کسی کو سونپ دیا، تو اسے مجالِ دم زدن نہ تھی، باپ کی جائداد اور املاک میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا، شوہر کے متروکہ ساز و سامان میں اس کا حصہ صفر تھا۔ وہ خود کسی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد کی مالک نہیں بن سکتی تھی، اس کی ہر چیز کا مالک اس کا شوہر تھا، شادی کے بعد اس کی ذاتی حیثیت یکسر ختم ہو جاتی تھی، وہ اپنے نام تک سے محروم ہو جاتی تھی، اور اسے "مسز فلاں" کا مقامِ بلند حاصل ہو جاتا تھا، شادی کے وقت اگر اسے از قبیل زرِ نقد و جائداد، تحائف اور عطایا ملتے تھے تو فوراً اس کے شوہر کی مِلک بن جاتے تھے۔ ملک کی سیاست میں نظامِ حکومت میں انتخاباتِ عام میں سرکاری اور نیم سرکاری مناصب میں آئین و قانون کے دربار میں نہ اس کا کوئی حصہ تھا، نہ اس کی کوئی آواز تھی۔ اس کی دنیا گھر کی چار دیواری تک محدود تھی۔ اور یہاں بھی اسے چین اور سکون حاصل نہ تھا۔ وہ گویا ماں کے پیٹ سے باندی پیدا ہوئی تھی، اور گوشۂ لحد تک اس کی یہ حیثیت برابر قائم اور برقرار رہتی تھی۔ اسلام سے پہلے بھی یہی صورت تھی اور اسلام کے آنے کے بعد بھی۔ جنھوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا، اسی روش پر قائم رہے۔ یہ عمومی کیفیت تھی، مستثنیات کا ذکر نہیں۔

اسلام نے عورت کو حقوق انسانی عطا کیے: لیکن اسلام نے نہایت صاف طور پر، نہایت صراحت اور وضاحت کے ساتھ، عورت کے حقوق متعین کیے۔ اور یہ تعیین حقوق پر مبنی تھی۔ معاملات اور حقوق

شہریت میں یکسر اور کامل مساوات پر۔ قرآن کریم میں جہاں عملِ خیر پر ثواب کی بشارت ہے اور جہاں عمل ناروا پر عتاب کی وعید ہے، وہاں مرد اور عورت کی، مومن اور مومنہ کی، نہ صرف کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے نہ صرف دونوں کے مابین کوئی حدِّ فاصل نہیں قائم کی گئی ہے، نہ صرف دونوں کے مابین کوئی امتیازی خط نہیں کھینچا گیا ہے، بلکہ واشگاف الفاظ میں دونوں کا مساوی مرتبہ اور درجہ تسلیم کیا ہے، عورت کی انفرادیت اور شخصیت کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھا ہے، اتنا ہی جتنا مرد کا، وہ شوہر کا ضمیمہ نہیں بنے گی، بلکہ اپنے نام سے پکاری جائے گی۔ باپ کی وراثت میں اس کا حصّہ ہو گا۔ شوہر اسے مہر بھی دے گا، عطایا سے بھی نوازے گا اور جب مرے گا تو اس کی املاک و جائداد کی وہ حصّے دار بھی ہو گی، شوہر کی زندگی میں اس کے ساتھ رفیقۂ حیات کی حیثیت سے زندگی بسر کرے گی باندی بن کر نہیں، شوہر اسے مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ اس کے والدین کی خدمت کرے۔ حد یہ ہے کہ شوہر اسے اس پر بھی مجبور نہیں کر سکتا کہ جو بچہ شوہر کے صلب اور عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہو، اسے دودھ پلائے، جس طرح شوہر عدم اتفاق کی صورت میں اسے طلاق دے سکتا ہے، اسی طرح وہ خلع لے سکتی ہے۔ ملکی امور و مہمات میں، مذہبی معاملات و مسائل میں سماجی سرگرمیوں اور مشاغل میں وہ پورا حصہ لے سکتی ہے اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ یہ اتنی مفصل بحث ہے کہ اس پر ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے، لیکن ہم صرف ایک باب لکھ رہے ہیں، لہٰذا ہمیں اختصار سے کام لینا ہو گا۔

قرآن حکیم اور حقوقِ نسواں: عورت کے حقوق اور اس کی شخصیت سے متعلق سب سے پہلے جو چیز ہمیں پیشِ نظر رکھنی ہو گی، وہ قرآن حکیم ہے۔ پھر سُنّتِ نبویؐ، اور اسلامی جمہوریت — ان چیزوں

کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ جبکہ اس کی تائید میں خلفائے راشدین، اور دوسرے اکابر کا عمل بھی موجود ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"ولھن مثل الذی علیھن" یعنی جیسے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں ویسے ہی عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔[1]

پھر آگے چل کر قرآن کریم میں وارد ہوا:

"ھن لباس لکم وانتم لباس لھن" یعنی عورتیں مردوں کی، اور تم مرد عورتوں کے لباس ہو۔[2]

پھر ارشاد ہوا:

"ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف" یعنی جیسے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر (بالانصاف) ہیں۔[3]

عورت کی انفرادیت اور شخصیت کا اسلامی جمہوریہ میں کیا مقام ہے؟ اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک عورت آزاد ہونے کے بعد اپنے معاملات میں کس درجہ آزاد ہے:

جناب ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ بریرہ لونڈی کا شوہر ایک غلام مغیث تھا، (آزادی کے بعد جدائی ہوگئی) گویا کہ وہ اب بھی میری نظروں کے سامنے ہے اور بریرہ اس کے پیچھے روتا پھر رہا ہے۔ جس کے آنسو اس کی داڑھی پر بہہ رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب عباس رضؓ سے فرمایا: "اے عباس! کیا تم کو مغیث کی محبت اور بریرہ رضؓ کی نفرت پر تعجب نہیں ہوتا؟"

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: "بریرہ رضؓ کاش تو اس کے پاس چلی جاتی!"

بریرہ رضؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یہ آپؐ کا حکم ہے یا مشورہ؟"

فرمایا! مشورہ،

بریرہ رضہ نے عرض کیا: "مجھے اس کی ضرورت نہیں"[۳]

علامہ ابن قیم رحمہ نے اس واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے:

"بریرہ رضہ نے آپؐ کی سفارش مغیث کو دوبارہ شوہر بنا لینے کی نہیں مانی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ برہمی کا اظہار کیا، نہ عتاب فرمایا"[۴]۔

جنگ و پیکار میں عورت کو سرگرم کار ہونے کا حق حاصل ہے

جنگ اُحد میں جب کفار کے عام حملے کے بعد آپؐ صرف چند فدائیوں کے ساتھ تنہا رہ گئے، تو ایک خاتون ام عمارہ رضہ آگے بڑھیں اور آپؐ کے سامنے چٹان کی طرح جم کر کھڑی ہو گئیں، کفار کی یورش کا انھوں نے تیر و شمشیر سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ابن قمیہ، جب آپؐ کے قریب پہنچ گیا تو ام عمارہ رضہ نے آگے بڑھ کر اس کا وار روکا، زخمی ہوئیں اور کندھے پر گھاؤ پڑ گیا، پھر بھی ایک زبردست وار دشمن پر کیا[۵]۔

جنگِ اُحد میں حضرت عائشہ رضہ صدیقہ رضہ اور چند دوسری صحابیات نے خواتین انصار کے ساتھ مشک میں بھر بھر کر انھیں پانی پلایا، اور زخمیوں کی خبر گیری کی[۶]۔

دینی معاملات میں بھی عورتیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں: حضرت ابو سعید خدری رضہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن نکلتے تو لوگوں کے ساتھ دو رکعت نماز عید پڑھتے، پھر سلام پھیر کر اپنی سواری پر چڑھ کر لوگوں کے سامنے تشریف لاتے، لوگ بیٹھے ہوتے، ان سے آپؐ فرماتے: "صدقہ کرو!"

یہ سن کر اکثر عورتیں، مختلف اشیاء انگوٹھی اور بُندوں کا صدقہ کرتیں[۷]!

جنگ خندق کے موقع پر جب حضرت حسان بن ثابت رضہ کی ہمت بھی جواب دے گئی تھی، حضرت صفیہ رضہ نے ایک یہودی پر تاک کر ایسا وار کیا کہ فوراً ختم ہو گیا[۸]!

اسی طرح جنگ حنین میں حضرت ام سلیم رضؓ خنجر بدست کفار سے مقابلے اور مقاتلے کے لیے سرگرم نظر آئیں [۹]

کیا ان واقعات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عورت صرف گھر کی ملکہ نہیں، میدانِ جنگ کی سورما بھی ہے؟

عورت اسلام کی داعی اور مبلغ: اور صرف میدان جنگ کی سورما ہی نہیں، اسلام کی داعی اور مبلغ بھی۔ حضرت عمر رضؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کا ارادہ کر کے گھر سے نکلے تھے کہ نئی صدا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے، مگر راستے میں اپنی بہن فاطمہ بنت خطاب کے مسلمان ہونے کا حال سُنا، تو دفورِ غضب سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے وہاں پہنچے، بہن اور بہنوئی پر حملہ آور ہوئے، لیکن قرآن کی چند آیات سُن کر عالم یہ ہوا کہ جن آنکھوں سے غضب کے شعلے برس رہے تھے، ندامت کے آنسو بہنے لگے، اس کے بعد دربارِ رسولؐ میں آ گئے، اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے [۱۰]

کیا یہ ایک عورت ہی کی کامیاب تبلیغ نہ تھی؟

ابو جہل کے بیٹے عکرمہ رضؓ اسلام کا غلبہ دیکھ کر فرار ہو گئے، ان باپ بیٹوں نے اسلام کے خلاف اور داعیٔ اسلامؐ کے خلاف کیا کچھ نہ کیا تھا؟ کون سی اذیت تھی جو نہیں دی؟ کون سا دقیقہ تھا جو اٹھا رکھا تھا؟ کون سے غیر انسانی اور سفاکانہ افعال تھے جن سے اجتناب کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ عکرمہ رضؓ کو اب اپنی خیر نہیں نظر آ رہی تھی، وہ داعیؐ اسلام کے موہومہ انتقام سے خائف تھے، لیکن رحمۃ للعالمین کی رحمت و عطوفت سے ناواقف تھے، مگر ان کی رفیقۂ حیات ام حکیم رضؓ رحمۃ للعالمینؐ کا نظارہ کر چکی تھیں، گئیں، شوہر کو لائیں، اور اس کا سر آستانۂ رسالت پر جھکا دیا [۱۱]

قریش کے مرد نئے دین کو ختم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، ان کی بزم و انجمن میں بس یہی چرچا تھا کہ اسلام کی صدا کس طرح بند کی جائے؟ اور

داعیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آواز کس طرح خاموش کی جائے؟ اسکیمیں بنتی تھیں، سازشیں ہوتی تھیں، منصوبے تیار ہوتے تھے، دجل وفریب اور جنگ وپیکار کے نقشے تیار کیے جاتے تھے۔

لیکن ایک عورت ایسی تھی، جو خاموشی سے اپنے کام میں لگی ہوئی تھی جو چپ چاپ قریش کے گھروں میں جاتی، اور ان کی عورتوں کو اسلام کی حقیقت اور فضائل سے آشنا کرتی، اور کوئی شبہ نہیں کہ خواتین قریش میں اسلام کا میلان جو کچھ بھی اور جتنا کچھ بھی پیدا ہوا، اس میں خاموش مبلغ خاتون ام شریکؓ کا بہت بڑا حصہ تھا۔[12]

تبلیغ اسلام کی راہ میں عورتوں نے محبت اور الفت کی قربانی بھی دی۔

ام سلیمؓ نے ابو طلحہؓ سے خود محبت کرنے اور ان کی محبت کی معترف ہونے کے باوجود اس وقت تک شادی نہیں کی جب تک وہ مسلمان نہیں ہو گئے۔[13] انھوں نے صاف صاف کہہ دیا، کفر اور اسلام میں اجتماع نہیں ہو سکتا، کفر کی آلودگی اسلام کی نفاست سے میل نہیں کھاتی۔ کفر کو چھوڑ دو، اسلام کے دائرے میں آجاؤ، میں تمھاری ہوں۔

عورت دشمن کو امان دے سکتی ہے، جنگ کے سلسلے میں جو اختیارات مردوں کو حاصل ہیں، عورتوں کو بھی حاصل ہیں۔ جس طرح ایک مرد کسی کو امان دے سکتا ہے اور سالار عسکر اس کی دی ہوئی امان قبول کرنے پر مجبور ہے، عورت بھی اس کی مجاز ہے اور مرد کی طرح امان دے سکتی ہے اور اس کی دی ہوئی امان کو حاکم یا سپہ سالار رد بھی نہیں کر سکتا۔ اس حکم میں جہاں دشمن کے ساتھ رعایت ہے وہاں حقوق عامہ کی بھی رعایت ہے چنانچہ مدینہ منورہ میں رقیہؓ نے اپنے شوہر ابوالعاصؓ کو امان دی، جو رسول اللہ نے قبول کر لی۔ اور فتح مکہ کے بعد ام ہانیؓ نے ایک "اشتہاری" خطاکار کو امان دی، جسے آپؐ نے قبول فرمالیا[14] بالکل اسی طرح جیسے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ

حضرت ابو بکرؓ وغیرہ کی سفارش پر کئی دوسرے اسلام کے دشمنوں کو معاف کیا، اور لطف وکرم سے سرفراز فرمایا:

ابن جریرؒ کے نزدیک عورت قاضی اور حاکم بن سکتی ہے:

بقول ماوردی ابن جریر تو عورت کی مساوات کے اس درجہ قائل ہیں کہ ان کے نزدیک ہر قسم کے احکام میں عورت قاضی اور حاکم بن کر فیصلہ کرنے کی مجاز ہے[15] اور ابن جریر کی یہ رائے محض ذاتی رائے نہیں ہے، بلکہ اس کی تائید میں آثار اور اخبار بھی موجود ہیں:

۱۔ صلح حدیبیہ۔ بہ ظاہر یہ عجیب قسم کی صلح تھی، مشرکین مکہ کے تمام شرائط آپؐ نے تسلیم کر لیے تھے۔ چنانچہ مسلمان فریضہ حج ادا کرنے کے لیے مکہ میں داخل نہیں ہو سکے، معاہدے کے مطابق اگلے سال داخلے کی جو شرط تھی تو وہ دل شکن تھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مشرکین میں سے کوئی مدینہ آجائے تو اہل مکہ اسے واپس لا سکتے تھے۔ مسلمانوں میں سے کوئی مکہ چلا جائے تو مسلمان اسے واپس طلب نہیں کر سکتے تھے۔ اس معاہدے نے مسلمانوں پر کچھ عجیب طرح کی افسردگی اور اضمحلال کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ قرآن نے اس معاہدے کو فتح مبین سے تعبیر کیا تھا۔ اور بعد میں ثابت ہوا کہ تھا بھی ایسا ہی، لیکن فی الوقت تو ہر جہت سے شکست ہی نظر آرہی تھی، کوئی چہرہ ایسا نہیں تھا جو مغموم و ملول نہ ہو، سب سے زیادہ مضطرب حضرت عمرؓ تھے۔ وہ اس معاہدے کو نہ صرف حد درجہ ناقابل قبول سمجھتے تھے، بلکہ صحابہؓ سے اس پر جدل و بحث بھی کر رہے تھے، آنحضرتؐ نے معاہدے کی تکمیل کے بعد مسلمانوں کو حکم دیا کہ یہیں قربانی کر لیں اور واپس چلیں، لیکن فرمان رسالتؐ سننے کے باوجود، از خود رفتگی اور آشفتہ خاطری کا یہ عالم تھا کہ تعمیل ارشاد کی تعمیل کے لئے کوئی نہیں اٹھا، تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔[16] بار بار یہی کیفیت قائم رہی، آپؐ کو صدمہ ہوا اور اندر تشریف لے گئے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ انھوں نے رائے دی

کہ اب کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں، آپؐ باہر تشریف لے جائیں۔ اپنے جانوروں کی قربانی کریں، اور حلق (سر منڈانا) کرالیں، آپؐ نے ایسا ہی کیا، لوگ اب تک اس لیے متامل تھے کہ شاید معاہدہ منسوخ ہو جائے، مگر جب آپؐ کو قربانی کرتے اور حلق کراتے دیکھا تو سمجھ گئے فیصلہ ہو چکا، اور اب تو یہ عالم تھا کہ لوگ، ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے، ہر شخص چاہتا تھا تھا، سب سے پہلے وہ سر منڈوالے۔

امام الحرمین نے، حضرت ام سلمہؓ کی اس فراست، تدبر اور اصابت رائے کے متعلق بالکل بجا فرمایا ہے کہ اصابت فکر و رائے کی ایسی شاندار مثال ڈھونڈھنے سے کہیں تاریخ میں نہیں ملتی ہے[17] اور امر واقعہ بھی یہی ہے۔ اگر خدانخواستہ لوگ عدم تعمیل حکم نبویؐ پر قائم رہتے تو ان کے ایمان کا حشر کیا ہوتا؟ ان کا انجام کیا ہوتا؟ اور یہ کوئی معمولی لوگ نہ تھے۔ ان میں کیسے کیسے جلیل القدر صحابہؓ شامل تھے۔!

حضرت ام سلمہؓ کو دینی معاملات میں بھی بڑی بصیرت حاصل تھی، انھوں نے فتوے کم دیئے، لیکن جو فتوے دیئے وہ ایسے جامع و مانع ہیں کہ کسی پہلو سے ان پر ردّ وقدح نہیں ہو سکتی، جیسا کہ علامہ ابن قیمؒ نے بیان کیا ہے[18]

عورت کی انفرادیت اور شخصیت کے تحفظ کا اندازہ اس حدیث سے ہو سکتا ہے:

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک کنواری لڑکی نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اور عرض کیا کہ میرے والد نے میرا نکاح کر دیا، جسے میں پسند نہیں کرتی۔

نبی صلعم نے اسے اختیار (فسخ) نکاح دے دیا[19]

اسلام نے کنواری لڑکی تک کو یہ حق دیا ہے کہ اگر والدین اس کی شادی خلاف مرضی کر دیں تو وہ قاضی کی عدالت میں اس نکاح کو فسخ کر سکتی ہے۔

اسلام کے عورت پر بے شمار احسانات ہیں۔ انہی میں ایک یہ عظیم و جلیل احسان بھی ہے، جسے مسلمانوں نے "ناک" کے خیال سے غصب کر رکھا ہے گویا ان کی ناک اسلام سے بڑی ہے۔

عورت کے اختیارات اپنے حالات پر: عورت کو اپنی شخصی اور ذاتی زندگی سے متعلق جو اختیارات و حقوق حاصل ہیں، بہت واضح ہیں:

سنن اربعہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، یتیم بچی کے متعلق اس کا اذن طلب کیا جائے، اگر وہ خاموش رہے تو یہی اس کا اذن ہے، اور اگر انکار کر دے تو پھر اس کا نکاح جائز نہیں ہوگا۔

یتیموں کی بے بسی اور کس مپرسی اظہر من الشمس ہے۔ اور یتیم لڑکی تو ہر معاشرہ میں ایک ایسی پونجی ہوتی ہے جس پر ہر ہر شخص کی پوری دسترس ہوتی ہے۔

لیکن اسلام نے یتیموں کا خاص خیال رکھا ہے۔ نہ صرف ان کے حقوق کی پوری نگہداشت کی ہے، ان پر ظلم و زیادتی کو روکا ہے، اور انھیں وہی حقوق و مراعات عطا کیے ہیں جو دوسروں کو حاصل ہیں اور خاص طور پر یتیم لڑکی کے بارے میں تو اس کے احکام اور زیادہ سخت ہیں، چنانچہ نکاح کے بارے میں اس پر کوئی تعدی نہیں ہو سکتی، وہ آزاد ہے، اس کا نکاح صرف اس کی مرضی اور اجازت سے ہو سکتا ہے۔

ایک آدمی نے ایک عورت سے نکاح کیا۔ مگر مہر مقرر نہیں کیا۔ خلوت کی، اور فوت ہو گیا۔ آپؐ نے فیصلہ فرمایا کہ عورت کے لیے مہر مثل ہوگا۔ نہ افراط ہوگی نہ تفریط، اس کا میراث میں حصہ ہے اور اس پر چار ماہ دس دن کی عدت بھی لازم ہے۔

سنن اور مصنف میں حضرت سعدؓ بن حبیب کی بصرہ بن اکثم سے روایت ہے کہ میں نے ایک عورت سے جو باکرہ تھی نکاح کیا، میں نے خلوت کی تو معلوم ہوا وہ حاملہ تھی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، چونکہ تم نے اس سے خلوت کی ہے اس لیے مہر دینا پڑے گا، پھر دونوں میں تفریق کرادی۔

"خاندانی منصوبہ بندی" کا چرچا آج کل عام ہے، عرب بھی جب اولاد کے خواہاں نہیں ہوتے تھے تو اس پر عمل کرتے تھے۔ آپؐ نے اس کی ممانعت تو نہیں فرمائی لیکن رضامندئ طرفین کو ضروری قرار دیا۔

سنن احمدؒ اور سنن ابن ماجہؒ میں حضرت عمرؓ خطاب کی حدیث ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد عورت، (یعنی باندی نہ ہو) کی اجازت کے بغیر اس سے عزل کرنے کو منع فرمایا ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا۔

صحیح بخاری میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اور عرض کیا۔ اے اللہ کے رسولؐ! ثابت بن قیس کے اخلاق اور دین میں مجھے کوئی عیب نظر نہیں آتا، لیکن اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں (یعنی ان کے دین میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں، لیکن میرا دل ان سے نہیں ملتا، لہٰذا خطرہ ہے کہ اس چیز کے باعث میرا دین خطرے میں پڑ جائے)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! کیا تم اس کا باغ (جو مہر میں ملا تھا) واپس کر دو گی؟

انھوں نے عرض کیا، جی ہاں کر دوں گی؟

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثابتؓ! باغ قبول کر لو، اور اسے طلاق دے دو،![21]

عورت کے اجلال و احترام کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ شوہر اگر بغیر گواہ کے بیوی پر قسم کھا کر بدچلنی کا الزام لگائے، اور بیوی قسم کھا کر انکار کرے اور دونوں جھوٹے پر لعنت کریں، تو دونوں میں تفریق کرادی جائے گی۔

حضرت ابن عباس رضؓ کا قول ہے کہ لعان کرنے والوں کے مابین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تفریق کرا دی اور فیصلہ فرما دیا کہ اب شوہر بچہ کا دعوی نہیں کر سکتا۔ نہ عورت پر زنا کی تہمت لگا سکتا ہے۔ اگر ایسا کرے گا تو سزا پائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی لڑکے کو متہم کرے گا تو وہ بھی سزا پائے گا۔

آپؐ نے یہ بھی فیصلہ فرما دیا کہ اب شوہر کے ذمہ عورت کی سکونت اور نفقہ واجب نہیں رہا، کیونکہ دونوں میں افتراق بغیر طلاق کے واقع ہوا ہے۔

سہل رضؓ کا قول ہے کہ عورت کے بطن سے جو لڑکا پیدا ہوگا، وہ اپنی ماں سے منسوب ہوگا، اس کی جائداد کا وارث بھی ہوگا وہ بھی بیٹے کی وارث بننے کا حق رکھے گی۔

لعان کے نتیجہ میں تفریق کے بعد یہ دونوں مرد، عورت پھر کبھی بھی میاں بیوی نہیں بن سکتے۔

بچے پر باپ سے زیادہ ماں کا حق ہے: ابو داؤد نے اپنی سنن میں عبداللہ رضؓ بن عمرو کی حدیث درج کی ہے کہ ایک عورت آپؐ کے پاس آئی اور عرض گذار ہوئی:

"یا رسول اللہ! یہ میرا لڑکا ہے، میرا پیٹ اس کا برتن ہے، میرے پستان اس کا مشکیزہ ہیں۔ میری گود اس کے لیے جائے امان ہے، اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے، اور اب وہ مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے فرمایا:

"اس لڑکے کی پرورش کرنے کی تو زیادہ حقدار ہے، جب تک دوسرا نکاح نہ کر لے۔"

شوہر اگر بیوی کے مصارف برداشت نہیں کر سکتا تو قاضی کو حق ہے کہ تفریق کرا دے۔

دار قطنی میں سعیدؓ بن المسیب کی روایت ہے، اگر کوئی شخص اپنی بیوی کا

نفقہ ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اس صورت میں ان دونوں کے درمیان تفریق کرادی جائے گی۔

حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت کردہ ایک حدیث بھی اسی مفہوم و معنیٰ پر دلالت کرتی ہے۔

سعید بن منصور نے اپنی سنن میں کہا ہے کہ ہم سے سفیان نے، انھوں نے ابوزناد سے روایت کی کہ انھوں نے ایک مرتبہ سعیدؓ بن مسیب سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا، جو اپنی بیوی کا نفقہ ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا کہ آیا ان دونوں میاں بیوی میں تفریق کرادی جائے گی؟

انھوں نے کہا: "ہاں"[۲۲]

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ بھی علم و فضل، فہم و فراست، دقت نظر اور اجتہاد میں اپنی مثال آپ تھیں، اگر ام المؤمنین رضؓ نہ ہوتیں تو تفسیر، حدیث، فقہ اور اجتہاد کے بہت سے گوشے تشنہ رہ جاتے[۲۳]

اس کے علاوہ بھی زندگی کے دوسرے سودمند اور مفید مشاغل میں مسلمان خواتین مصروف و منہمک رہتی تھیں، تجارت اور کاروبار کرتی تھیں[۲۴] اور علاج کرتی تھیں، بلکہ فصادی اور نشتر زنی بھی کرتی تھیں، ادب اور شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتی تھیں[۲۵]

عہدِ ابوبکر صدیق رضؓ میں جب مسیلمہ سے جنگ ہوئی تو حضرت ام عمارہ رضؓ صحابیہ نے بھی اس میں شرکت کی، کئی زخم کھائے اور ایک ہاتھ گنوا بیٹھیں[۲۶]

قبرص پر جب مسلمانوں نے ۲۸ھ میں حملہ کیا، تو حضرت ام حرام بھی اس میں شریک تھیں[۲۷]

حضرت عمر رضؓ کے عہد خلافت میں حضرت خالدؓ بن ولید نے جنگ کے ایک موقع پر مسلمان خواتین میں ہتھیار تقسیم کیے، اور انھیں تاکید کی کہ خبردار، دشمن کا کوئی سپاہی ادھر آئے تو زندہ نہ جانے پائے[۲۸]

غزوۂ اُحد میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زخمی ہونے کی اطلاع حضرت فاطمہؓ کو ملی تو انھوں نے میدانِ جنگ کا رُخ کیا۔ زخم دھویا، جب خون کسی طرح بند نہ ہوا تو کھجور کی خاکستر زخم پر رکھی تب جریانِ خون کا سلسلہ رُکا۔[29]

عورتوں کا جنازہ اس طرح لحد کی طرف لے جایا جاتا تھا، جس طرح مردوں کا، حضرت فاطمہؓ کو اس میں بے حرمتی کا پہلو نظر آیا۔ چنانچہ انھوں نے اسماءؓ بنت عمیس سے ذکر کیا۔ تو انھوں نے تجویز پیش کی کہ کھجور کی شاخیں تابوت پر لگائی جائیں، اور ان پر کپڑا ڈال دیا جائے، حضرت فاطمہؓ نے جیساکہ استیعاب میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ تجویز بہت پسند فرمائی، جب سے عورت اور مرد کے جنازے میں امتیاز رکھا جانے لگا۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں جنگِ یرموک برپا ہوئی، اس میں بھی خواتین نے شرکت کی، جن میں متعدد جلیل القدر صحابیاتؓ بھی شامل تھیں، ایک انصاری خاتون اسماءؓ بنت یزید نے تو صرف چوب خیمہ سے کئی رومیوں کو ہلاک کر ڈالا۔[30]

حضرت عمرؓ کا بیان : "عہدِ جاہلیت میں ہم عورتوں کو ذرّہ برابر بے مقدار سمجھا کرتے تھے، قرآن میں ان کے متعلق آیات نازل ہوئیں تو ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔"[31]

اور پھر اس کے بعد فاروقِ اعظمؓ کا طرزِ عمل یکسر بدل گیا، چنانچہ شاید وہ خلفائے راشدینؓ میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ایک صحابیہؓ حضرت شفاءؓ بنت عبداللہ سے کتنی بار مہمات امور میں مشورہ لیا، اور کئی مرتبہ انھیں بازار کی نگرانی کا کام بھی سونپا۔[32]

فقہ کی کتابوں میں بھی عورت کے حقوق پر کافی بحث کی گئی ہے، اور ان کی تعیین کی گئی ہے، اور انھیں اسلام کی روح کو مدّنظر رکھتے ہوئے قبول کیا گیا ہے۔

ابن قیمؒ اور ابو حنیفہؒ کا مسلک: علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:
جب مرد اپنی بیوی سے بوقتِ نکاح وعدہ کرلے کہ وہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی نہ کرے گا، تو اس وعدہ کو پورا کرنا واجب ہے، اور اگر شادی کرلی تو پہلی بیوی کو فسخ نکاح کا حق حاصل ہے[۳۳]۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا رجحان یک زوجگی کی طرف تھا، وہ اسی کو مناسب سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے ایک مرتبہ خلیفہ مہدی سے کہا:
"مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی جابرؓ بن عبداللہ سے روایت پہنچی ہے کہ ایک بیوی والا سرور میں رہتا ہے اور دو بیویوں والا شرور کا شکار بنتا ہے۔ یہ روایت سُن کر امام صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے ساتھ جیسے اتفاق نہ ہو تجربہ کرکے دیکھ لے پھر جابرؓ ہی کا قول نقل کیا ہے، اور کہا ہے کہ ابراہیم کو شاید تجربے کا موقع نہ ملا، اور اس کے بعد کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو برتاؤ، عدل و انصاف کا اپنی بیویوں کے ساتھ تھا، کوئی وہ برتاؤ اگر نہ کرسکے تو، ظالموں میں شمار ہوگا۔ پھر وہ حدیث سنائی جس میں ہے کہ دو بیویوں کے ساتھ انصاف نہ کرنے والا، قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گا کہ ایک شق اس کے بدن کا ساقط ہوگا، امام صاحبؒ نے اس پر اور اضافہ کیا کہ ایک ہی بیوی پر قناعت چاہیئے اور اپنے لیے مَیں نے اسی مسلک کو اختیار کیا ہے، اور فرمایا۔ بے فکری اور سلامتی کے برابر کوئی چیز نہیں ہے، پھر عورتوں کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آنحضرت صلعم کے خطبۂ حجۃ الوداع کے ان الفاظ کو دہرایا کہ یہ عورتیں تمہارے ہاتھوں میں ہیں۔ پس ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتے رہنا۔ راوی کا بیان ہے کہ دیر تک امام صاحب اس مسئلہ پر گفتگو فرماتے رہے، لیکن مجھے بس اس قدر یاد رہ گیا۔

امام صاحبؒ کی پوری تقریر راوی کو یاد رہ جاتی تو تعدّدِ ازدواج کے مسئلہ میں مسلمانوں کے سب سے بڑے امام کا نقطۂ نظر دنیا کے سامنے آجاتا اور

پہلی صدی تک کے مسلمانوں کے خیالات کی وہ ایک تاریخی شہادت ہوتی۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں یورپ کی نکتہ چینیوں کے بعد مسلمانوں نے بنانی شروع کی ہیں، ان کا بہترین جواب امام صاحبؒ کا یہ بیان ہو سکتا ہے:

یک زوجگی کی تائید ائمہ فقہ کی طرف سے: حضرت امام ابو حنیفہؒ نے خلیفہ منصور اور اس کی بیوی کے درمیان تنازعہ کا فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا:

"امیر المومنین سنیے! ایک بیوی سے زیادہ عورتوں کی اجازت شریعت نے ایک شرط کے ساتھ دی ہے، یعنی ان ہی لوگوں کے لیے اجازت ہے جو عدل اور انصاف سے کام لے سکتے ہوں۔ اور اس کے بعد فرمایا:

قال اللہ تعالیٰ: فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً۔

لیکن جو انصاف سے کام نہ لے یا جسے اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کر پائے گا تو اس کو چاہیے کہ ایک عورت سے آگے نہ بڑھے، خدا نے قرآن میں فرمایا ہے: "کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی عورت سے نکاح پر قناعت کرو!

یہ ارشاد فرمانے کے بعد امامؒ منصور سے کہنے لگے ہمیں چاہیئے کہ اللہ کے بنائے ہوئے آداب کو اختیار کریں، اس کی نصیحتوں پر عمل کریں۔[۳۴]

ائمہ اربعہؒ میں سے ایک اور امام حضرت احمد بن حنبلؒ کا مسلک بھی امام صاحبؒ کے مسلک کے مطابق ہے، ان کے نزدیک بھی صرف ایک عورت سے شادی کرنا افضل ہے۔[۳۵]

حنابلہ کے نزدیک صرف ایک ہی عورت سے شادی کرنا مستحب (مسنون) ہے۔ ازواج زیادہ نہ ہوں۔ کیونکہ ایک سے زیادہ بیویوں کی صورت میں عدل نہ ہونے کا خدشہ ہے۔ جس سے شوہر حرام میں پڑ جائے گا۔[۳۶]

خارجی خواتین کی سیاسی قربانیاں: خارجی فرقہ فکری گمراہی میں خواہ کتنا ہی مبتلا رہا ہو، لیکن اس فرقے کے لوگ اپنے عقیدے کے لیے ہر قربانی

دینے کے لیے بڑی جرأت کے ساتھ ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔ یہی حال خارجی خواتین کا تھا۔

"خوارج بڑے بہادر تھے۔ جرأت اور ہمت ان کی گھٹی میں پڑی تھی، خارجی عورتوں نے بھی مختلف جنگوں اور لڑائیوں میں ہر طرح کے شدائد و مصائب کا بے جگری سے مقابلہ کیا، خارجی عورتوں کی جرأت و بہادری دیکھ کر زیاد کا غصہ بھڑک اٹھتا تھا، اسے اس بات کا بڑا صدمہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کہ مشرکہ عورتوں کے قتل کرنے سے منع کیا ہے تو مسلمان عورتوں کو کس طرح قتل کیا جائے؟

لیکن اس کی نظر میں خارجی عورتیں مشرکہ عورتوں سے کہیں بڑھ کر، ایک بڑا اور اہم خطرہ تھیں۔ یہ اپنے وجود سے خوارج کا حوصلہ بلند رکھتیں، ان میں جرأت پیدا کرتیں، ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک خارجی دس آدمیوں پر بھاری ہو جاتا، اور چونکہ اس فتنۂ عظیم کی سرکوبی لازمی تھی، لہٰذا عقوبت کے وہ تمام طریقے زیاد نے اختیار کیے، جن سے لوگ قبل ازیں ناواقف تھے۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ اگر کوئی خارجی عورت اس کے ہاتھ آئی تو اسے زیادہ سے زیادہ لرزہ خیز سزا دے گا۔

بلجاء خارجی عورتوں میں بڑے پایہ کی عورت تھی تعلیم یافتہ، متقی، عصمت مآب بہادر، ابو بلال کے پاس جو رئیس خوارج تھا، وہ اکثر آیا کرتی اور خارجی تحریک سے متعلق مشورہ کیا کرتی تھی۔

ایک روز ایک خارجی نے ابو بلال کو بتایا کہ ابن زیاد نے قسم کھائی ہے اور عزم کر لیا ہے کہ بلجاء اگر ہاتھ آگئی تو بڑی عبرت ناک سزا وہ اسے دے گا۔ یہ خبر سن کر حاضرین میں اضطراب پیدا ہو گیا، یہ اضطراب موت کی دہشت پر مبنی نہیں تھا، کیونکہ جس راستے پر وہ چل رہے تھے وہ موت ہی کا راستہ تھا، لیکن اس پر وہ تیار نہیں تھے کہ ان کی ایک ہم عقیدہ خاتون کی بے وقری زیاد اس طرح کرے کہ اسے قتل کر کے اور پھر ننگا کر کے سڑک پر ڈال دے۔ یہ بڑے عار کی بات تھی۔

ابو بلال بلجاء کے گھر گئے، اور اسے نصیحت کی کہ اب اسے پوشیدگی کے ساتھ کہیں اور چلے جانا چاہیے تاکہ زیاد کے لرزہ خیز مظالم کا نشانہ بننے سے محفوظ رہے لیکن بلجاء پر یہ سن کر کوئی دہشت طاری نہیں ہوئی۔ اس نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ کہا:۔ "اگر وہ ایسا کرے گا تو بدبخت ہو گا، اگر میں اس کے ہاتھ آجاؤں تو اسے حق حاصل ہے کہ جو سلوک چاہے کرے"۔

اور آخر کار بلجاء زیاد کے ہاتھ آئی۔ اس نے وہی کیا، جو کہا تھا، قتل کرایا، ہاتھ پاؤں کٹوائے، پھر کپڑے اتار کر لاش سڑک پر پھینکوا دی[۳۷]۔

مگر اس جری عورت نے آخر وقت تک کسی طرح کی کمزوری کا اظہار چشم و ابرو سے نہیں ہونے دیا اور پوری استقامت کے ساتھ جان دے دی۔

ماخذ:

۱ سورۂ بقرہ، رکوع ۲۸، آیت ۲۲۹، ۲ سورۂ بقرہ، رکوع ۲۴، آیت ۱۸۸

۳ سورۂ بقرہ، رکوع ۳، آیت ۳۳، ۳ الف صحیح بخاری کتاب الطلاق، عن ابن عباسؓ

۴ زاد المعاد، مطبوعۂ مصر (علامہ ابن قیمؒ) ج ۱، ص ۱۳۱۔

۵ ابن ہشام، ص ۸۴ ۶ صحیح بخاری، ابو داؤد، ج ۱، ص ۲۵۲۔

۷ زاد المعاد، مطبوعۂ مصر (علامہ ابن قیمؒ). ج ۱، ص ۳۰۱۔

۸ اسد الغابہ، ج ۵، ص ۵۶۳، ۹ صحیح مسلم، پارہ ۲، ص ۱۰۳

۱۰ اسد الغابہ ج ۵، ص ۵۱۹ ۱۱ مسند ابن حنبلؒ، ص ۱۱۲

۱۲ اصابہ فی احوال الصحابہ ج ۸، ص ۱۰۶، ۱۳ موطا امام مالک، کتاب النکاح

۱۴ سنن ابو داؤد، ج ۱، ص ۲۷۴، ۱۵ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۱۰۹

۱۶ زاد المعاد (علامہ ابن قیمؒ) (طبع مصر) ج ۲، ص ۲۲۱، ۲۲۲

۱۷ زرقانی (شرح موطا امام مالکؒ) ج ۳، ص ۲۷۱۔

۱۸ھ اعلام الموقعین (علامہ ابن قیمؒ) طبع مصر، ج ۴، ص ۵۱ -
۱۹ھ زاد المعاد (علامہ ابن قیمؒ) طبع مصر، ج ۴، ص ۵۱
۲۰ھ زاد المعاد (علامہ ابن قیمؒ) طبع مصر، ج ۴، ص ۵۶، ۵۷ - ۵۸، ۶۱، ۱۰۱ -
۲۱ھ صحیح بخاری کتاب الطلاق، عن ابن عباس -
۲۲ھ زاد المعاد (علامہ ابن قیمؒ) طبع مصر، ج ۴، ص ۲۶۵، ۲۸۷، ۳۰۶ -
۲۳ھ اعلام الموقعین (علامہ ابن قیمؒ) ص ۱۳ -
۲۴ھ اسد الغابہ، ج ۵، ص ۴۳۲، ۲۵ھ طبقات ابن سعد ج ۸، ص ۲۱۳
۲۶ھ ایضاً، ص ۳۰۴ ۲۷ھ صحیح بخاری، پارہ ۲۱، ص ۴۲۹ -
۲۸ھ ابن کثیر، ج ۵، ص ۸، ۲۹ھ صحیح مسلم، ذکر غزوۂ احد -
۳۰ھ اصابہ فی احوال الصحابہ، ج ۸، ص ۱۳ -
۳۱ھ فتح الباری شرح صحیح بخاری، ج ۸، ص ۵۰۴،
۳۲ھ اسد الغابہ، ج ۵، ص ۲۸۷، ۳۳ھ زاد المعاد، مطبوعہ مصر، ج ۴، ص ۱۰،
۳۴ھ امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی (مولانا مناظر احسن گیلانی) ص ۳۱۷
۳۵ھ الفقہ علی المذاہب الاربعہ، مطبوعہ مصر، ج ۴، ص ۱۰ -
۳۶ھ الفقہ علی المذاہب الاربعہ، مطبوعہ مصر، ج ۱، ص ۶۱۴ -
۳۷ھ تاریخ خوارج (عمر ابو النصر) مطبوعہ بیروت، ص ۱۰۳، ۱۰۵ -

---

(۹)

تنقید اور آزادئ گفتار

احتساب، اختلاف، حزبِ اختلاف،

انسان معصوم نہیں ہے۔ اس سے غلطیاں ہو سکتی ہیں، لیکن اگر وہ حاکم ہے، یا فرماں روا ہے، یا سربراہِ مملکت ہے تو اس سے سنگین تر غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں۔ یہ غلطیاں ملک و ملت کے لیے پیامِ ہلاکت بھی بن سکتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ حاکم اور فرماں روا اپنے مشیر رکھتا ہے جو اسے مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ مگر عام طور پر ان کے مشوروں میں زور نہیں ہوتا، اس لیے کہ ماتحت ہوتے ہیں اور ان کے مشورے کچھ بہت زیادہ مکمل بھی نہیں ہوتے، وضع احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ خوشنودئ مزاج کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کچھ اپنے مستقبل اور عافیت کی بھی فکر ہوتی ہے، یہ کبھی بھی صورتِ حالات کا صحیح نقشہ پیش کرنے کی جرأت نہیں کر پاتے، اس لیے کہ حاکم یا فرماں روا اگر باجبروت ہو، اور ہمہ گیر اقتدار و اختیار کا حامل ہو تو اس کے سامنے لب کشائی ہی بھی مشکل۔ مزید یہ کہ ایسے لوگ خود بھی شریکِ اقتدار ہوتے ہیں اور اقتدار کا تحفظ کون نہیں چاہتا؟

لیکن ملک و ملت کی فلاح اور سود و بہبود کا تقاضا ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہوں، جو اتنی اخلاقی جرأت رکھتے ہوں کہ اندیشۂ سود و زیاں، بلکہ جان و تن سے بے نیاز ہو کر حاکم یا فرماں روا کی غلطیوں پر اسے ٹوک سکیں، اس

پر بے محابا تنقید کر سکیں ۔ اس کے افکار و خیالات اور اقدام و عمل سے اختلاف کر سکیں ۔ ایک جماعت بنا کر، اس کی غلط پالیسی اور غلط روش کی اصلاح کے لیے مفید اور تعمیری تجاویز پیش کر سکیں ۔ حکومت کے استحکام اور پائیداری میں اختلاف اور تنقید کو بہت زیادہ دخل ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ جدید کی "جمہوریت" کا ایک لازمی عنصر پریس کی آزادی، حریتِ گفتار، آزادیِ اختلاف، اور حزبِ اختلاف کا قیام ہے ۔ "تصویر کا دوسرا رُخ" صرف یہیں نظر آسکتا ہے چنانچہ موجودہ دور میں جو جمہوریتیں مختلف ممالک میں قائم ہیں وہ فخر و تعلّی کے ساتھ اعلان کرتی رہتی ہیں کہ ہمارے ہاں پریس آزاد ہے ۔ نکتہ چینی کے حق پر کوئی پابندی نہیں ۔ حزبِ اختلاف کا ہم احترام کرتے ہیں ۔ اس کی تجویزوں اور مشوروں کی قدر کرتے ہیں، اور یہ دعویٰ غلط بھی نہیں، واقعی ایسا ہوتا ہے، اور جہاں کہیں بھی یہ جنس گراں بہا موجود ہے، اس پر فخر کرنے کا حق یقیناً اس حکومت کو حاصل ہے ــــ یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک ہے ۔

لیکن مڑ کر جب ہم ماضی کی طرف نظر ڈالتے ہیں، تو وہ "عہدِ مظلمہ" نظر آتا ہے ۔ جہاں حکومت کو غیر مشروط اور غیر مسئول طور پر ہر قسم کے انتظامی اور تعزیری اختیارات حاصل تھے ۔ اور کسی کو مجال دم زدن نہیں تھی، بدقسمتی سے عام طور پر یہی رائے اسلام اور عہدِ اسلام اور مسلمان سلطنتوں کے بارے میں بھی قائم کر لی گئی ہے ۔ سمجھ لیا گیا ہے کہ اسلام حریتِ گفتار و افکار کو اہمیت نہیں دیتا، نہ حکومت کے اقدام و عمل پر نکتہ چینی کو مستحسن قرار دیتا ہے، اور امیر یا خلیفہ یا امام، یا حاکم کے خلاف تو وہ ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا ۔

لیکن امرِ واقعہ یہ نہیں ہے ۔

حریّتِ افکار و گفتار: اسلام نے جتنی زیادہ حریتِ افکار و گفتار دی ہے، دنیا کا کوئی مذہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلمان فرماں رواؤں کو عام اس سے کہ وہ اپنے وقت کے کیسے ہی متقی،

سفاک، درندہ خو، فرماں روا رہے ہوں، نتائج سے بے پرواہ ہو کر معمولی آدمیوں نے ٹوکا ہے، سرزنش کی ہے، ہدف تنقید بنایا ہے، اور اختلاف کا اظہار کیا ہے اس کی مثال کوئی دوسری قوم نہیں پیش کر سکتی، بلکہ اپنے صالحین تک کو، ٹوکنے اور ہدف تنقید بنانے میں مسلمانوں نے تامل نہیں کیا، حد یہ ہے کہ اپنے نبیؐ (فدا کا ابائنا و امہاتنا) اور اپنے خلفائے راشدینؓ تک کو ٹوکا، اختلاف کیا، اور احتساب کیا ہے، اور یہ نتیجہ تھا قرآن کی تعلیمات اور اسوۂ نبیؐ کا۔

منکر کی مزاحمت: قرآن نے نہایت صفائی کے ساتھ ترغیب دی ہے کہ "منکر" کی مزاحمت کی جائے، غلطی پر ٹوکا جائے۔ اور جہاں خدا کا گناہ ہوتا ہو، وہاں مخلوق کی (خواہ وہ کتنی ہی عظیم و جلیل کیوں نہ ہو) پرواہ نہ کی جائے۔

خدا کا گناہ صرف یہی نہیں ہے کہ اگر حاکم نماز سے روکے تو اس کی اطاعت سے انحراف کیا جائے، یا مسجد کے دروازے پر تالا لگا دے تو اس کی مزاحمت کی جائے، خدا کی معصیت یہ بھی ہے کہ اگر عدل نظر انداز کیا رہا ہو، تو آوازِ حق بلند کی جائے، اس لئے کہ خدا نے عدل کا حکم دیا ہے، اگر شوریٰ کو نظر انداز کیا جا رہا ہو تو اسے قائم کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ اس لیے کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہے۔ اگر منکرات کی گرم بازاری ہو تو خاموش نہ رہا جائے، اس لیے کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہے۔ حق اگر نظر انداز کیا جا رہا ہو تو اس پر سکوت اختیار کرنا خاموشی سے اسے گوارا کر لینا، معصیت ہے، کیونکہ خالق کی معصیت میں مخلوق کی فرماں برداری جائز نہیں۔

البتہ اس سلسلے میں دو۲ امور، خاص طور پر توجہ طلب ہیں:

۱۔ تنقید و اختلاف، فتنہ و فساد تک منجر نہ ہو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قتل سے بھی زیادہ سنگین قرار دیا ہے۔ "الفتنۃ اشد من القتل"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اختلاف و احتساب تعمیری ہونا چاہیے، نہ کہ منفی اور تخریبی، یا فساد انگیز۔

۲۔ اختلاف و احتساب کے معنی بغاوت کے نہیں ہیں!

حاکم یا حکومت کی رائے اور پالیسی سے اختلاف کرنا، دوسری چیز ہے۔ اور اس کے خلاف مورچہ سنبھال لینا بالکل جدا چیز ہے اور ان دونوں میں کسی طرح کی مطابقت نہیں ہے۔

ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے، جب حاکم یا حکومت کے خلاف بغاوت و خروج وقت کا فریضہ بن جاتا ہے۔ اس میں شریعت نے یہ اصول مرعی لکھا ہے کہ:

اصلاح احوال کی ساری تدبیریں ناکام ہو چکی ہوں۔

اتمام حجت ہو چکا ہو۔

سوال مسلمانوں میں کفر و اسلام کا پیدا ہو گیا ہو۔

اس صورت میں بھی خروج و بغاوت کے کچھ قیود و شروط ہیں، جن کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔

کلام اللہ سے استشہاد: ہم سب سے پہلے کلام اللہ کو لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر ويقيمون الصلوٰة ويؤتون الزكوٰة ويطيعون الله ورسوله اولٰئك سيرحمهم الله ان الله عزيز حكيم ○

یعنی مومن مردوں اور عورتوں کی کیفیت یہ ہے کہ اچھے کاموں میں ایک دوسرے کا رفیق ہے (یہ لوگ) "معروف" (بھلائی) کا حکم کرتے اور "منکر" میں آڑے آتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے اطاعت گذار ہیں۔ یہ لوگ ہیں جو بہت جلد اللہ کے سایۂ رحمت میں آئیں گے بلاشبہ خدا غالب اور حکمت والا ہے۔[1]

لیکن یہ امر بالمعروف کیا ہے؟ نہی عن المنکر سے کیا مقصود ہے؟

ظاہر ہے اس سے مقصد نعوذ باللہ فتنہ انگیزی تو نہیں ہو سکتا کہ جو راہ چلتا نظر آیا اسے "معروف" کا حکم دینا شروع کر دیا، اور جو بھی غلط راستہ پر چلتا نظر آیا اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے

باہم دگر بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اپنے حدود و شرائط کے ساتھ اچھی چیز ہے، لیکن یہ ایسی چیز ہے جو ویسے بھی لوگ کرتے ہی رہتے ہیں۔ بھلائی کی ترغیب دیتے ہیں۔ برائی سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن قرآن حکیم میں اس زور اور شدت کے ساتھ اس کا جو بیان ہوا ہے، اس میں اصل مقصد وہ ہے جس سے عام طور پر لوگ گھبراتے اور خوف کھاتے ہیں۔ اور وہ مقصد ہے، حکومت اور ارباب حکومت کو اچھے اور صحیح کاموں کو بروئے کار لانے پر آمادہ کرنا اور اس کی سعی و کوشش کرنا، غلط اور ضرر رساں کاموں سے روکنا اور ان پر ٹوکنے کا اپنے اندر حوصلہ پیدا کرنا کہ سماج کی فلاح، قوم کی بہبود، ملک کی ترقی ملت کے فروغ کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ "حکومت" اچھی ہو، حکومت اگر اچھی ہو گی تو بہت سے مفاسد کا از خود قلع قمع ہو جائے گا، بصورت دگر وہ ان سے اچھی طرح نمٹ لینے پر قادر نہ ہو گی، اور حکومت کے اچھے ہونے کی پہلی اور آخری شرط یہ ہے کہ تصویر کے دونوں رخ اس کے سامنے ہوں، صرف ایک حسب دل خواہ رخ سامنے رکھ کر وہ کامیاب نہیں ہو سکتی اور یہ دوسرا رخ صرف وہی لوگ سامنے رکھ سکتے ہیں جو حکومت میں نہ ہوں، جو اقتدار و اختیار کے حامل نہ ہوں جو سچائی اور دیانت داری کے ساتھ حکومت کو ٹوکتے اور روکتے رہیں، اور اپنی تعمیری تنقید سے اس کی رہنمائی کرتے رہیں۔

چند اہم نکتے متعلق بہ آیت کریمہ: اس آیۃ کریمہ میں تلاوت کے وقت کئی نکتے میرے ذہن میں آئے جنھیں بغرض فکر و غور پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں

ا: اس آیت میں اللہ و رسول کے ساتھ "اولی الامر" کی اطاعت کا ذکر نہیں ہے، کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایسی چیز نہیں ہے جسے حکمران

قوت بخوشی قبول کرلے وہ اس پر ناخوش ہوسکتی ہے اور اپنی ناخوشی کا طرح طرح سے مظاہرہ کرسکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود، یہ فریضہ سرانجام دینا چاہیے اس لیے کہ اس کا انجام دینا، اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کرنا ہے۔

۲ : اس آیۂ کریمہ میں فرمایا جاتا ہے کہ ایسے لوگ بہت جلد اللہ تبارک وتعالیٰ کے سایۂ رحمت میں آجائیں گے۔ یعنی ممکن ہے دنیا انھیں کچھ نہ دے لیکن آخرت میں ان کے لیے رحمتِ الٰہی کشادہ آغوش نظر آئے گی، کیونکہ انھوں نے اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کرتے ہوئے اپنا فریضہ ادا کیا۔ نہ لومۃ لائم کی پرواہ کی، نہ اقتدار و اختیار کی، نہ تعزیر و عقوبت سے خوف زدہ ہوئے۔

۳ : تیسرا بہت ہی لطیف نکتہ یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے، "خدا غالب" ہے! اس موقع پر اللہ نے اپنے لیے "عزیز" (غالب) کا جو لفظ استعمال فرمایا ہے وہ حد درجہ معنی خیز ہے۔ یعنی اس فریضے کو انجام دینے میں ہزاروں رکاوٹیں ہوں، دشواریاں ہوں، قوت، دولت، شوکت اور دوسرے وسائل و ذرائع اقتدار ہمالیہ کی طرح بلند اور بوجھل کیوں نہ ہو، لیکن جو لوگ یہ فریضہ بجالاتے ہیں انھیں ہراساں اور سہمگیں ہونے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ سب سے زیادہ قوت و شوکت والا اور سب پر غالب تو خدائے عزوجل ہے۔ اگر اس کی خوشنودی منظور ہے اور اس کی اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت مقصود ہے تو ایک فلاحی ریاست قائم کرنے کے لیے تمھیں یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ لوگوں کی جبینِ پرشکن نہ دیکھو، آسمان کی طرف دیکھو، اور فاطر السمٰوات والارض کی قوت اور غلبے کا اندازہ لگاؤ، پھر تم بے فکری کے ساتھ اپنا کام انجام دے سکو گے، لیکن یہ کام لوث، اغراض اور جلبِ منفعت اور بالواسطہ حسنِ طلب یعنی تمنائے جاہ و اقتدار سے پاک ہونا چاہیے۔

۴ : پھر فرمایا اللہ "حکیم" یعنی حکمت والا بھی ہے، اس میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ اگر تم سچائی اور دیانت کے ساتھ کام کر رہے ہو اور فلاحی ریاست

قائم کرنا چاہتے ہو، اور اپنے انا، اپنے نفس، اپنی خواہشات اور تمناؤں کو قربان کر کے اس مقصدِ عظیم کے حصول میں لگے ہوئے ہو تو، یاد رکھو، اللہ حکمت والا ہے، وہ ایسے حالات پیدا کر سکتا ہے کہ مایوسی کی تاریکی امید کی روشنی سے جگمگا اٹھے اور تمہارا مقصدِ عظیم پورا ہو جائے۔

میں نے زیادہ تفصیل سے اس آیۂ مبارکہ پر گفتگو کی ہے، جب بھی میں نے اس کی تلاوت کی ہے۔ مجھ پر یہی حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ اس مفہوم و معنی کی دوسری آیات بھی ہیں، جن میں سے چند کا حوالہ میں نے ماخذ میں دے دیا ہے۔

احادیث نبویؐ سے استشہاد: قرآن کریم کے بعد اب ہمیں ایک نظر احادیث نبویؐ پر بھی ڈال لینی چاہیئے اور دیکھنا چاہیے کہ اس باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کیا ہے؟

"عن ابی سعید الخدری افضل الجہاد کلمۃ عدل عن سلطان جائر۔"

یعنی ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سب سے افضل جہاد جور پیشہ حکمران کے سامنے کلمۂ عدل کہنا ہے!"[۹۲]

نیز فرمایا:

"ان رجل سال النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقد وضع رجلہ فی الغرز، ای الجہاد افضل؟ قال کلمۃ الحق عن سلطان جائر"

یعنی ایک شخص نے کہ اس کا پاؤں کٹا ہوا تھا پوچھا: "سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "حکمران جور پیشہ کے سامنے سچی بات کہنا!"[۹۳]

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ان الدین نصیحۃ ان الدین نصیحۃ۔"

یعنی دین نصیحت ہے، دین نصیحت ہے۔"

"قیل لمن یارسول اللہ؟ قال للہ، ولکتابہ، ولرسولہ ولائمۃ المسلمین ولعامتھم۔!"	عرض کیا گیا: "کس کے لیے یارسول اللہ!" فرمایا: "اللہ کے لیے، اس کی کتاب (قرآن) کے لیے، اس کے رسولؐ کے لیے، مسلمان حکمرانوں کے لیے، اور عامۃ المسلمین کے لیے!"

اختلاف اشیاء سے نصیحت بھی مختلف صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پس نصیحت برائے یزداں کا مطلب یہ ہے، اس کی ظاہری و باطنی طاعت، اس کے غصے سے بچنا، نیکوکاروں سے محبت، بدکاروں سے نفرت!

نصیحت برائے کتاب (قرآن) کا مطلب یہ ہے کہ اسے سمجھ کر پڑھا جائے اچھی طرح تلاوت کی جائے؛

نصیحت برائے رسولؐ کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی حاضر و غائب دل و جان سے طاعت کی جائے، اور جادۂ سنت سے انحراف نہ کیا جائے۔

اور نصیحت برائے ائمہ (فرماں روا) سے مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اپنے فرائض بجا طور پر انجام نہ دیں تو انھیں تنبیہ کی جائے، غلط راستے پر چلیں تو ٹوکا جائے جس بات کو نہ جانتے ہوں، وہ بتائی جائے، اگر برائی کا ارادہ کریں تو روکا جائے ان کے مقرر کردہ عمال و حکام کی سیرت و کردار سے انھیں آشنا کیا جائے، عوام کے حالات و شکایات ان تک پہنچائے جائیں۔

نصیحت برائے عامۂ مسلمین کا مطلب یہ ہے کہ بڑوں سے توقیر اور چھوٹوں سے رحمت کا برتاؤ کیا جائے، ان کی مصیبت دور کی جائے، ان کے ضروریات و حوائج پورے کیے جائیں۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"من رأی منکرا فلیغیرہ بیدہٖ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذٰلک	یعنی تم میں سے اگر کوئی شخص کوئی امر منکر کسی سے سرزد ہوتے دیکھے تو چاہیے کہ اسے بزورِ قوت دور کر دے؛ اگر اس کا سر و سامان

وذلک اضعف الایمان"۔ نہ ہو تو زبان سے، اور اگر یہ بھی بس سے باہر ہو تو پھر دل سے، اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے"

اس حدیث میں بزورِ قوت منکر کو دور کرنے کا ارشاد جس کی طرف ہے۔ وہ حکمرانِ وقت ہے۔ زبان سے کام لینے کا جنھیں حکم دیا ہے وہ حکومت کے بے لوث اور مخلص نکتہ چین ہیں، اور اگر یہ بھی بس سے باہر ہو تو اسے ایمان کا ضعیف ترین درجہ قرار دیا ہے۔

عزیمت و رخصت: اسلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے، کہ انسان کے ظرف سے زیادہ اس کا امتحان نہیں لیتا، اسی لیے ہمارے ہاں عزیمت و رخصت کی اصطلاحیں وجود میں آتی ہیں۔ عزیمت یہ ہے کہ —— بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق —— اور رخصت یہ ہے کہ اگر کسی میں یہ حوصلہ نہیں تو بُرے کو بُرا سمجھتا رہے، یعنی اس کا معاون اور آلۂ کار نہ بنے، آدمی تنقید و اختلاف کا فریضہ انجام نہ دے تو بھی بُرے کو برا سمجھنا آخر کار نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے، کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی وقت —— خونِ ابراہیم آ جاتا ہے آخر جوش میں!

اسی طرح ایک موقع پر ارشاد ہوا:۔

"لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق" جس بات میں خدا کی نافرمانی ہو، اس میں کسی بندے کی اطاعت نہ کرو"

ظاہر ہے جب امرِ معصیت میں مخلوق کی طاعت جائز نہیں تو اس سے اختلاف کا اظہار اشد ضروری ہے، اور معصیت کی وسعتِ حدود پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔

اسوۂ خلفائے راشدین: اب خلفائے راشدین پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبے میں فرمایا:

"میں تو معمولی انسان ہوں، پس اگر مجھے راہِ راست پر چلتا پاؤ تو پیروی کرو، کج راہ پاؤ تو سیدھا کر دو"۔

یہ دنیا میں بالکل پہلی مثال ہے کہ ایک فرماں روا اپنی "رعایا" کو ترغیب دے رہا ہے کہ اس کا احتساب کرتی رہے، اس پر کڑی نظر رکھے؛ اسے راہِ راست پر گامزن پائے تو اطاعت کرے، کج رو پائے تو سیدھا کر دے۔

"سیدھا کر دو" کی بلاغت قابلِ غور ہے، اس میں احتساب سے لے کر عزل تک کیا نہیں آجاتا؟

حضرت عمرؓ کا قول ہے: "خدا اس شخص پر رحم کرے جو میرے عیوب سے مجھے مطلع کرتا ہے"۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کو مخاطب کرتا ہوا (جب وہ تقریر کر رہے تھے) ایک شخص اٹھا اور گویا ہوا

"اے عمرؓ! خدا سے ڈر!"

بعض لوگوں کو یہ بات ناگوار گذری، انھوں نے اس شخص کو خاموش کرنے کی کوشش کی۔

آپؓ نے فرمایا: "اسے بولنے دو، اگر یہ لوگ ہمیں نہ ٹوکیں تو پھر ان کا فائدہ؟ اور ہم ان کی نہ سنیں تو ہماری ضرورت؟

اسی طرح ارضِ سواد کی تقسیم و عدم تقسیم کے موقع پر حضرت عمرؓ کو انتہائی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، بعض لوگوں نے تو درشت اور سخت الفاظ بھی استعمال کیے، لیکن آپؓ نے صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، اگر کچھ کہا تو یہ کہ:

"تمھاری طرح میں بھی ایک فردِ امت ہوں، تم سے جو کچھ چاہتا ہوں بس یہ ہے کہ میرے بارِ امانت میں میرا ساتھ دو۔"

احتساب و اختلاف کے احترام کی یہ مثال کتنی شاندار ہے؟

حضرت عثمانؓ ذوالنورینؓ کے عہد میں فتنوں کا یہ عالم تھا کہ زمین سے اُبلتے تھے، اور آسمان سے برستے تھے۔ مروانؔ وغیرہ نے امیر المومنین کو

صحیح حالات سے بے خبر رکھ کر خود فائدہ اٹھایا، اور اسلام اور امت اسلامیہ کو شدید نقصان پہنچایا۔

حضرت عثمانؓ کے بارے میں شکایات لے کر ایک مجمع حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ آپؓ حضرت عثمانؓ سے گفتگو کر کے انھیں سمجھائیں، چنانچہ آپ حضرت عثمان کے پاس تشریف لے گئے۔ اور وہاں جا کر فرمایا:

"لوگ میرے پیچھے آرہے ہیں، انھوں نے مجھے اپنے اور آپ کے مابین سفیر بنایا ہے، لیکن خدا کی قسم میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ سے کیا کہوں؟ میں کوئی ایسی بات نہیں جانتا، جس سے آپ ناواقف ہوں، نہ میں کسی ایسے امر کی طرف آپؓ کی رہنمائی کر سکتا ہوں جسے آپ نہ جانتے ہوں، جو آپ جانتے ہیں، وہی ہم جانتے ہیں۔ کسی بات میں ہم آپ پر سبقت نہیں رکھتے کہ اس سے آپ کو باخبر کریں۔ نہ کسی بات میں ہم آپ سے جدا ہوئے کہ اب آپ کو وہ بتا دیں جس طرح ہم نے دیکھا اسی طرح آپ نے دیکھا، جس طرح ہم نے سنا اسی طرح آپ نے سنا، جس طرح ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت سے مشرف ہوئے، اسی طرح آپ بھی ہوئے، ابو بکرؓ و عمرؓ بھی عمل حق پر عمل کرنے میں آپ سے زیادہ سزاوار نہیں تھے۔ کیونکہ بہ اعتبار قرابت آپؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونوں کے مقابلہ میں قریب تر ہیں۔ بلاشبہ آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی کا شرف و مرتبہ حاصل کیا ہے جو انھیں نہیں ملا ہے۔ پس اپنے بارے میں خدا سے ڈریئے، کیونکہ خدا کی قسم! آپ ایسے نہیں ہیں کہ کوری سے آپ کو بینا کیا جائے اور جہالت سے آپ کو دانا بنایا جاتے۔ بلاشبہ خدا کا راستہ آشکار، اور نشان دین قرآن؛ عترت رسول برپا و برقرار ہے، پس اگر آپؓ غفلت کے شکار ہیں تو جان لیجیے، خدا کے نزدیک بہترین بندہ پیشوائے عادل ہے جو خود ہدایت یاب ہو اور دوسروں کی صحیح راہنمائی کرے اور سنت رسول ؐ پر عمل پیرا ہو، اور بدعت نادرست و باطل کو کچل ڈالے اور بلاشبہ

سنت رسولِ اکرم روشن اور ہویدا ہے اور اس کا نشان قائم ہے، اسی طرح بدعات نمایاں ہیں اور ان کی علامتیں بھی موجود ہیں اور خدا کے نزدیک بدترینِ مردم وہ پیشوائے ستمگار ہے کہ گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے۔ سنتِ رسولؐ کو مردہ کرے، اور بدعتِ نادرست و باطل کو زندہ کرے۔

میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپؐ فرماتے تھے:

"قیامت کے دن پیشوائے ستمگار اس حالت میں لایا جائے گا کہ کوئی اس کی یاری کرنے والا نہ ہوگا۔ نہ اس کی عذر خواہی تسلیم کی جائے گی۔ پس وہ آتشِ دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔ اور چکی میں اس طرح چکر کھائے گا جس طرح آسیا گردش کرتی ہے پھر اس کی تہہ میں تہلکہ کر دیا جائے گا!"

اور میں آپؓ کو خدا کی قسم دیتا ہوں کہ آپؓ اس امت کے امام مقتول نہ بنیئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"اس امت میں جو امام قتل کیا جائے گا۔ اس کے اثر قتل سے خون ریزی اور خانہ جنگی کی راہ قیامت تک کھل جائے گی، امور مشتبہ ہو جائیں گے اور تباہ کاری پھیل جائے گی۔ حق اور باطل کا امتیاز اٹھ جائے گا۔ اس تباہ کاری کے دور میں یہ فتنوں کو ایک دوسرے پر ڈالیں گے اور اس میں گتھ کر رہ جائیں گے۔ پس آپؓ اس کہن سالی اور سالِ خوردگی کے عالم میں مروان کے لیے ایسا کھلونا نہ بن جایئے کہ جہاں چاہے اٹھائے پھرے"

حضرت عثمانؓ نے یہ باتیں سُن کر جواب ارشاد فرمایا:

"آپؓ لوگوں سے گفتگو کیجیے کہ مجھے مہلت دیں تاکہ ان پر جو ستم رانیاں اور زیادتیاں ہو چکی ہیں، ان کا تدارک کر دوں!"[12]

اشتر نے حضرت عثمانؓ کو جو مکتوب لکھا تھا اور جس میں ان پر سخت تنقید اور نکتہ چینی کی تھی، وہ نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں، انھوں نے لکھا تھا:

"آپؓ کے عاملوں کو جور و ستم کی روش ترک کر دینی چاہیے آپؓ کو چاہیئے کہ

اکابر اور نیکو کاروں کو جلا وطن نہ کریں، ہمیں آپ رضی کی اطاعت سے انکار نہیں، لیکن ہمارے اکابر کو ہدف ستم بنانے، ہمیں اور ہمارے نیک سرشت لوگوں کو جلاوطن کرنے اور ہم پہ ناتجربہ کار نوجوانوں کو مسلط کرنے کی روش ترک کر کے تائب ہو جیے۔ ہمارے شہر کا حاکم عبداللہ بن قیس رضی ابو موسیٰ اشعری رضی اور حذیفہ رضی کو بنا دیجیے، اور ہمیں اپنے اور اپنے کنبے کے اور مرضی کے حاکموں سے بخشیے!

لیکن اس تند، ترش، تلخ بلکہ گستاخانہ تحریر کا جواب خلیفۂ راشد حضرت عثمان رضی نے کیا دیا:

"اے خدا میری توبہ قبول کر، پھر ابو موسیٰ اشعری رضی اور ابو حذیفہ رضی کو تحریر فرمایا، اہل کوفہ تمھیں پسند کرتے ہیں، ہمارے بھی تم معتمد ہو، لہٰذا وہاں کے امور اپنے ہاتھ میں لو اور حق کے ساتھ حکومت کرو، اللہ ہماری اور تمھاری مغفرت فرمائے"[۱۳]!

مروان اگر بیچ نہ ہوتا تو حضرت رضی کے خلافت کے آخری چھ سال بھی پہلے کے چھ برس کی طرح ہر اعتبار سے نمونہ ہوتے۔

حضرت عبدالرحمٰن رضی بن عوف جنھوں نے حضرت عثمان رضی سے خلافت کی بیعت لی تھی، اسی مروان کی ریشہ دوانیوں اور حضرت عثمان رضی کی بے بسی کی وجہ سے حد درجہ ملول و دل گرفتہ تھے، چونکہ حضرت عثمان کو خلیفہ بنانے میں حضرت عبدالرحمٰن رضی بن عوف ہی دخیل تھے، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ یہ عہد ہر اعتبار سے مثالی ہو، لیکن جب مروان وغیرہ کی وجہ سے حالات بدلے تو انھوں نے:

"احتساب زیادہ شدید کر دیا اور آخر کار ایک دن وہ ان کے مخالفوں کی صف میں نظر آنے لگے اور مخالفت نے یہ رنگ پکڑا کہ حضرت عثمان رضی سے یکسر قطع تعلق کر لیا، نہ ملاقات، نہ بات چیت"[۱۴]!

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی بھی حضرت عثمان رضی پہ نکتہ چینی برسرِ عام کیا کرتے تھے[۱۵]۔

حضرت عثمان رضی اور حضرت علی رضی کے مابین جو تلخی پیدا ہوئی اس میں بھی بقول ڈاکٹر طٰہٰ حسین یہی مروان وغیرہ کار فرما تھے

ایک مرتبہ حضرت عباس رضؓ نے آمنے سامنے دونوں کو نصیحت کی اور گذشتہ تلخیوں کی گرد جھاڑ دینی چاہی، تمام اختلافات اور ہر طرح کے اظہارِ اختلاف کے باوجود حضرت علی رضؓ نے جو بات کہی وہ اس حقیقت کی غماز ہے کہ اظہارِ اختلاف کے معنی غداری اور بغاوت کے نہیں ہیں تا آنکہ معاملہ کفر و اسلام تک نہ پہنچ جائے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا:

"عثمان رضؓ اگر مجھے حکم دیں تو میں بے تامل جلا وطنی اختیار کر لوں گا!"

ابوذر غفاریؓ کا مسلک: حضرت ابوذر غفاریؓ جلیل القدر صحابی رسولؐ تھے، ان کی بے نفسی، دنیا اور حُبِ جاہ سے بیزاری ایک معروف و معلوم حقیقت ہے، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اسلامی سوشلزم کا تصور سب سے پہلے انہی نے پیش کیا۔ تفصیل اپنے موقع پر۔ حضرت عثمان رضؓ کے عہد میں امیر معاویہؓ اور دوسرے لوگوں نے جو طرزِ زندگی اختیار کیا تھا وہ اسوۂ رسول سے جُدا تھا۔ حضرت عثمانؓ اپنی ملاطفت اور نرم خوئی کی وجہ سے ایسی روش اختیار نہیں کر سکے جو اس صورت حال کا مداوا کر سکتی۔ حضرت ابوذر رضؓ انتہائی درشت اور سخت لہجہ میں عثمانؓ اور عمّال عثمانؓ پر نکتہ چینی کرتے تھے لیکن ان کی نکتہ چینی بغاوت کی مترادف نہ تھی حدود طاعت کے اندر رہتے ہوتے تھی۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے بالکل سچ فرمایا ہے:

"حضرت ابوذر غفاری کو جب مدینہ چھوڑ کر شام روانہ ہو جانے کا حکم ملا تو وہ فوراً چلے گئے، اور جب زبدہ کی جلا وطنی کا فرمان صادر ہوا تو بھی انھوں نے مزاحمت نہیں کی، فرمایا تو یہ کہ مجھے تو میرے رسول کی طرف سے طاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ خواہ میرا حاکم نکٹا غلام ہی ہو، اگر عثمان رضؓ مجھے پھانسی دے دیں تو بھی میں بغاوت نہیں کروں گا۔"

اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری اسے اپنا حق خیال کرتے تھے کہ حدودِ طاعت کے اندر رہتے ہوئے پوری شد و مد کے ساتھ اختلاف کریں۔[۱۶]

اور حضرت ابوذر رضؓ کا یہ نقطۂ نظر بالکل بجا تھا۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے:
"کوئی شخص خواہ کتنا ہی مستحق کیوں نہ ہو اس کا سزاوار نہیں ہے کہ خدا کی نافرمانی کر کے اس کی اطاعت کی جائے[۱۷]!"
ذاتی معاملات تک میں احتساب اور باز پرس کا حق خلافت راشدہ میں عوام کو حاصل تھا۔ حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ دراز قد ہونے کے باعث انھوں نے ایک کے بجائے دو چادریں استعمال کر لیں، حالانکہ مالِ غنیمت میں فی کس ایک چادر ملی تھی۔ باز پرس کسی عامی نے نہیں، ایک نہایت عالی مرتبت شخصیت حضرت سلمانؓ فارسی نے کی، اس باز پرس سے وہ ذرا بھی نہیں جھلائے انھوں نے اپنے صاحب زادے حضرت عبداللہ کی طرف اشارہ کیا کہ جواب دیں انھوں نے فرمایا:
"اپنے حصے کی چادر میں نے اپنے والد کو دے دی ہے[۱۸]!"
انہی حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے کہ ان سے ایک بزرگ بشر بن سعدؓ نے برسرِ عام کہہ دیا تھا: "اگر تم سیدھے رستے نہ چلے تو ہم تمھیں تکلے کی طرح سیدھا کر دیں گے"
یہ سن کر حضرت عمر خوش ہوئے اور انھوں نے فرمایا:
"پھر تو تم بڑے کام کے آدمی ہو[۱۹]!"
بیعت سے اختلاف بغاوت سے گریز: بیعت، خلافت کے قیام و بقاء کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس سے گریز کرتا ہے، مگر بغاوت نہیں کرتا، تو اس سے کسی طرح کا تعرض نہیں کیا جائے گا حضرت ابو بکرؓ کی بیعت سعدؓ بن عبادہ نے نہیں کی — جو ان کے مقابے میں امیدوار خلافت تھے — نہ صرف بیعت سے انکار کیا بلکہ روش یہ رکھی کہ سعدؓ بن عبادہ نہ حضرت ابو بکرؓ کی امارت میں نماز پڑھتے تھے، نہ ان کے ساتھ شامل ہو کر ارکان حج بجالاتے تھے، مگر اس کے باوجود ان سے تعرض نہیں کیا گیا[۲۰]!

اسی طرح حضرت علیؓ کی بیعت سے عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ نے انکار کر دیا۔ مگر آپؓ نے ان سے کسی طرح کا تعرض نہیں کیا، بلکہ اس بات کے ضامن بننے پر تیار ہو گئے کہ یہ کسی طرح کی گڑبڑ نہیں کریں گے۔[۲]

غرض اختلاف و احتساب، تنقید اور نکتہ چینی اور بیعت سے گریز کا جہاں تک تعلق ہے، اس کی مثالیں، عہدِ خلافت راشدہ میں ملتی ہیں اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کتنی عالی ظرفی کے ساتھ یہ باتیں برداشت کر لی گئیں۔ بلاشبہ ان شاندار مثالوں نے اسلام کا نام روشن اور نمایاں کر دیا۔

حزبِ اختلاف اسلامی نقطۂ نظر سے: ایک دوسرا سوال جو پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ آیا اسلامی جمہوریہ میں حزبِ اختلاف کا قیام جائز ہے یا نہیں؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ انفرادی طور پر تو حکمران پر تنقید کی جا سکتی ہے، اور اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن اجتماعی طور پر ایسا نہیں کیا جا سکتا

مگر اس خیال کی اساس و بنیاد کیا ہے، اس پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی جو بات انفرادی طور پر روا اور درست ہے وہ جماعتی طور پر کیوں نادرست ہو گی؟ انفرادی طور پر اس کام کے سرانجام دینے میں کچھ قباحتیں بھی ہیں جنھیں وفورِ جذبات میں آدمی نظر انداز کر سکتا ہے، لیکن جماعتی طور پر یہ کام کرنے میں قباحتوں کے بجائے مصالح زیادہ نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے، جماعت فرد کے مقابلے میں زیادہ متوازن، زیادہ مصلحت سنج اور زیادہ محتاط ہوتی ہے۔

بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بارے میں شرعی طور پر صورتِ مسئلہ کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے:

"ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر ط واولئک ھم المفلحون ہ"	"یعنی تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیئے جو داعی خیر ہو "معروف" کا حکم دے اور "منکر" سے منع کرے، ایسے ہی لوگ فلاح یافتہ ہیں۔"[۲۲]

مَیں نہیں سمجھتا کہ اس جماعت کو، اگر یہ ایوانِ حکومت میں ہو تو "حزبِ اختلاف" کے سوا اور کس نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

اختلاف کے حدود و نشتہ العد پر مَیں روشنی ڈال چکا ہوں، یعنی اختلاف دائرۂ طاعت سے باہر نہیں ہونا چاہیئے، سو اگر اس دائرے میں رہ کر کچھ لوگ "حزبِ اختلاف" بن کر حکومت کے سامنے تعمیری تجویزیں پیش کر کے آمر بالمعروف اور اس کی غلط روی پر اسے ٹوک کر "ناھی عن المنکر" بنتے ہیں تو کس کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ —— اور اگر ہو سکتا ہے تو کس بنیاد پر؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی رہے گی، جو حق کی علمبردار ہوگی اور اس سے اختلاف کرنے والے اسے کوئی زیاں نہ پہنچا سکیں گے"!

مذکورہ آیت اور حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصحاب اقتدار کو، اگر وہ غلطی کے مرتکب ہوں، ٹوکنا، اور ان کے سامنے تعمیری (معروف) تجویزیں پیش کرنا ایک اسلامی فعل ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ معروف کا اعلان تلوار سے کر نہ کیا جائے اور منکر کے خلاف مزاحمت ایسی نہ ہو جو بغاوت کی حد تک پہنچ جائے اس لیے کہ فتنہ و فساد کو اسلام کسی حالت میں پسند نہیں کرتا، بلکہ اگر فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو تو وہ اسے ترجیح دیتا ہے کہ انسان ظالم بننے کے مقابلہ میں مظلوم بن جائے بجز اس صورت کے کہ واضح طور پر سوال کفر اور اسلام کا پیدا ہو جائے۔ یہ دوسری صورت ہے اور اس پر ایک جداگانہ باب میں گفتگو کی جائے گی۔

اسلامی مقننہ میں ایسی حزبِ اختلاف کی گنجائش ہے جو ذاتی اغراض سے پاک ہو۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ آیا اسلام کے عہدِ ماضی میں بالخصوص عہدِ خلافتِ راشدہ میں حزبِ اختلاف کی کوئی مثال ملتی ہے تو جواب میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے یہ الفاظ پیش کیے جا سکتے ہیں۔

"مدینہ منورہ میں یہ حضرات ہی حزبِ اختلاف کے نمایاں اور ممتاز اکابر تھے اور یہ تمام حضرات جلیل القدر صحابی رضؓ اور مہاجر ہیں!"

اور پھر "حزب اختلاف" کے اکابر کے نام گنوائے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱- عبدالرحمٰن رضؓ بن عوف، ۲- سعدؓ بن ابی وقاص، ۳- زبیرؓ بن العوام
۴- طلحہ رضؓ بن عبیداللہ، ۵- علی رضؓ ابن ابی طالب، ۶- عباس رضؓ بن عبدالمطلب
۷- عبداللہؓ بن مسعود، ۸- ابوذر رضؓ غفاری، ۹- عمار بن یاسر رضؓ[۲۳]

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر: لیکن اس حزب اختلاف کے تمام اصحاب دائرۂ طاعت سے باہر نہ تھے، بلکہ خلیفہ کے حکم سے جلا وطن ہوئے۔ اور پھانسی پر لٹکنے کو بھی تیار تھے۔

اصل بات یہ ہے، اور یہی بنیادی چیز ہے کہ اسلامی مقننہ میں ایسی حزب اختلاف کی گنجائش ہے جو ذاتی اغراض اور مفاد سے یکسر بے نیاز اور بے پرواہ ہو، دولت، منصب، جاہ و حشم، کوئی چیز بھی اس کے پیش نظر نہ ہو، صرف اللہ کے لیے، صرف فلاح امت کے لئے، صرف "فلاح یافتہ" (اولٰئک ھم المفلحون) بننے کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے، لیکن اگر مقصد جاہ و منصب کا حصول اور دولت و ثروت پر قبضہ اور اقتدار و اختیار پر تسلّط ہے تو ممکن ہے، عہد جدید کے سیاسی افکار کے مطابق وہ کامیاب حزب اختلاف کہلائی جا سکے، لیکن اسلامی جمہوریہ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلامی جمہوریہ میں تو وہی حزب اختلاف پنپ سکتی ہے، جس کے سامنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اسوۂ حسنہ ہو کہ جب آپؐ کے پاس مشرکین قریش آئے اور گویا ہوئے:

"اگر مقصد یہ ہے کہ مال و دولت جمع کر لو تو ہم تیار ہیں کہ تمھارے لیے مال جمع کر دیں، اور اگر مجد و شرف کے طالب ہو، تو آؤ، ہم تمھیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں اور اگر سلطنت مقصود ہے تو ہمیں کوئی عذر نہیں کہ تمھیں اپنا بادشاہ بنا لیں"

جواب میں آپؐ نے فرمایا:
"میری تعلیم نہ طلبِ مال کے لیے ہے نہ حصولِ مجد و شرف یا حصولِ اقتدار کے لیے......"[۲۴]

اس طرح کی حزبِ اختلاف جس ملک میں بھی اُبھرے گی وہ رحمت اور نعمت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی، اور اسلامی جمہوریہ میں اس طرح کی حزبِ اختلاف کی گنجائش ہے۔

ماخذ:

۱ھ سورۂ توبہ، پارہ ۱۰، رکوع ۳، آیت ۲۲، نیز ملاحظہ ہو سورۂ آلِ عمران ۱۱/۲۵، ۱۲/۱۱۱، نیز سورۂ حدید ۳/۵، نیز سورۂ اعراف پارہ ۸، رکوع ۱۹، آیت ۱۵۸۔

۲ھ ابن ماجہ، ج ۲، ص ۱۳۲۹، حدیث ۴۰۱۱، کتاب الفتن، باب "الامر بالمعروف و نہی عن المنکر"، طبع مصر، نیز، ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب "الامر و النہی" ص ۵۹۷۔

۳ھ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، ج ۳، ص ۲۱۰، ابواب الفتن، باب "افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر"

۴ھ نسائی، ج ۲، ص ۱۶۵، ابواب الفتن، باب "فضل من تکلم بالحق عند امام جائر"

۵ھ سراج الملوک (طرطوشی) طبع مصر، ص ۱۴۹

۶ھ صحیح مسلم، عن عائشہ صدیقہ رضؓ

۷ھ یہ متفق علیہ روایت ہے، یعنی صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلم دونوں میں آئی ہے، دوسری کتب حدیث میں بھی مروی ہے۔

۸ مسند امام احمد بن حنبلؒ، ج، ص ۲ -

۹ سراج الملوک (طرطوشی) ص ۱۵۰، (طبع مصر)

۱۰ حضرت عثمانؓ کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز تھی -

۱۱ حضرت عثمانؓ کا میر منشی تمام فتنوں کی جڑ -

۱۲ نہج البلاغۃ، تہذیب و تحشیہ، علامہ محمد عبدہٗ طبع مصر، ص ۱۰۹۸ — ۱۱۰۰،

۱۳ انساب الاشراف (بلاذری) ص ۴۶، ۴۷ -

۱۴ الفتنۃ الکبریٰ —— عہد عثمانؓ (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) طبع مصر، ص ۱۴۵ -

۱۵ انساب الاشراف (بلاذری) ص ۱۴ -

۱۶ الفتنۃ الکبریٰ —— علی و بنوہ (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) طبع مصر -

۱۷ کتاب الخراج (امام ابو یوسفؒ) ص ۱۱۷

۱۸ سیرت عمرؓ (ابن جوزی) ص ۱۲۷ ۱۹ کنز العمال ج ۵،

۲۰ ابو بکرؓ (محمد حسین ہیکل) طبع مصر، ۸۷ -

۲۱ الفتنۃ الکبریٰ —— علی و بنوہ، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، طبع مصر -

۲۲ سورۂ آل عمران آیت ۱۰۴ -

۲۳ الفتنۃ الکبریٰ —— علی و بنوہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین، طبع مصر -

۲۴ سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۱۰۱ -

(۱۰)

عدل و انصاف

مطلق العنان غیر آئینی اور یک سر شخصی حکومت میں عدل و انصاف کے تو بخیے ادھیڑ کیے جا سکتے ہیں۔ ابھی حال کی بات ہے، افریقہ کے ایک نو آزاد ملک گھانا کے آمر، نکرومہ نے بیک جنبشِ قلم ایک عدالتی فیصلے سے برہم ہو کر عدالت عالیہ کے تمام ججوں کو برطرف کر دیا تھا، ایسی حکومت میں تعزیر و عقوبت بھی کسی اصول کی پابند نہیں ہوتی۔ بیک اشارۂ چشم محلوں میں رہنے والے اسیرِ زنداں کر دیے جاتے ہیں۔ بے گناہ اور معتوب بغیر کسی عدالتی کارروائی کے، یا نمائشی عدالتی کارروائی کے بعد نہ صرف املاک و جائداد سے بلکہ زندگی تک سے محروم کر دیے جاتے ہیں۔ جس کا مظاہرہ گزشتہ چند سالوں میں شرق اوسط کے بعض ملکوں میں بار بار ہو چکا ہے یہی صورت عفو و رحم کی بھی ہے۔ جو دشمن قرار پایا وہ صفِ اعدام میں شامل نظر آیا جس نے مخالفت کی جرأت کی، اسے ظلم سہنے اور عفو و رحم سے محروم رہنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

رائج الوقت جمہوریت کے کرشمے: دنیا کے جن ممالک میں جمہوریت رائج ہے اور جو اپنی جمہوری روایات کی ایک مسلسل تاریخ رکھتے ہیں ان پر بھی اگر تعمق کی نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آئے گا کہ عدل و انصاف، تعزیر و عقوبت اور عفو و رحم سے متعلق ان کے بنائے ہوئے قوانین میں تغیر اور تبدّل کا غیر منقطع سلسلہ جاری ہے، اور ان سب پر مستزاد "ایمرجنسی" کی سپر ہر جگہ موجود نظر آئے گی، جس کی آڑ میں عدالتی کارروائی سے مستغنی ہو کر انتظامیہ محض اپنی

صوابدید پر ایک محدود لیکن توسیع پذیر مدت تک شخصی آزادی چھین سکتی ہے تعزیر و عقوبت کے اختیارات بھی کام میں لا سکتی ہے، ضرورت پڑنے پر حرام کو حلال اور حلال کو حرام بھی قرار دے سکتی ہے جیسا کہ بعض مغربی ممالک میں زنا کوئی جرم نہیں، اور رضامندی طرفین کی صورت میں لواطت تک جائز ہے۔ بے حجابانہ اختلاط مرد و زن، "ٹاپ لیس" لباس، "منی اسکرٹ"، اور دوسرے فواحش چونکہ اکثریت کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق ہیں، اس لیے عدل کا تقاضا یہ ہے، کہ اس سلسلے میں کوئی باز پرس نہ کی جائے، اس باب میں اور اگلے چند ابواب میں انھیں موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔

اسلام کا اصولِ عدل و انصاف: اسلامی جمہوریت میں اگرچہ انسان قانون بنانے کا اختیار رکھتا ہے لیکن اکثریت غالب اکثریت، یا تین چوتھائی سے زیادہ اکثریت کی صورت میں بھی ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا جو اسلام نے مقرر کر دیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا عدل و انصاف بے لاگ اور بے لچک ہے۔ اس کی تعزیر و عقوبت خواہ وہ حدود شرعی کے ذیل میں آتی ہو یا امیر و قاضی کی شخصی صواب دید سے متعلق ہو، ایک خاص ضابطے کی پابند ہے اور اس میں حالات و مصالح کے ماتحت عفو و رحم کی بھی پوری گنجائش موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عدل پر ظلم کا دھوکا نہیں ہوتا، اس کی تعزیر و عقوبت میں سفاکی، درندگی، بہیمیت اور خون آشامی کی جھلک نہیں دکھائی دیتی۔ اس کا عفو و رحم مرحمتِ خسروانہ کے ذیل میں نہیں آتا، بلکہ عطیۂ الٰہی نظر آتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا عدل ہو یا تعزیر، یا رحم، دوسری قوموں اور جمہوریتوں کے برعکس نسل و رنگ، ملک و قوم اور عقیدہ و مذہب سے ماورا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔" یعنی جب لوگوں (کے مقدمات کا) فیصلہ کیا کرو تو عدل کے ساتھ کیا کرو۔[1]

اس آیت میں یہ پہلو خاص طور پر غور طلب ہے کہ عدل کا حکم صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ تمام انسانوں پر حاوی ہے، خواہ ان کا عقیدہ دین نسل، رنگ کچھ بھی ہو، یعنی ایک مسلمان حاکم بعض "سیکولر" جمہوریتوں کی طرح غیر مذاہب کی اقلیتوں کے انسانی اور بنیادی حقوق پامال کرتے ہوئے انھیں ہدف جور وستم نہیں بنا سکتا، ان کے ساتھ وہی منصفانہ برتاؤ کرنے پر مجبور ہے جو اپنے ہم قوموں اور ہم مذہبوں کے ساتھ کرتا ہے۔ علامہ رشید رضا نے بہت بجا فرمایا ہے کہ اس آیت میں "اللہ تعالیٰ نے مطلق طور پر عدل کا حکم دیا ہے"[۵۲]

اس میں کسی کی تخصیص یا امتیاز کی گنجائش نہیں ہے۔ جصاص نے اس آیۂ کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے انس بن مالک کی روایت درج کی ہے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ امتِ مسلمہ اس وقت تک بخیر رہے گی جب تک بات چیت میں راست گوئی، فیصلہ کرنے میں عدل اور سزاوار رحم سے عفو وکرم کا برتاؤ کرے گی"[۵۳]

علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے: "اس آیۂ کریمہ میں خطاب والیوں اور حاکموں سے ہے"[۵۴]

"یعنی امتِ مسلمہ کے والیوں اور حاکموں پر واجب ہے کہ فیصلہ کرتے وقت عدل کو ملحوظ رکھیں، اور یہ عدل ہر طرح کی تخصیص اور امتیاز نسل و رنگ و مذہب سے ماوراء ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ:

"عدل کی اصل مساواتِ عامہ ہے"[۵۵]

چنانچہ حسب روایت ابو سعیدؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "قیامت کے دن خدا کی جناب میں سب سے زیادہ محبوب و مقرب بارگاہ حاکم عادل ہوگا، اور سب سے زیادہ معتوب اور سزاوار عذابِ شدید حاکم جور پیشہ ہوگا"[۵۶]

اس آیت کے مخاطب حاکم اور والی ہیں، تفاسیر میں اس کی بار بار صراحت کی گئی ہے۔ چنانچہ: محمد بن کعب کا بیان ہے کہ یہ آیت حکام کے لیے نازل ہوئی

ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "جب تک حاکم مائل بہ جور نہ ہو، خدا اس کے ساتھ ہے[۵۷]!"

عدل کے لیے مساواتِ عامہ کو اسلامی حکومت میں کس درجہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہو سکتا ہے، جب ایک ناقابلِ معافی مجرم کی آپؐ سے سفارش کی گئی۔ اور آپؐ نے فرمایا:

"خبردار! اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بھی یہ جرم سرزد ہوتا، تو میں اُس پر بھی حد جاری کر دیتا[۵۸]"

عدل اسلامی اور مساواتِ عامہ: اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد پر سے بھی حد ساقط نہیں ہو سکتی تو عام حکمرانوں، فرماں رواؤں، والیوں، حاکموں اور اربابِ اقتدار و اختیار کی اولاد، اور خویش و اقربا بھی ارتکابِ جرم کے بعد اس کے لازمی نتائج یعنی تعزیر و عقوبت سے نہیں بچ سکتے۔

حضرت عمرؓ، جب کسی عامل کو مقرر کرتے تو تاکید فرماتے:

"ہمیشہ حق کے ساتھ فیصلہ کرنا[۵۹]!"

خلفائے راشدین میں حضرت عمرؓ گو مزاج کے اعتبار سے نسبتاً سخت تھے لیکن عدل و انصاف کے معاملے میں فولادِ آہن تھے کسی فرد کے ساتھ خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، رُو رعایت پسند نہیں فرماتے تھے۔

چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، اور دوسرے قضاۃ کو دستورِ عدل سے متعلق آپؓ نے جو فرمان بھیجا تھا، وہ خاص طور پر غور طلب ہے:-

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: از عبداللہ عمر امیر المومنین، بنام عبداللہ بن قیس، سلام علیک! امابعد! عدالت فرض محکم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے، جب کوئی مقدمہ تمھارے سامنے آئے تو اس کو خوب اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرو کہ کسی حق و صداقت کا اعلان (جس کا نفاذ کسی معقول بنیاد کے نہ ہونے کی وجہ سے) نہ ہو سکے، بے معنی ہے۔ لوگوں کو اپنے حضور میں، اپنی

مجلس میں؛ اپنے انصاف میں برابر رکھو؛ تاکہ جو اعلیٰ ہو، وہ تمھاری رعایت کا امیدوار، اور جو ادنیٰ ہو، وہ تمھارے عدل سے ناامید نہ ہوجائے؛ جو شخص دعویٰ کرتا ہے، اس پر بارِ ثبوت ہے، اور جو منکر ہو، اس پہ قسم، مسلمانوں میں مصالحت جائز ہے، لیکن ایسی کہ جس سے حلال حرام اور حرام حلال نہ ہونے پائے، جو فیصلہ تم نے کل کیا ہے، اگر آج غور کرنے سے حق کے خلاف نظر آئے، تو اس سے رجوع کرڈالو کہ حق وصداقت ہی اصل چیز ہے، باطل میں پڑے رہنے سے حق کی طرف لوٹ آنا بہتر ہے اور اس کی مثالوں اور نظیروں کو دیکھو، اور پھر انھیں نظائر پر قیاس کرلو، جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے اس کے لیے ایک میعاد مقرر کردو، اگر وہ ثبوت لائے تو اس کا حق دلا دو، ورنہ اس کے خلاف فیصلہ کرو، یہ وہ طریقہ ہے جس کی صحت و صداقت اندھوں کو بھی نظر آسکتی ہے، اور جس کے اختیار کرنے کے بعد کسی کو کسی قسم کے عذر کا موقع باقی نہیں رہ جاتا، تمام مسلمان ایک دوسرے پر شہادت کے لیے قابلِ اعتبار ہیں۔ بجز ان لوگوں کے جنھوں نے حدِّ شرعی میں دُرّے کھائے ہوں، یا جھوٹی شہادت میں ان کا تجربہ ہو چکا ہو، یا اولاد اور وراثت کے بارے میں ان پر شبہ ہو، پوشیدہ امور کا علم صرف خدا تعالیٰ کو ہے، تمھارا کام ثبوت وشواہد کو پیشِ نظر رکھ کر فیصلہ کرنا ہے۔ اظہارِ حق کے مواقع پر مخاصمین کی باتوں سے ہیجان میں نہ آجاؤ، غصہ کو راہ نہ دو دل گیر نہ ہو اور نہ ان کی جانب سے اپنے اندر نفرت کے جذبات پیدا ہونے دو کہ (سادہ طریقہ پر) حق پہنچا دینا ہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا اجر رکھتا ہے اور بڑی نیکی کا باعث ہوتا ہے۔ پس خواہ خود اپنے نفس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ جو شخص اللہ اور اپنے درمیان اپنی نیت کو خالص رکھتا ہے، خدا تعالیٰ اس کو لوگوں کے شر سے بچا لیتا ہے، لیکن جو شخص اللہ کی نگاہ میں جو چیز حق ہے اسے چھوڑ کر لوگوں کو خوش کرنا چاہتا ہے، خداوند تعالیٰ اسے تباہ وبرباد

کر دیتا ہے۔[۱۰]

محکمۂ مظالم: محکمۂ مظالم ہمارے زمانے کی عدالتِ عالیہ کے برابر تھا۔ جب قوم کے اعلیٰ طبقہ کے کسی فرد کے قضیہ میں قاضی اپنے حکم کی تنفیذ سے عاجز ہوتا، یا جب داد خواہوں کا خیال ہوتا کہ قاضی نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے تو اس قسم کے تمام قضایا فیصلہ کے لیے اس عدالت میں پیش ہوتے تھے: اس عدالت کی تخلیق کا منشاء اساسی ذی جاہ اور ذی حسب افراد کے ظلم و تعدی کو روکنا تھا، یہی وجہ ہے کہ دیوان المظالم کی ریاست ایک جلیل القدر اور نہایت ہی متقی شخص کو دی جاتی تھی، جو قاضی المظالم کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔

خلفائے راشدین میں سوائے حضرت علیؓ کے کسی اور خلیفہ نے مقدماتِ مظالم کی سماعت کے لیے کوئی اجلاس نہیں کیا، پھر آپؓ نے بھی ان کی سماعت کے لیے کوئی خاص علیحدہ دن یا علیحدہ گھڑی مقرر نہیں کی تھی، بلکہ جس وقت ناانصافیوں کے شاکی اپنی شکایت لے کر آتے تو فوراً ہی دادرسی کرتے اور انصاف کے تقاضے کے مطابق حکم صادر فرما دیتے۔

قاضی المظالم کے اختصاصات میں حسب ذیل چیزیں داخل تھیں:

۱- ولاۃ کے خلاف جب کہ وہ تحصیل محاصل میں ظلم و زیادتی کریں اور محررین دواوین کے خلاف جب کہ وہ اموال مسلمین کا اندراج صحیح نہ کریں، بلکہ کمی بیشی کریں، نیز جو قضایا رعایا کے افراد یا طبقات دائر کریں، ان کی سماعت کرنا ہے۔

۲- اہل عسکر کی شکایات سننا، جب کہ ان کا سامان خورد و نوش کم دیا جائے یا وقتِ مقررہ میں تاخیر کر دی جائے۔

۳- قاضی و محتسب جن احکام کی تنفیذ سے عاجز و قاصر ہوں، ان کا نفاذ کرنا۔

اس تفصیل سے اس عہدہ کی اہمیت اور اس عہدہ دار کے اقتدار کا اندازہ

ہو سکتا ہے۔ نیز ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نظامِ عدل، وقّتِ نظر، نکتہ سنجی اور کمال و اتقان کے کس درجہ پر پہنچ چکا تھا؟!

عبید اللہ بن عمرؓ کے خلاف فیصلہ! : حضرت عمرؓ کو ایک ذمی نے قتل کر دیا۔ آپ کے صاحبزادے عبید اللہؓ جوشِ الم اور جوشِ انتقام سے از خود رفتہ ہو رہے تھے، انھوں نے شبہے کی بنا پر ہرمزان اور جفینہ، اور ابو لولو کی لڑکی کو قتل کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کی مسند نشینی کے فوراً بعد سب سے پہلا مقدمہ یہی پیش ہوا، حضرت علیؓ نے صاف اور واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ:

"عبید اللہ کو قتل کی سزا دی جائے۔!"

قانون کو ہاتھ میں لینا، دو ذمیوں اور ایک مسلمان کو شبہے میں قتل کر دینا، ایسا جرم نہیں تھا، جو معاف کر دیا جاتا، اگرچہ جرم کا ارتکاب خلیفۂ راشد عمرؓ کے بیٹے ہی سے کیوں نہ ہوا ہو۔

لیکن دوسروں نے رائے دی کہ کل عمرؓ قتل ہوئے ہیں، آج ان کا بیٹا قتل کیا جائے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہوگا۔ المیہ اپنی جگہ پر، لیکن اسلامی جمہوریت کی روح وہی تھی جس کی ترجمانی حضرت علیؓ نے کی تھی، حضرت عثمانؓ نے بَین بَین راستہ اختیار کیا، یعنی عبید اللہ کو سزا نہیں دی۔ اپنے پاس سے مقتولین کی دیت ادا کر دی۔

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے کہا ہے:

"یہ واقعہ صرف سیاسی نوعیت کا حامل نہیں تھا، اسے دینی حیثیت بھی حاصل تھی، جو سیاست سے بالا تھی، بلاشبہ (اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام لیتے ہوئے) خلیفہ کو عفو و درگذر کا حق حاصل ہے۔ لیکن یہ حق مشروط ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر دین کے حدود میں سے کوئی حد معطل نہیں کی جا سکتی۔!"

پھر آگے چل کر ڈاکٹر صاحب نے مزید فرمایا ہے:

"بہر حال عبید اللہ کو کسی طرح کی سزا نہیں ملی، حضرت عثمان رض نے اپنی جیب سے دیت ادا کر کے خود اپنے آپ کو وہ سزا دی جو عبید اللہ کو ملنی چاہیئے تھی۔ اگر دیت کی رقم عبید اللہ پر حضرت عثمان رض عاید کر دیتے، پھر ان کی جان بخشی کرتے تو کسی کو مجال دم زدن نہ ہوتی، اور اگر خطاب رض کے خاندان سے حسن سلوک کو مرعی رکھتے ہوئے دیت اپنی جیب سے ادا کر دی تھی تو بھی عبید اللہ کو اسیر زندان کر دینا تھا کہ وہ خدا سے توبہ کرتے، جو خون ناحق انھوں نے کیا تھا، اس پر نادم ہوتے، اور اگر عثمان رض ایسا کرتے تو عبید اللہ کو اندازہ ہو جاتا کہ مسلمان اور ذمّی کا خون خدا کے نزدیک اتنا محترم ہے کہ اسے ناجائز طور پر بہایا نہیں جا سکتا، اس کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ قاتل بلا غل وغش آسودگی اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لیے آزادانہ چھوڑ دیا جائے؟"

پھر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ: اس طرح کا مقدمہ اگر حضرت عمر رض کی خدمت میں پیش کیا جاتا تو وہ بے تامل و بے جھجک حدود کے اجرا میں لومۃ لائم کی پروا نہ کرتے، حضرت عثمان رض کے اس فیصلے نے انھیں راہِ عمر رض سے متفاوت کر دیا[۱]!"

عدل کا تقاضا یہ ہے کہ کسی شخص کو مظلومیت کا احساس نہ ہو، وہ یہ نہ محسوس کرے کہ اس پر زیادتی ہوئی ہے۔

حاکم کے اختیارات خصوصی: ایک بہت اہم مسئلہ یہ ہے کہ مخصوص حالات میں عارضی طور پر حاکم وقت کسی کی آزادی سلب کر سکتا ہے یا نہیں؟

امیر کو اختیار ہے کہ متّہم کو تفتیش اور استبراء کے لیے محبوس کر دے لیکن اس کی مدت میں اختلاف ہے۔ عبد اللہ زبیری شافعیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک ماہ سے زیادہ حوالات کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اور دوسرے

علماء کہتے ہیں کہ مدّت معین نہیں، امام کی رائے اور اجتہاد پر موقوف ہے۔ یہی رائے زیادہ مناسب ہے۔ لیکن قاضی بلا حق واجب کسی کو قید کرنے کا مجاز نہیں[۱۱۳]!"

"حق واجب"، کی تحدید اس حقیقت کی غماز ہے کہ کسی شخص کی آزادی اس وقت تک ــــــ سلب نہیں کی جا سکتی، جب تک جائز اور معقول وجوہ موجود نہ ہوں۔

لیکن حضرت عمرؓ کا مسلک اس سلسلے میں یہ ہے کہ وہ عدالتی کارروائی کے بغیر کسی کے قید و حبس کو روا نہیں سمجھتے، چنانچہ ان کا ارشاد ہے:

"خدا کی قسم اسلامی مملکت میں کوئی شخص اس وقت تک محبوس نہیں کیا جا سکتا، جب تک اس کے خلاف عادل گواہوں کی شہادت موجود نہ ہو[۱۱۴]!"

قابل دست اندازی اور ناقابل دست اندازی معاملات:

بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں، جو قابلِ دست اندازی ہوتے ہیں، اور بعض قابلِ دست اندازی نہیں ہوتے۔ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ ان پہلوؤں کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے، چنانچہ:

"تہمت زنا کی حد اسّی تازیانے ہیں، یہ منصوص اور مجمع علیہ ہے، اس میں کمی اور بیشی نہیں ہو سکتی، یہ حق العباد ہے۔ لہٰذا بلا مطالبہ واجب نہیں ہوتی معاف کرنے سے ساقط ہو جاتی ہے جس کو زنا سے متہم کیا جائے، اگر اس میں پانچ شرائط جمع ہوں۔ اور متہم کرنے والے میں تین شرائط جمع ہوں تو حد واجب ہے۔

متہم بالزنا کی پانچ شرطیں یہ ہیں:

۱۔ بالغ ہو، ۲۔ عاقل ہو، ۳۔ مسلمان ہو، ۴۔ حُر ہو۔
۵۔ عفیف ہو۔

لہٰذا بچے، مجنوں، یا غلام یا کافر کو متہم کرنے والے پر حد جاری نہ ہوگی۔

ہاں تکلیف دہی اور بدزبانی کی وجہ سے سزا دی جائے گی۔

اور متہم کرنے والے کی تین شرطیں یہ ہیں:

۱- عاقل ہو، ۲- بالغ ہو، ۳- حُر ہو۔

ناقابلِ قبول شہادت: اگر بچہ یا مجنون ہو تو نہ حد ہے نہ تعزیر ہے۔ کافر کو مسلمان کی طرح، عورت کو مرد کی طرح حد لگائی جائے، متہم کرنے والا فاسق ہو جاتا ہے، اس کی شہادت ناقابلِ قبول ہے۔[۵۱]

اس میں دو چیزیں خاص طور پر غور طلب ہیں:

ایک تو یہ کہ زنا کی تہمت اتنا بڑا جرم ہے کہ اس میں کافر و مسلم کو یکساں سزا دی جائے گی، کافر کا "پرسنل لا" یہاں کام نہیں دے گا۔

دوسرے یہ کہ حسب نص قرآنی، ایسے شخص کی شہادت آئندہ، ہمیشہ کے لیے ناقابلِ قبول ہو گی، اور اس کا شمار فاسقین میں ہو گا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے پاک دامن خواتین کا احترام کس درجہ ملحوظ رکھا ہے، یہ بات بھی دنیا کی کسی مہذب اور متمدن حکومت میں نہیں ملے گی۔

اب تین چیزیں اور توجہ طلب ہیں:

۱- دیت، ۲- محظورات، ۳- فیصلۂ قاضی میں حاکم کی مداخلت

یہودی اور نصرانی کی دیت میں اختلاف ہے، ابو حنیفہؒ مسلمان کی دیت کے برابر کہتے ہیں۔

محظورات (بدافعالیاں) جب تک ظاہر نہ ہوں، محتسب ان کا تجسس اور پردہ دری نہ کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، جس شخص سے کوئی بدافعالی سرزد ہو تو وہ اللہ کے بندے سے پوشیدہ رکھے۔ کیونکہ جو شخص اپنے کرتوت ہمارے سامنے ظاہر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی انتقامی حد اس کے لیے موجود ہوتی ہے۔ اگر آثار و علامات سے کسی کا چپکے چپکے بدافعالی کی

تیاری کرنا معلوم ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں :

ایک یہ کہ اس سے ایسی حرمت کے ضائع ہونے کا خیال ہو کہ اس کی تلافی نہ ہو سکے، مثلاً ایک سچے اور معتبر شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک آدمی ایک عورت کے پاس خلوت میں ہے اور زنا کیا چاہتا ہے، یا کسی کو قتل کیا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں محتسب کو تفتیش و تحقیق کرنا جائز ہے، تاکہ ناقابل معافی جرم کا ارتکاب نہ ہو، اور ناموس دری نہ ہونے پائے متطوع بھی ایسے معاملات کی چھان بین اور روک تھام کر سکتا ہے۔

مغیرہؓ بن شعبہ کے متعلق بعض لوگوں کا بیان ہے کہ بصرہ میں ان کے پاس بنو ہلال کی ایک عورت ام جمیل بنت محجم آیا کرتی تھی، اس کا شوہر قبیلہ ثقیف کا ایک شخص مسمی حجاج بن عبید تھا۔ اس کی اطلاع ابوبکرہ بن مسروح سہل بن معبد، نافع ابن حارث اور زیاد بن عبید کو ہوئی تو وہ گھات میں لگے رہے۔ ایک روز جب وہ مغیرہؓ کے پاس آئی تو دفعۃً اندر گھس گئے، اور پھر انھوں نے جو شہادت حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کی وہ مشہور ہے۔

حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو ایسا کرنے پر ناخوشی کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ شہادت مکمل نہ ہونے کی وجہ سے حدِ قذف جاری کی۔

حضرت عمرؓ کی مثال : ایک مرتبہ حضرت عمرؓ ایک مجلس میں داخل ہوئے، لوگوں کو دیکھا کہ شراب نوشی کر رہے تھے، اور جھونپڑیوں میں آگ روشن کر رکھی تھی۔

آپؓ نے فرمایا: میں نے تمھیں شراب پینے سے روکا تھا، تم باز نہ آئے اور جھونپڑیوں میں آگ روشن کرنے کی ممانعت کی تھی۔ تم نے پھر روشن کی۔

انھوں نے کہا۔ اے امیر المومنینؓ! اللہ نے آپ کو تجسس سے روکا ہے آپ تجسس کرتے ہیں۔ بلا اجازت مکان میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

اور آپ رضؓ بلا اجازت داخل ہو گئے ۔

آپ رضؓ نے فرمایا : اچھا وہ دونوں قصور ان دونوں کے عوض سمجھو، اور واپس چلے گئے ۔

اگر مکان سے کسی جماعت کی نامناسب آوازیں اور شور سننے میں آئے تو ان کو باہر سے منع کرے، اندر داخل نہ ہو، کہ امر منکر ظاہر ہے، اس کے علاوہ اندرونی حالات سے تعرض کرنا اس کے ذمے نہیں ۔

مظالم میں دخل دینے کے یہ معنی ہیں کہ جب اس کے متعلق عدالت کے احکام نافذ ہو گئے ہوں اور قاضی اور دوسرے حکام عدالت نے فیصلہ نافذ کر دیا ہو تو اب امیر کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ دیکھے کہ اس فیصلہ پر عمل ہوا یا نہیں، کیونکہ اس شکل میں اس کے دخل دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک حق دار کو اس کا حق دلانے میں اس کے منکر کے مقابلہ میں مدد کر رہا ہے ۔ یا حق دار کے لیے ایک ٹالنے والے سے اس کا حق لے رہا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ ظلم اور بے جا قبضہ سے روکنا اس کے فرائض میں شامل ہے اور وہ مقرر ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ مہربانی اور انصاف کے ساتھ ان معاملات کا تصفیہ کر دے ۔

عدلیہ اور امیر کے حدود و اختیارات : اگر مظالم (معاملات) کی نوعیت ایسی ہے کہ اس میں پہلے عدالت کا حکم دینا ضروری ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ قاضی اس کی ابتداء کرلے تو ایسے معاملات میں امیر کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ۔ کیونکہ یہ چیزیں، اس کے حیطۂ اقتدار سے خارج ہیں ۔ اسے چاہیے کہ وہ ان معاملات کو فوراً اپنے شہر کے حاکم عدالت کے پاس تصفیہ کے لیے بھیج دے ۔ اگر مخاصمین میں سے کسی ایک کے حق میں حاکم نے فیصلہ کر دیا اور وہ اس پر عمل کرنے سے قاصر رہا، تو اس صورت میں امیر کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنے اقتدار سے اس فیصلہ کو عمل پذیر کرائے[16]۔

عدل کے سلسلے میں جو احتیاطیں ضروری ہیں اور جو مجبوریاں لاحق ہوتی ہیں انھیں بھی اسلام نے نظر انداز نہیں کیا ہے۔

حضرت ابو بکرہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "غصّے کی حالت میں حاکم کو فیصلہ نہیں کرنا چاہیے"۔

رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد تھا: "میں ظاہر امور کے اعتبار سے فیصلہ کرنے پر مامور ہوں۔ اسرار کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فریقین میں سے کسی کی جانبداری نہ فرماتے۔ آپؐ سے منقول ہے: "جب تمھارے پاس دو آدمی جھگڑا لے کر آئیں۔ تو جس طرح تم نے ایک کی بات سنی ہے اسی طرح جب تک دوسرے کی بات نہ سن لو فیصلہ نہ کرو کہ یہی طریقہ اس بات کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ فیصلے کے راستے تمھارے سامنے کھول دیئے"۔

مسلم کی روایت ہے: "جب حاکم اجتہاد کرتا ہے اور ٹھیک کرتا ہے۔ تو اسے دو اجر ملتے ہیں، اور اگر اس سے غلطی ہو جاتی ہے تو ایک اجر پاتا ہے"[۱۸]۔

حاکمِ وقت بھی اگر کسی جرم کا مرتکب ہو تو سزا اسے نہیں بچ سکتا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں ولید بن عقبہ کو شراب نوشی کے جرم میں سزا ملی[۱۹]!

جانبدار حاکم: اور اگر کسی حاکم نے قیامِ عدل میں جانبداری، یا غفلت سے کام لیا، تو بالآخر مجبور ہو کر اسے اپنی غلطی کی تلافی کرنا پڑی جیساکہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین فرماتے ہیں:

"زیاد بن امیہ کوفے کا گورنر تھا، اس کے حضرت حجرؓ بن عدی صحابیٔ رسول صلعم سے مراسم تھے، لیکن ایک بات پر ٹھن گئی۔ ہوا یہ کہ ایک عرب مسلمان نے ایک ذمی (پناہ گزین غیر مسلم) کو قتل کر دیا۔ زیاد کو یہ بات گراں گزری ——— یاد رہے یہ امیر معاویہؓ کا زمانہ ہے ——— کہ ایک عرب قاتل کی گردن ایک ذمّی

کے لیے اڑا دی جائے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ دیت ادا کر دی جائے لیکن ذمی کے قرابت دار دیت پر رضامند نہ ہوئے، وہ انتقام چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ اسلام مساوات کا داعی ہے اور عرب و غیر عرب کے امتیاز کا قائل نہیں۔

حضرت حجرؓ زیاد کے اس فیصلے سے برہم ہو گئے، اور اس فیصلے کو نافذ نہ ہونے دینے کے لیے مسلسل احتجاج کرنے لگے۔ دوسرے لوگوں نے بھی تائید کی۔ آخر زیاد نے مجبور ہو کر عرب قاتل کو سزائے موت دی، لیکن امیر معاویہؓ کو شکایت لکھ بھیجی۔ انھوں نے جواب دیا:

"تاک میں لگے رہو، جیسے ہی موقع پاؤ، اس شخص (حجرؓ) کو ٹھکانے لگا دو۔"

زیاد تاک میں لگا رہا، اور آخرکار اس جلیل القدر صحابی رسولؐ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن یہ موت کتنی مبارک تھی جو اسلام کے ایک بنیادی اصول کے دفاع میں قربان ہو گئی۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا: "بلاذری کا بیان ہے کہ حجرؓ کی موت کی صدائے بازگشت خود معاویہ کے اندرون خانہ میں سنی جا رہی تھی۔ وہ ایک روز نماز پڑھ رہے تھے جب نماز پڑھ چکے تو ان کی بیوی نے کہا:

"امیر المومنین! کتنی بھلی ہے آپ کی نماز، کاش آپ نے حجرؓ اور اس کے ساتھیوں کو قتل نہ کرایا ہوتا!"

پس حجرؓ کا قتل ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ عہد معاویہ کے اکابر میں سے کسی کو بھی اس میں شک نہیں تھا کہ یہ واقعہ دیوارِ اسلام میں ایک شگاف کی حیثیت رکھتا تھا۔ راویوں اور مورخوں کا بیان ہے۔ معاویہ مرض الموت میں کہا کرتے تھے:

"حجر تمھارے بعد میرا بُرا حال ہوا! ابن عدی کے ساتھ میرا حساب بڑا دراز ہو گیا ہے۔"

عمرؓ نے اپنی جان دے کر عدل و انصاف کا پرچم بلند رکھا، اور حق و صداقت کا بول بالا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ عدل کا فریضہ انجام دینا ایک بڑا مشکل کام ہے۔ خاص طور پر جب عدل اور مخالف آمنے سامنے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

"ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا ط اعدلوا ھو اقرب للتقوی ط" یعنی کسی جماعت سے دشمنی کے باعث ایسا نہ ہو کہ عدل سے منہ موڑ لو۔ ہر حالت میں عدل کرو، کہ وہ تقوے سے قریب تر ہے۔[۲۱]

ماخذ:

۱ سورۂ نساء، پارہ ۵، آیت ۵۸۔

۲ تفسیر القرآن الحکیم (سید رشید رضا) ج ۵، ص ۱۷۵، مطبوعہ مصر۔

۳ احکام القرآن (جصاص) ج ۲، ص ۲۵۵، طبع مصر۔

۴ تفسیر کشاف، ج ۱، ص ۵۲۳ طبع مصر، ۵ خازن ج ۱، ص ۵۲۳، طبع مصر۔

۶ معالم التنزیل برحاشیہ خازن، ص ۴۵۸، مطبوعہ مصر۔

۷ ابن کثیر، ج ۱، ص ۵۱۶، طبع مصر۔ ۸ بخاری کتاب الحدود روایت عائشہ صدیقہ رضؓ

۹ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) ص ۳۲۹، طبع مصر،

۱۰ الاحکام السلطانیہ، ص ۱۱۷، ۱۱۸، نیز کتاب البیان والتبیین للجاحظ، ج ۲، ص ۲۳۔

۱۱ فجر الاسلام، ص ۲۷۰، نیز ص ۳۰۱۔

۱۲ الفتنۃ الکبریٰ ـــ عثمان۔ (طٰہٰ حسین) مطبوعہ مصر۔

۱۳ الاحکام السلطانیہ، ص ۲۹۳۔

۱۴ موطا امام مالکؒ کتاب الشہادت

۱۵ الاحکام السلطانیہ، ص ۳۰۳ -

۱۶ الاحکام السلطانیہ، ص ۳۰۷ - نیز ۳۲۸، نیز ص ۶۴ -

۱۷ صحیح بخاری کتاب الفتن -

۱۸ ابن ہشام، ج ۲، ص ۹۴-۹۵ -

۱۹ الکامل (ابن اثیر) ج ۵، ص ۴۸ -

۲۰ علی وبنوہ (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) مطبوعۂ مصر -

۲۱ سورۂ مائدہ، رکوع ۲ تا آیت ۸ -

---

(۱۱)

عدلیہ

دنیا نے یہ بات آج مانی اور سمجھی ہے کہ عدلیہ کو یکسر آزاد ہونا چاہیے، نہ اس کے احکام و قضایا میں مداخلت کی جا سکتی ہے، نہ ان کے نفاذ و اجراء میں رکاوٹ ڈالی جا سکتی ہے نہ اس پر کسی طرح کا دباؤ ڈالا جا سکتا ہے، نہ اسے متاثر کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ وہ ہر طرح کی مداخلت سے بالا ہے اور اس کے راستے میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ سربراہ مملکت ہی کیوں نہ ہو۔

عدلیہ کی بالادستی اور برتری: دنیا نے اس بات کو اس طرح مانا اور سمجھا ہے جیسے یہ کوئی انکشاف ہے، جیسے یہ کوئی عطیہ ہے، جو سب سے پہلے عہد جدید میں اہل دنیا کو بخشا گیا ہے۔

حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ جس طرح دوسری جمہوری قدروں اور اصولوں سے دنیا کو سب سے پہلے اسلام نے روشناس کرایا اسی طرح عدلیہ کی آزادی اور برتری اور بالادستی کا تصور بھی سب سے پہلے اسلام ہی نے پیش کیا ہے۔ اسے اسلامی جمہوریہ کی روح کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہو گا۔

اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ سربراہ مملکت (امیر یا خلیفہ) کسی کو قاضی مقرر کرتا ہے اور اس پر شرط عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے فیصلے صادر کرنے میں مالکی، حنفی، شافعی، حنبلی یا کسی اور مخصوص مکتب فکر کا پابند رہے گا۔ اور اس سے تجاوز نہیں کرے گا تو اس شرط کو فقہ کے جملہ مکاتب فکر فاسد قرار دیتے ہیں، اختلاف اس میں ہے کہ آیا اس شرط فاسد کے ساتھ قاضی (جج) کا تقرر جائز ہو گا؟

بعض کی رائے یہ ہے کہ چونکہ شرط فاسد پہ تقرر معلق ہے لہٰذا یہ بھی باطل ہوگا لیکن حنفی مسلک کے مطابق شرط فاسد ہوگی۔ تقرر جائز ہوگا یعنی قاضی کسی خاص فقہی مکتب فکر کا پابند نہیں ہوگا۔

کیا اس سے بڑھ کر بھی عدلیہ کے وقار بالادستی اور آزادی کی کوئی ضمانت ہو سکتی ہے؟

عدلیہ اور سربراہ مملکت: عہد جدید میں بھی جسے عہد جمہوریت کہنا بجا ہوگا۔ کسی جمہوری ملک کے اندر عدلیہ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ صدر جمہوریہ یا سربراہ مملکت کو مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں طلب کر سکے، عدالت کے کٹہرے میں اسے بھی مدعی کے ساتھ کھڑا کر سکے یا کسی دوسرے مقدمے میں اس پر مقدمہ چلا سکے۔ صدر جمہوریہ یا سربراہ مملکت پر اس وقت تک عدالت مقدمہ چلانے کی مجاز نہیں ہے جب تک وہ مستعفی نہ ہو جائے۔ یا برطرف نہ کر دیا جائے۔ اسی طرح کوئی عدالت بھی صدر جمہوریہ یا سربراہ مملکت کو جب تک وہ اپنے منصب پر قائم ہے اپنے سامنے جواب دہی کے لیے طلب نہیں کر سکتی۔ لیکن اسلامی جمہوریت کی عدالت ان پابندیوں سے آزاد ہے۔ وہ سربراہ مملکت کو مدعی، مدعا علیہ یا ملزم کی حیثیت سے جواب دہی کے لیے اپنے سامنے طلب کر سکتی ہے اور نہایت اطمینان کے ساتھ اس کے خلاف فیصلہ بھی صادر کر سکتی ہے۔

حضرت عمرؓ کی جلالت شان سے کون واقف نہیں۔ وہ ایک مرتبہ ایک گھوڑا خریدتے ہیں، سودا پکا ہو چکنے کے بعد اس پر دوڑ رہے ہیں، گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے اور زخمی ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مال واپس کر دیں لیکن مالک قیمت واپس کرنے اور گھوڑا واپس لینے سے انکار کرتا ہے۔ دونوں، مدعی اور مدعا علیہ کی حیثیت سے قاضی شریح کے دیوان عدالت میں حاضر ہوتے ہیں۔ قاضی شریح مدعی کا دعویٰ اور مدعا علیہ کا جواب دعویٰ سننے کے بعد فیصلہ

صادر کرتے ہوئے امیر المومنین سے خطاب کرتے ہیں:

"جو چیز آپ خرید چکے وہ اب آپ کی ہے اور اگر واپس کرنا ہی ہے تو اس حالت میں واپس کیجیے جیسی خریداری سے پہلے تھی۔"

یہ فیصلہ سن کر خلیفہ راشد عمرؓ بن الخطاب کی پیشانی شکن آلود نہیں ہوتی بلکہ اپنے قاضی کے اس بے لاگ فیصلے سے اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں:

"ہاں بے شک یہ ہے فیصلہ؟"

اور پھر اپنے بے باک اور بے جھجک قاضی کو صلہ یہ دیتے ہیں کہ اسے کوفہ کا منصب قضا سونپ دیتے ہیں۔[1]

علیؓ کے خلاف قاضی شریح کا فیصلہ: حضرت علیؓ کی ایک زرہ گم ہوگئی۔ ایک روز ایک یہودی کے پاس انھوں نے اسے دیکھا اسے لے کر وہ قاضی شریح کی عدالت میں تشریف لائے اور فرمایا:

"یہ زرہ میری ہے جسے میں اس کے پاس دیکھ رہا ہوں، ہاں نہ میں نے اسے بیچا ہے نہ بخشا ہے۔"

قاضی شریح نے یہودی سے سوال کیا: "تم کیا کہتے ہو؟"

اس نے جواب دیا: "میں ہی اس کا مالک ہوں۔"

قاضی صاحب نے حضرت علیؓ سے پوچھا: "امیر المومنین! اپنے دعوے کا ثبوت پیش کیجیے۔"

امیر المومنینؓ نے جواب دیا: "ثبوت دینا تو مشکل ہے۔"

قاضی صاحب نے یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔

یہودی اس فیصلے سے دنگ رہ گیا اور بے ساختہ کہہ اٹھا: خلیفہ مجھے اپنے قاضی کے سامنے پیش کرتا ہے اور مقدمہ ہار جاتا ہے میں گواہی دیتا ہوں دیتا ہوں کہ خدا ایک ہے۔ اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں؟"

پھر اس نے حضرت علیؓ سے مخاطب ہو کر کہا: "بے شک یہ زرہ آپ ہی کی ہے۔ جب آپ صفین کی طرف جا رہے تھے تو مَیں بھی لشکر کے پیچھے ہو لیا تھا اسی موقعہ پر یہ زرہ آپ کے بھورے اونٹ سے گری تھی جو حاضرِ خدمت ہے!۔

حضرت علیؓ نے فرمایا: "اب یہ تمھاری ہے![4]"

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ اشعث بن قیسؓ باہمہ وجاہت و مرتبت قاضی شریح کے ایوانِ عدالت میں آئے، وہ قرار واقعی طور پر ان کا احترام بجالائے، اسی اثناء میں ایک فریادی۔ اشعث کے خلاف چارہ جوئی کے لیے حاضر ہوا، قاضی صاحب نے اشعث سے کہا:

آپ مدعی کے پاس کھڑے ہو جائیے! لیکن اشعث نے تعمیلِ ارشاد میں تأمل کیا۔

قاضی صاحب نے فرمایا: "اگر آپ مدعی کے پہلو میں کھڑے نہ ہوئے تو مَیں حکم دوں گا کہ آپ کو بجبر اس کے پاس کھڑا کر دیا جائے!"

آخر اشعث کو حکم بجالانا پڑا[4]

حضرت عمرؓ مدعا علیہ کی حیثیت سے: ایک مرتبہ حضرت عمرؓ بحیثیت مدعا علیہ زید حارث کی عدالت میں تشریف لائے۔ زید جلال خلافت سے مرعوب ہو گئے، اور مسند پر اپنے پاس حضرت عمرؓ کو بٹھانا چاہا، مگر وہ مدعی کے پہلو میں کھڑے رہے۔ مسند پر نہیں بیٹھے اور ارشاد فرمایا:-

"اس مقدمے میں آپ نے یہ پہلی بے انصافی کی ہے[5]!"

اسی طرح کا ایک واقعہ بیہقی نے حضرت علیؓ کے متعلق بھی لکھا ہے:-

خلافتِ راشدہ کے بعد جو دَور آیا، وہ بجا طور پر عہدِ سلاطین کہا جا سکتا ہے کہ خلافت کے ان خصوصیات اور اقدار کے آثار و نقوش رفتہ رفتہ اوجھل ہونے لگے تھے جنھوں نے اس عہدِ حکومت کو صحیح معنی میں حکومتِ الٰہیہ بنا دیا تھا اور جس طرح دوسری بہت سی قدریں اور خصوصیتیں مفقود و مجروح ہونے لگی تھیں۔ اسی طرح

عدلیہ کو بھی متاثر اور زیرِ دست رکھنے کی مساعی کا آغاز ہو گیا تھا لیکن امتِ مسلمہ کو اس بات پر فخر کرنے کا حق حاصل ہے کہ اس کی عدلیہ ہر دور میں خواہ وہ استبداد و قہرمانیت کا دور ہو یا لاقانونی اور مطلق العنانی کا یا آمریت اور بادشاہت کا، قضاۃ کرام نے بہ حیثیت مجموعی اپنے منصب بلند کی لاج رکھنے اور عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے اور بے خوف و اندیشہ حکومت اور حاکم کے خلاف فیصلے صادر کرنے میں بڑے سے بڑا خطرہ مول لے کر بھی اپنی شان اور آن قائم رکھی، اور اس جادۂ صواب سے کبھی منحرف نہیں ہوئے۔

محکمۂ قضا اپنے دور کی سیاست سے قطعاً متاثر نہ تھا۔ قضاۃ اپنے فیصلے صادر کرنے میں بالکل آزاد تھے۔ وہ حکومت حاکم کے میلانات و رجحانات سے متاثر نہ ہوتے تھے۔ اپنے فرائض کی ادائی میں ان پر کسی قسم کی قید و بندش نہ تھی۔ ان کے فیصلے ولاۃ و عمال خراج تک پر بلا رو رعایت نافذ ہوتے تھے۔

عہدۂ قضا کے لازمی شرائط: عہد اموی میں عہدۂ قضا کے لازمی شرائط میں یہ بات داخل تھی کہ وہ عفیف ہو، متقی ہو، عالم اور مجتہد ہو۔ عیوب سے پاک ہو، اور اللہ کے معاملہ میں لومۃ لائم کا خوف نہ کرتا ہو[۱۲]

اسٹانلی لین پول لکھتا ہے کہ عہدِ اموی و صدرِ دولتِ عباسیہ کے قاضیان مصر فقہ اسلامی کے مطالعہ میں اپنے انہماک کی وجہ سے بڑی قابلیت و تجربہ کے حامل ہوا کرتے تھے۔ جمہور کی نگاہوں میں اپنی سلامت روی اور بلندیٔ اخلاق کے لحاظ سے مشہور تھے۔ ان کے منصب کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اور ان کی ذات بڑے اثر و نفوذ کی مالک ہوتی تھی۔ اس لیے ان کے ساتھ وہ برتاؤ نہ ہوتا جو دوسرے عمال کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا، چنانچہ قاضی عموماً متعدد ولاۃ کے زمانہ میں اپنے عہدے پر فائز رہتے تھے —— اگر ان کے احکام میں کوئی بالادست اقتدار دخل دیتا، تو قاضی سب سے پہلے فوراً اپنا استعفیٰ پیش کر دیتے۔ قاضیوں کے ساتھ جمہور کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اگر

ولاۃ کے دل میں انھیں معزول کرنے کا کبھی کوئی خیال پیدا ہوتا تو جمہور کی خفگی کے ڈر سے مدت تک وہ پس و پیش میں پڑے رہتے۔ پھر عہدِ عباسیہ میں نہ صرف یہ کہ قاضیوں کو معزول کرنے کا اختیار والی کو حاصل نہ تھا، بلکہ معمولاً ان کا تقرر بھی بغداد کے فرامین کے ماتحت ہوا کرتا تھا، اور ان کی تنخواہ وغیرہ کی تعیین اور ادائی کا تعلق خاص خلیفہ کی ذات سے تھا۔[۸۰]

کندی کا بیان کردہ ایک واقعہ : کندی کی کتاب الولاۃ والقضاۃ میں مذکور ہے کہ قاضی بکار موفق کی معزولی کے مسئلہ میں متفق نہ تھا اسے وہ عہد شکنی خیال کرتا تھا نہ وہ موفق پر لعنت بھیجنے کے مسئلہ میں اتفاق کر سکا، کندی کے الفاظ یہ ہیں، اس نے (قاضی بکار نے) اسے عہد شکنی کے نام سے موسوم کیا۔ لیکن شام اور سرحدات کے تمام قضاۃ نے اس کے (موفق) کے خلاف شہادت دی۔ اس کے بعد احمد بن طولون نے ان لوگوں سے موفق پر لعنت کرنے کی درخواست کی، قاضی بکار نے انکار کیا، ابن طولون نے اصرار کیا، قاضی اپنے انکار پر مُصر رہا۔ اس سے ابن طولون غضب ناک ہو گیا۔ پہلے وہ ان کی تعظیم و تکریم کرتا تھا ان کا قدر شناس تھا اور ہر سال ان کی خدمت میں ایک ہزار دینار ہدیۃً بھیجتا تھا۔ جب اس کا عتاب ان پہ نازل ہوا تو اس نے کہلا بھیجا۔

"میرے عطایا کہاں ہیں ؟"

قاضی نے جواب میں کہا: "جوں کے توں رکھے ہیں"

اور اپنے گھر کے اندر سے سولہ تھیلیاں مہر بند نکال کر حاضر کر دیں، احمد نے انھیں رکھ لیا۔

یہ ہے عدالت کی ہر قسم کے اثر اور دباؤ سے آزادی اور درہم دینار سے بے نیازی و زہد کا نمونہ۔[۸۱]

جب عدالت کو متاثر کرنے اور اس سے حسب دل خواہ فیصلے حاصل کرنے کی مساعی کا آغاز ہوا تو اکابر فقہا میں تین طرح کے بزرگ تھے۔

۱۔ وہ حضرات جو کسی قیمت پر بھی منصب قضا قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکے، اس لیے کہ اپنے ضمیر اور کتاب وسنت کے خلاف کسی طرح کا فیصلہ کرنا ان کے لیے ناممکن تھا، مثلاً امام ابو حنیفہ رح۔

۲۔ وہ حضرات جنھوں نے منصب قضا ان حالات میں بھی قبول کیا، اور اپنے کردار بلند پر آنچ نہیں آنے دی۔ ہر طرح کے اندیشوں اور خطروں کے باوجود نہ کلمہ حق کہنے سے باز رہے، نہ اپنے ضمیر اور کتاب وسنت کی روشنی میں فیصلے کرنے سے عاجز نظر آئے۔ مثلاً امام ابو یوسف، محمد رح۔

۳۔ وہ حضرات جو حکومت اور طاقت سے مرعوب ہو گئے اور فکر و ضمیر کو تج کر، نیز کتاب وسنت کے اصولوں کو فراموش کر کے حسب دل خواہ فتوے دینے اور فیصلے صادر کرنے لگے —— لیکن اس طرح کے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی۔

امام ابو حنیفہ اور خلیفہ منصور: ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن اور پروفیسر علی ابراہیم حسن اپنی کتاب "النظم الاسلامیہ" میں اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"عدالت عباسیوں کے دور میں اس عہد کی سیاست سے بھی متاثر ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ عباسی خلفاء اپنے تمام اعمال و افعال کو مذہبی رنگ میں پیش کرنا چاہتے تھے، اس لیے قاضیوں کو مجبور کرتے تھے کہ فیصلوں میں وہ ان کے رجحانات و خواہشات کے مطابق چلا کریں، اسی کا یہ اثر تھا کہ بہت سے فقہاء قضا کا منصب قبول کرنے سے دامن بچانے لگے۔ انھیں ڈر تھا کہ شریعت اسلامی، فرائض منصبی اور ضمیر کے خلاف فتوی دینے پر انھیں مجبور کیا جائے گا یہی وجہ ہے کہ ابو جعفر منصور کے عہد میں امام ابو حنیفہ رح نے منصب قبول کرنے سے ان الفاظ میں معذرت کی تھی اور کہا تھا اللہ سے ڈرو اور اپنی اس امانت کو اس شخص کے حوالے کرو، جو خدا سے ڈرتا ہو۔ بخدا! تمھاری خوشنودی کی حالت میں اپنے

آپ کو مامون نہیں سمجھتا پھر جب تم غیض وغضب کے عالم میں آؤ، تو میں کیونکر مامون رہ سکتا ہوں؟"

امام ابو حنیفہ رح اور منصور کے ایک قاضی محمد بن عبد الرحمن کے درمیان کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی تھی کشیدگی کی وجہ یہ تھی کہ امام ابو حنیفہ رح نے عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود ابن عبد الرحمن کے فیصلوں پر نکتہ چینی کی تھی، ابن عبد الرحمن نے منصور سے شکایت کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منصور نے امام موصوف کو فتویٰ دینے سے منع کر دیا، اس عہد میں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ثابت ہے کہ خلفائے عباسیہ نے اپنے مخالف علویوں اور ان کے علاوہ اور دوسرے لوگوں سے پہلے تو امن وامان کا وعدہ کیا، پھر اس کے بعد قاضیوں کے فتووں کی آڑ لے کر اپنے وعدوں کی صریح خلاف ورزی کی، چنانچہ سفاح نے ابن ہبیرہ، منصور نے محمد بن عبد اللہ معروف بہ نفس زکیہ، اور ہارون رشید نے یحییٰ بن عبد اللہ کے ساتھ جو کچھ کیا! انھیں بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

امام ابو یوسف اور ہارون رشید: عباسیوں کے قاضی بے بدل امام ابو یوسف کے سامنے خلیفہ ہادی کے خلاف ایک مقدمہ دائر ہوا الزام یہ تھا کہ اس نے ایک دوسرے شخص کے باغ پر قبضہ کر لیا تھا۔ امام صاحب نے مدعی کے بیان سے اندازہ لگایا کہ سچا ہے لیکن گواہوں کی فوج مدعا علیہ کے پاس تھی، جس کے قبضۂ اقتدار میں سب کچھ تھا۔ امام صاحب کے دماغ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے کی ایک نئی ترکیب آئی۔ انھوں نے دوسرے گواہوں سے قطع نظر کر کے فرمایا:

"مدعی کا کہنا ہے کہ ہادی حلف اٹھائے کہ اس کے گواہ سچے ہیں۔"

"حلف — ہادی سے؟" وہ برہم ہو گیا۔ لیکن قاضی بھی کوئی معمولی نہ تھا۔ مجال دم زدن نہ تھی اس کے سامنے اس نے قسم کھانے سے انکار کر دیا اور باغ مدعی کو مل گیا۔

ایک مرتبہ کچھ ایسی ہی صورت خلیفہ ہارون رشید کے ساتھ پیش آئی۔ امام صاحب نے قسم کھانے کا مطالبہ کیا۔

فضل بن ربیع گواہ کی حیثیت سے حاضر تھا لیکن امام صاحب نے فضل کی گواہی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

خلیفہ ہارون رشید نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے دریافت کیا: "فضل کی شہادت کس لیے رد کی گئی۔؟"

امام صاحب نے جواب دیا: "میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے وہ کہہ رہا تھا میں آپ کا بندۂ ناچیز ہوں۔ اگر وہ سچا ہے تو غلام کی گواہی قبول نہیں کی جاتی، اگر اس نے غلط بیانی سے کام لیا ہے تو ایک دروغ گو کی شہادت کیسے قبول کر لوں[1]؟"

عہد عباسیہ ہی کا ایک اور واقعہ بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ واقعہ خلیفہ مامون سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی قاضی کے ادب و جلال کا کیا عالم تھا۔ اور ایک حق پسند خلیفہ کا اندازِ فکر و نظر کیا تھا۔؟

مامون کے پاس ایک فریادی عورت حاضر ہوتی ہے:

مامون نے پوچھا: "تیرا مدعا علیہ کون ہے؟"

عورت نے کہا: "امیر المومنین کا بیٹا عباس جو حضور کے پاس کھڑا ہے"۔

مامون نے قاضی یحییٰ بن اکثم کو، اور بعض کہتے ہیں۔ اپنے وزیر احمد بن ابی خالد کو حکم دیا کہ عباس کو عورت کے ساتھ بٹھا کر دونوں کے بیانات لو۔

دونوں کو بٹھا کر بیانات لینے شروع کیے گئے تو عورت زیادہ بلند آواز سے بولنے لگی۔

ایک سپاہی نے اسے دھمکایا تو مامون نے کہا۔

"اسے کچھ نہ کہو، اسے حق بلوا رہا ہے۔ اور عباس کو باطل نے گونگا کر

دیا ہے۔"

مامون نے زمینوں کی واپسی کا حکم دے دیا۔[11]

اسی طرح کا ایک اور واقعہ:

قاضی ابوطاہر اور خلیفہ معز: دولت فاطمیہ کا گل سرسبد خلیفہ معز جب مصر کے قریب پہنچا تو خلقت اس کے اشتیاق دیدار کے لیے ٹوٹ پڑی۔ لوگوں کا یہ حال تھا کہ اپنی اپنی سواریوں پر سے خلیفہ کے اجلال و اکرام کے پیش نظر اتر پڑتے، اس کے حضور پیدل آتے، اور سر عبودیت زمین پر ٹیکتے۔

البتہ اس ہجوم عام میں قاضی ابوطاہر کی شخصیت اپنی انفرادیت کی جھلک دکھاتی رہی۔ وہ اپنی سواری پر چڑھے رہے۔ جب خلیفہ کے بالکل نزدیک پہنچے تو سواری سے نیچے اترے اور بجائے عبودیت ختم کرنے کے باآواز بلند "السلام علیکم" کہا، اور خاموش ہو گئے۔

معز پر یہ حرکت گراں گزری۔ اس نے حاجب سے پوچھا:

"یہ کون شخص ہے؟ جس کی روش سب سے جدا ہے۔"

حاجب نے جواب میں عرض کیا۔ "یہ مصر کے قاضی ابوطاہر ہیں۔"

درباریوں نے قاضی ابوطاہر پر ملامت کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

قاضی صاحب بھی خاموش نہ رہ سکے۔ فرمایا:

"ومن ایٰتہ الیل والنہار والشمس والقمر لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للہ الذی خلقہن ان کنتم ایاہ تعبدون"[12]	اور رات اور دن اور سورج اور چاند اس کی نشانیوں میں سے ہیں۔ تم لوگ نہ تو سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو۔ بلکہ خدا ہی کو سجدہ کرو جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ اگر تم کو اس کی عبادت منظور ہے۔"

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قاضی ابوطاہر، فاطمی حکومت کے قاضی ضرور تھے، لیکن مذہباً اسماعیلی نہیں تھے۔ پھر بھی خلیفہ معز نے

انھیں برطرف نہیں کیا، بلکہ بحال رکھا۔[۱۳]

عہدِ عباسیہ کا ایک اور واقعہ : عباسی حکومت کے عہد کا ایک اور واقعہ: قاضی عین الدولہ کی عدالت میں حاکمِ وقت شاہد کی حیثیت سے پیش ہوا۔ قاضی صاحب نے اسے دیکھا اور فرمایا:

فرماں رواؤں کو شہادت دینا زیب نہیں دیتا۔!

وہ کھٹک گیا؛ اس کی گواہی قبول کرنے میں تامل ہے، اپنی یہ توہین برداشت نہ کر سکا۔ خشم آمیز انداز میں پوچھا: "کیا آپ کو میری شہادت قبول کرنے سے انکار ہے؟"

قاضی عین الدولہ نے جواب دیا: "آپ کی شہادت کیسے قبول کر لوں؟ جب کہ عجیبہ نامی مغنیہ ہر شب آپ کے حرم میں جلوہ آرا ہوتی ہے، اور پھر صبح صبح جب حرم سے باہر نکلتی ہے تو خمار کے باعث اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے ہوتے ہیں اور ایک باندی اسے سہارا دیتی ہے۔

یہ سن کر وہ حد درجہ برہم ہوا اور اس نے برسرِ عدالت قاضی عین الدولہ کے لیے ناسزا کلمات کا استعمال شروع کر دیا۔

قاضی عین الدولہ نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور کہا:

"میں آپ سب کو گواہ بنا کر اعلان کرتا ہوں کہ میں منصبِ قضا سے سبکدوش ہوتا ہوں"۔

یہ کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

قاضی صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد مشیروں نے کہا یہ برا ہوا اس میں حکومت کی سبکی ہے اور بات اگر بغداد تک پہنچ گئی تو نہ جانے کیا صورت پیش آئے، لہٰذا قاضی عین الدولہ کو راضی کر لینا چاہیے۔ بادشاہ خود قاضی صاحب کے غریب خانے پر پہنچا، معذرت کی اور انھیں استعفا واپس لینے پر آمادہ کر لیا۔[۱۴]

قاضی عزیز الدین اور ملک صالح: قاضی عزیز الدین بھی بڑے دبدبے اور طنطنے کے بزرگ تھے، یہ عہد ایوبیہ کا واقعہ ہے۔ وہ ملک صالح فرماں روائے دمشق سے اس باعث خفا ہوئے کہ اس نے صیدا اور شقیف صلیبی عیسائیوں کے حوالے کر دیے تھے۔ قاضی صاحب کی برہمی کا یہ عالم تھا کہ خطبے میں انھوں نے صالح کا نام لینا بھی بند کر دیا اور اپنے منصب سے مستعفی ہو کر مصر چلے گئے۔

آخر سلطان صالح نے اپنا ایک قاصد ان کی خدمت میں بھیجا اور اسے تاکید کی کہ جس طرح بھی ممکن ہو، انھیں راضی کرے اور واپس لے آئے۔

قاصد مصر آیا، اور قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا۔

"آپ کے مصر آجانے سے سلطان بہت رنجور ہیں۔ وہ تو آپ کے قدر شناس اور مداح ہیں۔ ان کی آرزو ہے کہ آپ واپس آجائیں، اور حسب سابق اپنا منصب قضا سنبھال لیں۔ وہ ٹھہرے فرماں روا، آپ ان کے پاس چلیے، ان کے ہاتھوں کو چومیے، اور انھیں خوش کر لیجیے۔"

قاضی عزیز الدین نے جواب دیا: "بہت خوب ــــ میں اسے بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ سلطان صالح میرے ہاتھوں کو بوسہ دے۔ نہ کہ میں اس کے ہاتھ چوموں![۱۵]"

غرض اسلامی جمہوریت میں عدلیہ کی آزادی اور قضاۃ کی بے باکی سے متعلق اتنا مواد موجود ہے کہ اگر اس کا استقصار کیا جائے تو ایک پورا ضخیم دفتر تیار کیا جا سکتا ہے لیکن جو مثالیں اوپر پیش کی گئیں وہ بھی ناکافی نہیں ہیں۔

ماخذ:

۱۵ الاحکام السلطانیہ: ص ۱۱۳۔

۲ھ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (استاذ سید قطب شہید) طبع مصر، ص ۲۵۵۔
۳ھ " " "
۴ھ تاریخ القضاء فی الاسلام (محمد بن محمد بن عرنوس) مطبوعۃ مصر، ص ۳۵۔
۵ھ کنز العمال، ج ۳، ص ۱۷۴۔
۶ھ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ۳۶۰۔
۷ھ The History of Egypt in the Middle Age (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن)
۸ھ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر۔
۹ھ " "
۱۰ھ ابو حنیفہؒ (عبد الحلیم الجندی) مطبوعہ مصر، بحوالۃ العدالۃ الاجتماعیہ (استاذ سید قطب شہید)
۱۱ھ الاحکام السلطانیہ، ص ۱۳۴
۱۲ھ سورہ حم، پارہ ۲۴، آیت ۳۸ رکوع ۵ -
۱۳ھ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۵۵
۱۴ھ تاریخ القضاۃ فی الاسلام (محمد بن عرنوس) طبع مصر، ص ۱۲۵۔
۱۵ھ " " "

(۱۲)

تعزیر و عقوبت اور اس کے مستثنیات

بقول حضرت عمرؓ ہر شخص ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوا ہے۔ آزادی اس کا حق ہے اور اس حق کو ہرگز چھینا نہیں جا سکتا، لیکن ہر چیز خواہ وہ کسی نوعیت کی بھی ہو، اپنے کچھ حدود و شرائط رکھتی ہے اور ان حدود و شرائط کی پاسبانی اور نگہداری اس حکومت کا فرض ہے جو عوام کی مرضی سے بنائی گئی ہو، جس کی تعمیر، تخریب اور تشکیل و تنسیخ میں عوام کی مرضی فیصلہ کن ہو، جو اپنے قیام و بقا میں عوام کے اقتدار اعلیٰ کی رہین منت ہو، یہ ایسا جمہوری اصول ہے جو تقریباً متفق علیہ ہے کسی کو بھی اس سے یا رائے اختلاف نہیں، اسلامی جمہوریت نے بھی ان اصولوں کو پورے طور پر مرعی رکھا ہے۔ اور ان اصولوں پر مستزاد یہ کہ وہ اپنے اقدام و عمل میں کتاب و سنت کی پابند بھی ہے، اس لیے اس کی وضع و ہیئت عام جمہوریتوں کے مقابلہ میں زیادہ نمائندہ حیثیت کی حامل ہے، لہٰذا انفرادی آزادی کے حدود و شرائط کی پاسبانی اور نگہداشت جتنی بہتر اور جتنی بے لوث وہ کر سکتی ہے کسی اور سے ممکن نہیں۔

انفرادی آزادی کے حدود: بلاشبہ انفرادی آزادی ایک غیر اختلافی اور غیر نزاعی مسئلہ ہے، لیکن اس آزادی کو فتنہ نہیں بننا چاہیئے۔ فساد انگیز نہیں ہونا چاہیے۔ امن شکن نہ ہونا اس کے لیے ضروری ہے، دوسروں کی عافیت اور حکومت کے نظم و استحکام میں خلل ڈالنے کا حق اسے نہیں دیا جا سکتا، اور اگر ایسا ہو تو حکومت اپنے اختیارات سے مسلح ہو کر سامنے آئے گی۔

اور فتنہ و فساد کو کھیل دے گی، وہ قاتل کو معاف نہیں کر سکتی۔ چور سے صرفِ نظر نہیں کر سکتی، سماج دشمن عناصر کو نظر انداز نہیں کر سکتی، متاعِ عصمت و ناموس لوٹنے والوں کے لیے اس کے ہاں رعایت کا دروازہ بند ہے۔

ایک غور طلب مسئلہ: اس موقع پہ ایک خاص پہلو توجہ طلب ہے، عام جمہوریتیں، جو صرف انسانی فکر و رائے کی تخلیق ہوتی ہیں، اپنی مقننہ میں کثرتِ رائے کے بل پر جس قسم کے اختیارات چاہیں حاصل کر سکتی ہیں، اور ان کا بے محابا استعمال بھی کر سکتی ہیں، بڑی سے بڑی برائی اگر "قانون" بن جائے تو وہ جائز ہے۔ زیادہ سے زیادہ ناجائز، ناروا اور نامناسب اختیارات اگر "بل" کی صورت میں پیش ہو کر "ایکٹ" بن جائیں تو ان کا حد درجہ بے رحمانہ اور غیر انسانی استعمال عین جمہوریت ہے۔ بھارت میں، قبرص میں، اسرائیل میں جمہوریت کی سفاکی سے اقلیتیں جس طرح متاثر ہو رہی ہیں۔ بلکہ جس طرح ان کی نسل کشی کی جا رہی ہے، اس سے کون ناواقف ہے؟ انسانی جمہوریت، دوسروں پر پابندی لگا سکتی ہے لیکن وہ خود کسی پابندی کو قبول کرنے کی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔ اکثریت کا فیصلہ ناطق ہے اور حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقلیت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ سرِ تسلیم خم کر دے۔ ورنہ بہ جرمِ بغاوت تعزیر و عقوبت کے شکنجے میں کچلنے اور پسنے کے لیے تیار رہے، لیکن اسلامی جمہوریت نے جہاں فرد کی آزادی کو چند حدود و شرائط کا پابند کیا ہے، وہاں حکومت کے لیے بھی چند حدود و شرائط مقرر کر دیے ہیں جن سے وہ سرِ مو تجاوز نہیں کر سکتی، یعنی جس طرح فرد اپنی آزادی کا بے محابا استعمال نہیں کر سکتا، وہاں اسلامی جمہوریت بھی آنکھیں بند کر کے اور کان بہرے کر کے، اور مؤثرات و پس منظر کو نظر انداز کر کے اندھا دھند تعزیر و عقوبت کے اختیارات استعمال نہیں کر سکتی، وہ "مؤثر بہ ماضی" قانون نہیں بنا سکتی اگر ایسا ہوتا تو حضرت حمزہ رضؓ کا کلیجہ چبا جانے والی ابوسفیان رضؓ کی بیوی کو پروانۂ عفو

عطا نہ ہوتا، اور نہ اس مجرم کو معافی عطا کی جاتی، جو حضرت عثمانؓ کی رفیقہ حیات اور آنحضرت صلعم کی صاحبزادی کی وفات کا سبب اپنی سفاکی کے باعث بنا تھا۔ اور نہ مکہ مکرمہ کی اس پوری آبادی کو معاف کیا جاتا، جس نے اوائل اسلام میں، اسلام کے نام لیواؤں کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا، اور ان کے املاک و جائداد، مکان اور کھیت، ہر چیز پر قبضہ کر لیا تھا، اور نہ اسے جبر و جور سے غصب کردہ املاک و جائداد پر قابض رہنے دیا جاتا، اور نہ مرتدین و منافقین سے زمام اقتدار و اختیار ہاتھ میں آنے کے بعد در گزر کا معاملہ کیا جاتا۔

تعزیر و عقوبت کے حدود: اسلامی جمہوریت اپنے حدود میں رہ کر تعزیر و عقوبت کا اجراء اور نفاذ کر سکتی ہے۔ لیکن جرم سے بڑھ کر سزا نہیں دے سکتی۔

قرآن کریم نے اس سلسلے میں جو حدود مقرر کر دیئے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ ان اللہ یامرکم بالعدل والاحسان[۱] — یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔

۲۔ جزاء سیئۃ، سیئۃ مثلھا[۲] — یعنی برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔

۳۔ الفتنۃ اشد من القتل[۳] — یعنی فتنہ و فساد قتل سے بھی زیادہ شدید ہے۔

۴۔ وانزلنا معھم الکتاب والمیزان، لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ باس شدید ومنافع للناس[۴] — یعنی ہم نے انبیاء کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کیا، تاکہ عدل و انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہا پیدا کیا، (جو بہ شکل اسلحہ) انتہائی خطرناک بھی ہے اور (بہ صورت اشیاء) منفعت بخش بھی!

ان آیات کریمہ سے جن امور پر روشنی پڑتی ہے، یہ ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ سزا کا حکم دیتا ہے، ساتھ ہی ساتھ احسان کا بھی، یعنی اگر بالکل ناگزیر ہو تو سزا دی جائے، ورنہ عفو و درگذر سے کام لیا جائے۔

۲- سزا دی جائے تو وہ جرم سے زیادہ سنگین نہ ہو، زیادہ سے زیادہ جو سزا دی جا سکتی ہے، اسے بس جرم کے مساوی ہی ہونا چاہیے۔

۳- فتنہ و فساد کو ہر قیمت پر دبانا اور کچلنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ بجائے خود قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے، اسے اگر پھلنے پھولنے دیا جائے، تو یہ کشت و خون کے ختم نہ ہونے والے سلسلے کا موجب ہو سکتا ہے جو آخرکار پوری قوم اور ملک کے لیے تباہ کن اور ہلاکت خیز ثابت ہوگا۔

۴- انبیاء کو "کتاب" دی گئی، تاکہ حدود الٰہی کسی وقت بھی نظرانداز نہ ہونے پائیں، انھیں میزان (ترازو) عطا کیا گیا، تاکہ وہ مساوات کے ساتھ انصاف کر سکیں۔ انھیں لوہا دیا گیا، تاکہ فتنہ و فساد کی صورت میں وہ اسلحہ سے کام لیں اور امن و عافیت کے دور میں بھی لوہا، تلوار اور سنگین کے بجائے منفعت بخش کاموں میں استعمال کیا جائے۔

ایک اہم نکتہ: اس جگہ یہ نکتہ خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ انبیاء کے ساتھ "نزولِ آہن" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نبی محکومیت کی زندگی پر نہ قانع ہو سکتا ہے۔ نہ اس پر فخر کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ محکومیت کی صورت میں، نہ "کتاب"، اس کے کسی کام آ سکتی ہے، نہ "میزان" سے کام لے سکتا ہے، نہ حدید (لوہا) کا استعمال کر کے فتنہ و فساد کا قلع قمع کر سکتا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ اسلام صرف ایک طرزِ عبادت ہی نہیں ہے، آئینِ حیات اور دستورِ زندگی بھی ہے۔ لہٰذا وہ خیر کا داعی بھی ہے اور شر کا استیصال کرنے والا بھی۔

"اسلام کے قانونِ جنائی یعنی تعزیرات میں مجرمین کی پانچ جماعتوں کے علاوہ کسی مجرم گروہ کے لیے عقوبات معین، و مقرر نہیں کی گئی ہیں۔

ایک تو وہ لوگ جو خدا اور رسول سے برسرِ جنگ ہوتے ہیں، اور خدا کی اس زمین کو فساد و فتنہ کی جولان گاہ بنا دیتے ہیں۔

دوسرے وہ لوگ جو پاک دامن اور عصمت مآب خواتین پر اتہام لگاتے ہیں۔

تیسرے وہ لوگ جو قتل کے مرتکب ہوتے ہیں۔

چوتھے وہ لوگ جو زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔

پانچویں وہ لوگ جو چوری کرتے ہیں۔

مذکورہ جرائم کے علاوہ جتنے جرم بھی ہیں، ان کے لیے اسلام نے کوئی عقوبت اور تعزیر مقرر نہیں کی، بلکہ اسے حاکموں کی صواب دید پہ چھوڑ دیا ہے کہ وہ امن و امان، دفع شر، ازالۂ فساد اور استیصال فتنہ کے پیشِ نظر جو عقوبت اور تعزیر مناسب سمجھیں جاری کریں، اس لیے کہ بقیہ جرائم، امتوں اور قوموں کے حالات، ماحول، زمانہ اور عصر کے ساتھ اپنی نوعیتیں بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ہر امت کے ارباب اقتدار و اختیار اور ارباب حل و عقد کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا کہ وہ خود عقوبات و تعزیرات کا مناسب حال تقرر کریں اور عقوبت کا جو اصل مقصد ہے اسے پیشِ نظر رکھیں[۵]۔

علامہ ابن قیم کا ارشاد: چنانچہ علامہ ابن قیم فرماتے ہیں:

سنن دار قطنی میں جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جارح سے اس وقت تک تاوان لینے سے منع فرمایا ہے جب تک مجروح کا زخم مندمل نہ ہو جائے؛ اس سے ثابت ہوا کہ زخم جب تک مندمل نہ ہو جائے، یا سرایت مستقر کی صورت نہ اختیار کر لے، قصاص لینا درست نہ ہوگا۔

یہ بھی ثابت ہوا کہ ضرب کا قصاص ہے، خواہ وہ ضرب ڈنڈے

لگائی گئی ہو، یا کسی اور چیز سے۔
نیز اگر مضروب قصاص کی جلدی کرے، پھر اس کے بعد اس کا زخم سرایت اختیار کرے۔ یعنی ایک عضو سے دوسرے عضو تک پہنچ جائے۔ تو پھر قصاص لے چکنے کے بعد اس سرایت کی الگ سے کوئی سزا نہیں ملے گی، قصاص کافی سمجھا جائے گا۔ اب امام کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ مجرم کو قید کرے یا کوئی اور سزا دے۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ مسلمان نے اگر معاہد کو عمداً قتل کیا ہے تو اس کی دیت اتنی ہی ہوگی جتنی ایک مسلمان کی ہوتی ہے، اور اگر غلطی سے قتل کیا ہے تو ایک قول کے مطابق مسلمان سے نصف اور دوسرے قول کے مطابق ایک تہائی دیت دینا ہوگی۔

امام شافعیؒ کا ارشاد ہے کہ قتل خواہ غلطی سے ہو، یا جان بوجھ کر ایک تہائی دیت واجب ہوگی۔

امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ جب قصاص کا اصول دونوں میں (یعنی مسلم اور غیر مسلم میں حاوی ہے تو دیت بھی مساوی ہوگی[۶]۔

زنا کی سزا اور اس کے مستثنیات: زنا کی سزا سزائے تازیانہ ہے۔ یا رجم (سنگساری)؟ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔

شیخ محمد خضری بک نے اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے:
"اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں زانی کی حد (سزا) بغیر کسی تفصیل کے سو کوڑے مقرر کی ہے۔ جیسا کہ سورۂ نور میں صراحت سے موجود ہے[۷]۔
لیکن سنت کی رو سے شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا جائے گا اور غیر شادی شدہ کو سزائے تازیانہ ملے گی، صحیح مسلم میں مروی ہے کہ ابو اسحق شیبانی نے عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے سوال کیا:
کیا رسول اللہ صلعم نے کسی کو سزائے سنگساری دی ہے؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "ہاں دی ہے"۔

اس کے بعد ابو اسحٰق نے پھر سوال کیا۔

"آنحضرت صلعم نے سنگساری کی سزا سورۂ نور نازل ہونے سے پہلے دی تھی یا بعد میں؟"

عبداللہ نے جواب دیا: "میں نہیں جانتا۔"

لیکن علامہ ابن قیمؒ اس مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں جو سنگساری کا قائل ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

اگر کوئی آزاد شادی شدہ شخص کسی باندی سے زنا کرے تو بھی سنگسار کیا جائے گا۔

شادی شدہ شخص کی سزائے زنا سنگساری ہے۔

زانی جب تک چار مرتبہ اقرارِ جرم نہ کرلے، سزا نہیں پائے گا، دو یا تین مرتبہ کرے تو اس پر حد جاری نہیں ہوگی۔ کیونکہ نصاب اقرار کی تکمیل نہیں ہوئی۔ امام کو چاہیے کہ اس سے اعراض کرے اور عدم تکمیل اقرار کے باعث اس کو ماخوذ نہ کرے۔

پاگل یا نشہ میں دھت شخص کا اقرار لغو ہے۔ اس پر اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح اس کی طلاق، عتاق، قسم اور وصیت بھی غیر معتبر ہے۔

امام کے لیے انسب یہ ہے کہ اقرار زنا کرنے والے کو، عدم اقرار پر مائل کرے۔

جو شخص تحریم زنا سے لاعلم ہے، اس پر حد جاری نہیں ہوگی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زانی سے حکم زنا کے بارے میں پوچھا تھا، اور اس نے کہا تھا، میں نے اس باندی کے ساتھ وہ فعل حرام کیا ہے کہ اگر شوہر بیوی کے ساتھ کرے تو حلال ہوتا ہے۔

حاملہ عورت پر حد [illegible] نہیں ہوتی، جب تک وہ بچہ نہ جن لے، اسے پوری مدت تک دودھ نہ پلا لے۔

: اہل معاصی پر تائب ہونے کے بعد سب وشتم ناجائز ہے۔
: حد زنا میں جو شخص قتل ہوا اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔
: زنا کا اقرار کرنے والا اگر اثنائے حد میں بھاگ جائے تو چھوڑ دیا جائے پھر اس پر حد پوری نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ یہ فرار یا تو اقرارِ زنا سے رجوع ہے، یا تکمیل حد سے توبہ ہے۔ اب اس پر حد جاری نہیں ہوگی۔ ہمارے شیخ ابن تیمیہؒ کا مسلک یہی ہے[۹]

مذکورہ تفصیل سے یہ معلوم ہوگیا کہ زانی کے لیے سزائے سنگساری کے جو اصحاب واکابر قائل ہیں، وہ بھی اس سلسلے میں اتنی حدود وشرائط عائد کرتے ہیں کہ سنگساری تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے۔

ثبوت زنا کی دو ہی صورتیں ہیں:۔

۱۔ اقرار۔ ۲۔ شہادت۔

پہلی صورت میں امام خود اسے مائل کرتا ہے کہ اقرار سے باز آ جائے، نہ باز آئے، اور اثنائے حد میں بھاگ کھڑا ہو تو حد ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے اقرار سے رجوع کر لیا۔

دوسری صورت میں شہادت کے شرائط اتنے کڑے رکھے ہیں کہ ان کی تکمیل تقریباً ناممکن ہے، گواہوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ثقہ ہوں، تعداد میں چار ہوں شہادت عینی ہو۔ بیانات میں تضاد نہ ہو۔ اس طرح کی شہادت کا مہیا ہونا ظاہر ہے، آسان نہیں۔ مطلب یہ کہ معمولی سے شبہ پر بھی حد ساقط ہو جائے گی۔

: نو مسلم زنا کی حد سے ناواقف ہو تو حد ساقط ہے۔

شیخ محمد خضری بک نے اسلامی حدود پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"قرآن کریم نے حدود سے متعلق جو اصول مرعی رکھے ہیں یہ ہیں:

۱۔ صلاح امت، ۲۔ زجر مجرم، ۳۔ شدت تاثیر کے پیش نظر عقوبات جسمانی کا نفاذ[۱۱]

بلاشبہ یہ اصول بجا اور درست ہیں، لیکن جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا ہے۔ عقوبات کے نفاذ میں زیادہ سے زیادہ مستثنیات رکھے گئے ہیں۔ تاکہ ایک طرف سزا کی دہشت قائم رہے، دوسری طرف اگر ذرا بھی گنجایش نکلتی ہو تو سزا کا نفاذ نہ کیا جائے۔

جسمانی عقوبات کی شدتِ تاثیر کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سعودی عربیہ میں جہاں سزائے رجم و قطع ید جاری ہے۔ برس ہا برس میں شاذ و نادر ہی کوئی اس طرح کے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔

چوری کی سزا اور اس کے مستثنیات: چوری کی سزا قطع ید ہے یہ بھی حد درجہ سخت ہے، اس لیے اس میں مستثنیات زیادہ سے زیادہ رکھے گئے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جس مال کی اصل مباح ہو اس میں قطع ید نہ کیا جائے۔ جیسے شکار، گھاس۔

امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ سارقِ مصحف کو (قرآن) قطع ید کی سزا نہیں ملے گی۔

اگر صغر سن غلام جو ناسمجھ ہو یا عجمی، چرا لے تو قطع ید نہ کیا جائے۔

چوری کی تعریف ہے کہ کوئی چیز بحفاظت رکھی ہو اور اڑالی جائے بصورت دیگر وہ چوری نہیں۔ لہٰذا اس کی سزا بھی قطع ید نہیں ہے۔

"حفاظت (حرز) کے متعلق فقہاء کا اختلاف ہے۔ داؤد متفرد ہیں۔ وہ حفاظت کا کچھ اعتبار نہیں کرتے۔ ہر سارق کو خواہ حفاظت میں سے سرقہ کرلے، یا غیر حفاظت میں قطع ید کا حکم دیتے ہیں اور جمہور جو قطع میں حفاظت کا اعتبار کرتے ہیں۔ غیر حفاظت سے سرقہ کرنے والے کو قطع ید کی سزا نہیں دیتے۔

نبی کریم صلعم سے مروی ہے کہ گھوڑے کے سرقہ میں جب تک چورا صطبل میں نہ آئے قطع ید نہیں کر سکتے، اسی طرح اگر مستعار لے کر انکار کر دے قطع ید نہیں۔

جو علماء حفاظت کو شرط کہتے ہیں۔ وہ اس کی کیفیت میں مختلف ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ ہر شے قیمتی اور غیر قیمتی کی حفاظت یکساں قرار دیتے ہیں۔

بچے کو قطع نہ کیا جائے۔ مدہوش بحالت مدہوشی چوری کرے تو قطع ید نہ کیا جائے۔

غلام اپنے آقا کے مال کی چوری کرے یا باپ بیٹے کے مال کی چوری کرے تو قطع ید نہ کیے جائیں[۱۲]

ان مستثنیات کی رُو سے صرف قطع ید کی حد ساقط ہو گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ چور کو سرے سے سزا ہی نہیں ملے گی، حاکمِ وقت شرعی طور پر اس امر کا مجاز ہے کہ تادیبًا سزا دے، خواہ جرمانے، خواہ کچھ عرصے کے لیے حبس و قید کی، یا حالات کے لحاظ سے جو سزا بھی عدل و قسط کو ملحوظ رکھتے ہوئے مناسب سمجھے دے سکتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ نافذ ہو گی بلکہ جائز بھی ہو گی۔

اوپر کی سطروں میں بتایا گیا ہے کہ چوری وہیں مانی جائے گی جہاں مال حفاظت سے رکھا ہو۔ ایسی صورت میں قطع ید لازمی ہے۔ برعکس صورت میں کوئی دوسری سزا دی جائے گی، قطع ید سے احتراز کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں چند اور مستثنیات کا ذکر بھی نامناسب نہ ہو گا جو فقہ حنفی کی کتاب ہدایہ سے ماخوذ ہیں، چونکہ ان کی قانونی حیثیت ہے اس لیے یہ تفصیل ضروری ہے:

۱۔ دارالاسلام میں جو چیز عام اور کم قیمت ہو۔ مثلاً خشک لکڑی، بانس مچھلی، پرندے، شکار، عمدہ مٹی اور چونا، ان چیزوں کی چوری پر چور کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔

۲۔ ایسی چیزیں جو جلد خراب ہو جاتی ہوں، مثلاً دودھ، گوشت اور تازہ میوے۔ ان کی چوری پر قطع ید نہیں۔

۳۔ درختوں پر لٹکے ہوئے پھل اور وہ کھیتی جو کاٹی نہ گئی ہو۔ ان کی چوری

پر قطع ید نہیں۔

۴۔ سرور انگیز اور سست کر دینے والی چیزوں پر بھی قطع ید نہیں۔

۵۔ طنبورا یعنی آلاتِ موسیقی کی چوری پر بھی قطع ید نہیں۔

۶۔ قرآن چاہے اس پر سنہری کام کیوں نہ کیا گیا ہو، اس کی چوری پر قطع ید نہ ہوگا۔

۷۔ دفاتر یعنی رجسٹر کا غذات وغیرہ، اگر اس میں قرآنِ مجید کی تفاسیر، حدیث اور فقہ کی کتابیں ہی کیوں نہ ہوں ان کی چوری پر قطع ید نہیں۔

۸۔ کتے اور چیتے کے چور کا ہاتھ نہیں کٹے گا۔

۹۔ خیانت کرنے والے مرد یا عورت پر حد نہیں۔

۱۰۔ لوٹ لینے اور چھین لینے والے کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔

۱۱۔ کفن چور پر بھی قطع ید نہیں۔

۱۲۔ بیت المال یا سرکاری خزانہ سے چوری پر ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے کیونکہ عوام کی مشترکہ ملکیت ہے۔

۱۳۔ اگر کسی مال میں چور کی شرکت ہے تو ایسے مال کی چوری پر بھی حد نہیں۔

۱۴۔ قرض دار نے اگر بقدر قرض چوری کر لی ہے تو اس پر حد نہیں۔

۱۵۔ جس نے والدین، بیٹے یا قریبی رشتہ دار کی چوری کی اس پر بھی حد نہیں۔

۱۶۔ اگر کسی نے قریبی رشتہ دار کے گھر سے کسی غیر آدمی کا مال چرا لیا، تو اس کے ہاتھ نہیں کاٹنے چاہئیں۔

۱۷۔ مالِ غنیمت کے چور کے ہاتھ نہیں کٹیں گے۔

۱۸۔ جس نے حمام یا ایسی جگہ سے جہاں آنے جانے کی لوگوں کو عام اجازت ہے۔ مثلاً ہوٹل، تجارتی دکانیں وغیرہ، کوئی چیز چوری کر لی تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

۱۹۔ مہمان اگر میزبان کی چوری کر لے تو اس کے ہاتھ نہیں کٹیں گے۔

۲۰۔ جس نے گھر سے چوری کی لیکن موقع پر پکڑا گیا۔ تو اس پر بھی حد واجب

نہ ہوگی۔

۲۱۔ اگر چور نقب لگا کر گھر میں داخل ہوا، اور مال لیا، جسے دوسرے چور نے گھر سے باہر اس سے لے لیا تو ان دونوں پر قطع ید نہیں۔

۲۲۔ چوری کر کے اگر گدھے پر مال لاد لیا، اور اس کو گھر سے ہانک کر باہر لے آیا تو اس پر بھی حد عائد نہ ہوگی۔

۲۳۔ نقب لگا کر اگر کوئی چیز ہاتھ سے نکال لی تو قطع ید نہیں۔

۲۴۔ اگر کوئی آستین سے نکلی ہوئی تھیلی کاٹ لے تو اس پر بھی حد جاری نہ ہوگی۔

۲۵۔ اگر اونٹوں کی قطار سے ایک اونٹ یا اس کا بوجھ چُرا لیا جائے تو بھی قطع ید نہ ہوگا۔

۲۶۔ چور اگر معاملہ کے عدالت میں جانے سے پہلے مال واپس کر دے تو اس پر قطع ید نہیں۔

۲۷۔ اگر عدالت کے فیصلہ کے بعد مالک نے چور کو مال بخش دیا تو اس کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔

۲۸۔ اگر چور بلا دلیل کے یہ دعویٰ کر دے کہ مال مسروقہ میرا ہے تو اس پر کوئی حد نہیں۔

۲۹۔ اگر دو آدمیوں نے چوری کا اقرار کر لیا، بعد میں ایک شخص نے کہا کہ یہ مال میرا ہے تو ان دونوں کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے[۱۳]۔

علامہ ابن قیم کے بیان کردہ مستثنیات: علامہ ابن قیمؒ نے بھی اس سلسلے میں کچھ مستثنیات ذکر کئے ہیں:

"کھجور کے چور سے آپؐ نے قطع ید کی سزا ساقط فرما دی اور فیصلہ کیا کہ اگر اس کے منہ میں کچھ پائی جائے تو محتاج ہے، اس پر کوئی سزا نہیں ہے۔

اور جس نے ڈال سے توڑا، اس سے دوگنا تاوان لیا جائے گا، اور سزا

دی جائے گی۔

اور جس نے کھلیان سے چوری کی اس کے ہاتھ کاٹے جائیں گے، بشرطیکہ مالیت نصاب ایک ترکش کی مالیت کے برابر ہو۔

آگے چل کر علامہ ابن قیمؒ نے اس سلسلے میں ایک بہت اہم فقہی مسئلہ بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:

"قطع ید کے بعد چور کا علاج حاکم کے ذمے ہے۔"

آپؐ کا یہ ارشاد کہ قطع ید کے بعد اس کا علاج کرو، پھر میرے پاس لاؤ، اس بات کی دلیل ہے کہ مصارفِ علاج سارق کے ذمہ نہیں، حکومت کے ذمہ ہوں گے۔[۱۴]

مذکورہ مستثنیات میں تین چیزیں واضح نظر آتی ہیں:

۱۔ عدم حفاظت (حرز) ۲۔ مالک کی عدم تخصیص۔

۳۔ مال عام۔

ایسی صورت میں ایک قابلِ تعزیر سماجی جرم تو ہوا ہے، لیکن اتنا نہیں کہ ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔ خضری کا بیان ہے:

"عقوبات کے اجراء و نفاذ میں از روئے سنت احتیاط لابدی ہے جیسا کہ ترمذی میں ام المومنین عائشہ رضؓ سے مروی ہے۔

"جہاں تک ممکن ہو نفاذِ حد کو ٹال دو۔ امام اگر عفو میں غلطی کرتا ہے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ عقوبت میں غلطی کا مرتکب ہو۔[۱۵]"

ماخذ:

۱ھ سورۂ نحل، پارہ ۱۴، آیت ۹۳، رکوع ۱۲،

۲ھ سورۂ شوریٰ، پارہ ۲۴، آیت ۴۱، رکوع ۴،

۳ھ سورۂ بقر، پارہ ۲، آیت ۱۹۲، رکوع ۲۴،

۴ سورۂ حدید، پارہ ۲۷، آیت ۲۶، رکوع ۴،

۵ السیاستہ الشرعیہ (علامۂ عبدالوہاب خلاف) مطبوعہ مصر، ص ۷۳،

۶ زادالمعاد سوم علامہ ابن قیمؒ طبع مصر) ص ۴۸۴ ۱ ۴۸۵، ۴۸۷ -

۷ سورۂ نور، پارہ ۱۸، رکوع ۱، آیت ۳ -

۸ تاریخ التشریع الاسلامی (الشیخ محمد الخضری بک) مطبوعہ مصر، ص ۹۹، ۱۰۰ -

۹ زادالمعاد سوم، (علامہ ابن قیمؒ) طبع مصر، ص ۴۹۲، ۴۹۳ -

۱۰ الاحکام السلطانیہ، ص ۲۹۸

۱۱ تاریخ التشریع الاسلامی (الشیخ محمد الخضری بک) طبع مصر، ص ۱۰۱، ۱۰۲ -

۱۲ الاحکام السلطانیہ ص ۳۰۰ تا ۳۰۲،

۱۳ ہدایہ اولین کتاب السرقہ، باب مایقطع فیہ ومالا یقطع فیہ، ص ۵۱۲، ۵۱۳،
۱۵۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۶ -
(ثقافت مارچ ۱۹۶۴ء)

۱۵ تاریخ التشریع الاسلامی، طبع مصر، ص ۱۰۲ -

(۱۳)

مثالی اسلامی حکومت

عہد خلافت راشدہ اور بعد از عہد خلافت راشدہ کے امثال و آثار

اسلامی جمہوریت میں اور دوسری جمہوریتوں میں ایک بے حد اہم اور بنیادی فرق یہ ہے کہ ان کی قانون سازی تمام تر عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، ایوان بکثرتِ آرا جس بل کو پاس کر دے گا، وہ ایکٹ بن جائے گا اور کتاب الآئین میں شامل کر لیا جائے گا۔ مثلاً اگر برطانوی پارلیمنٹ یہ فیصلہ کرے کہ آئندہ سے اس کا نظام اشتراکی ہو گا تو ہر مجسٹی کوئین کو اس پر مہر تصدیق ثبت کرنا ہو گی۔ امریکی جمہوریت اگر یہ فیصلہ کر دے کہ اس دیس میں تمام صنعتیں قومیا لی جائیں گی، تو یہ فیصلہ عمل پذیر ہو کر رہے گا۔ شورائیہ روس اگر یہ فیصلہ کر دے کہ اس نے اشتراکیت کو خیر باد کہا، اور سرمایہ دارانہ نظام حکومت رائج کرے گی تو اس فیصلے سے کون روک سکتا ہے؟ غرض ہر جمہوریت، جمہوری نمایندوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ جو فیصلہ بھی کر دیں نافذ ہو کر رہتا ہے۔ حد یہ ہے کہ برطانیہ میں رضاکارانہ اور رضامندانہ لواطت بھی اب جرم نہیں ہے حالانکہ اس سے پہلے یہ اخلاقی جرم وہاں اتنا سنگین تصور کیا جاتا تھا کہ اس سلسلے میں بعض مشہور ادیب سزایاب ہوئے اور جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں برس ہا برس رہ کر اس حالت میں رہا ہوئے کہ نیم مردہ ہو چکے تھے، اور آخر کار شرم و ندامت کے باعث ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔

چند بنیادی اصول: لیکن اسلامی جمہوریت جہاں کثرت آراء کا احترام کرتی ہے۔ جمہوری نمائندوں کے افکار و خیالات کو پورا پورا وزن دیتی ہے۔ رائے عامہ کی وقعت میں کوتاہی نہیں کرتی، وہاں چند بنیادی اصول ایسے ہیں۔ جو خدا کی طرف سے نافذ ہو چکے ہیں۔ اور ان اصولوں میں کسی طرح کا ردوبدل نہیں کیا جا سکتا، انھیں جوں کا توں ماننا اور نافذ کرنا پڑے گا، ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے بعد وہ ہر طرح سے آزاد اور خود مختار ہے، اور جو چاہے کر سکتی ہے۔ اس کا ہر فیصلہ واجب التعمیل اور قابل نفاذ ہوگا۔ اگر ان اصولوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ممکن ہے وہ جمہوریت رہے۔ لیکن اسلامی جمہوریت کہلانے کی سزاوار نہیں ہوگی۔

اور یہ بنیادی اصول جن کی پابندی لازمی اور ناگزیر ہے۔ نہ خلاف عقل ہیں، نہ قابل عمل، اس لیے کہ جو دین خود اپنے آپ کو آسان دین۔ "الدین یسر" کہتا ہو، نہ کبھی خلافِ عقل بات کا حکم دے سکتا ہے، نہ کوئی ایسا فرمان صادر کر سکتا ہے، جو ناقابل عمل ہو۔

کن اصولوں سے انحراف نہیں کیا جا سکتا؟: سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ بنیادی اصول کیا ہیں، جن سے انحراف نہیں کیا جا سکتا؟

مختصر جواب یہ ہے کہ ہر اچھی بات کا اخذ و قبول، اور ہر قسم کے منکر اور فحشاء سے احتراز و اجتناب!

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، ایک خالص دنیاوی جمہوریت رضاکارانہ اور رضامندانہ لواطت کو قانونی حیثیت دے سکتی ہے، لیکن اسلامی جمہوریت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایک دنیاوی جمہوریت اختلاط مرد و زن میں زیادہ سے زیادہ آزاد روی کا ثبوت دے سکتی ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریہ ایسا نہیں کر سکتی وہ عورت کا اس درجہ احترام ملحوظ رکھتی ہے کہ اسے اتنی نیچی سطح پر کبھی اور کسی حالت میں نہیں لا سکتی۔ ایک دنیاوی جمہوریت منکرات اور فواحش کو قانون

بنا کر جائز کر سکتی ہے، لیکن اسلامی جمہوریت حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے کی مجاز نہیں۔ ایک دنیاوی جمہوریت جنگ کی حالت میں تمام زرّین اصولوں کو پامال کر سکتی ہے، اور جملہ انسانیت کش تدابیر فتح حاصل کرنے کے لیے عمل میں لا سکتی ہے۔ لیکن ایک اسلامی جمہوریت ایسا کسی حالت میں بھی نہیں کر سکتی۔ ایک دنیاوی جمہوریت معاہدے اور میثاق کو جب چاہے بغیر کسی معقول سبب کے محض اپنے مصالح اور مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے وقف طاق نسیان کر کے پامال کر سکتی ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریت بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی عہد شکنی نہیں کر سکتی۔ ایک دنیاوی جمہوریت جب چاہے اور جس طرح چاہے قوانین منظور اور نافذ کر سکتی ہے، لیکن اسلامی جمہوریت کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتی، جو کتاب وسنت سے متصادم ہوتا ہو، یا جس سے منکرات و فواحش کے جواز کا پہلو نکلتا ہو، یا جو اخلاق عامہ اور مصلحت عامہ کے منافی ہو، ایک دنیاوی جمہوریت، عوام کو لوٹ بھی سکتی ہے، اور انھیں لُوٹنے کی اجازت بھی دے سکتی ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریت ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ راہِ عدل سے سرِ مُو منحرف نہیں ہو سکتی، وہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کر سکتی۔

یہ ہیں وہ بنیادی اصول جن کی اسلامی جمہوریت پابند ہے اور ان میں کوئی بھی ایسی بات نہیں جو خلافِ عقل ہو، یا جسے ناقابلِ عمل قرار دیا جا سکتا ہو۔

اسلامی جمہوریت کی خصوصیت : دنیاوی جمہوریت اور اسلامی جمہوریت کے اس فرق کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اسلامی جمہوریت ہی دنیا کے دکھ کا مداوا، اور مرض کا علاج ہے۔

یہ جو آج ترقی یافتہ، متمدن، اور دولت مند ملکوں میں بے اطمینانی، اضطراب اور اضطرار کی کارفرمائی نظر آرہی ہے۔ صرف اس لیے ہے کہ انسان اپنے آپ کو عقلِ کُل سمجھنے لگا ہے، اور جس نے اسے عقل کی نعمت عطا کی ہے اسے یکسر فراموش کر چکا ہے۔

یہ جو آج دنیا میں جنگ و پیکار کا دَور دورہ ہے، ہر ملک دوسرے سے خائف، سراسیمہ اور دہشت زدہ نظر آرہا ہے، اور نہ فورِ دہشت میں فلاح عوام سے قطع نظر کرکے سارے مادی وسائل آیندہ جنگ کی تیاریوں میں صرف کر رہا ہے۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ اسلامی جمہوریت کو، یا کم از کم اس کے اصولوں کو، اس نے قبول نہیں کیا ہے۔ ان دونوں باتوں میں سے ایک بات بھی ہو جائے تو ساری مشکلیں چشم زدن میں آسان ہو سکتی ہیں، اور جس جنت نعیم کا وعدہ خدا نے اپنے نیک بندوں سے کر رکھا ہے۔ اس کا نمونہ یہ خاکدان میں بن سکتا ہے۔

اسلامی حکومت کے حدود اور راہِ عمل: آئندہ سطور میں ہم یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ اسلامی جمہوریت میں جو حکومت تشکیل پذیر ہوتی ہے اس کے حدود کیا ہوتے ہیں؟ اور راہِ عمل کیا ہوتی ہے؟ بغیر اس کے ہم اپنے مقصد کو واضح نہیں کر سکیں گے۔

اسلامی حکومت کے بارے میں حضرت علیؓ کا ارشاد ہے:

"اسلامی حکومت میں پرہیز گاروں کا بول بالا ہوتا ہے اور فاجر حکومت میں تریاں کار مزے اڑاتے ہیں، یہاں تک کہ عمر تمام ہو جاتی ہے، اور موت کا پیام بر آجاتا ہے[۱]۔"

علیؓ مرتضیٰ کے یہ چند بول، کیا اسلامی جمہوریت کے بارے میں حرفِ آخر کی حیثیت نہیں رکھتے؟ درحقیقت یہی وہ بنیاد ہے جس پر اسلامی جمہوریت کی عمارت قائم ہے۔

حکومت میں سب سے اہم چیز عدلیہ ہے۔ اگر کسی حکومت میں عدلیہ آزاد ہے تو اسے زوال نہیں آسکتا، اس کی بہت سی کوتاہیوں اور غلط کاریوں کی تلافی ایوانِ عدالت میں ہو سکتی ہے۔

اسلام نے اس بات پر بے حد زور دیا ہے کہ قاضی کو اپنے فیصلے میں دُور اندیش

محتاط اور آزاد ہونا چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "قاضی تین طرح کے ہوں گے دو جہنم میں جائیں گے، ایک جنت میں۔ جس نے بغیر علم کے فیصلہ کیا وہ جہنمی ہے جس نے علم کے باوجود از راہِ جَور غلط فیصلہ کیا، وہ دوزخی ہے۔ جس نے حق کے ساتھ فیصلہ کیا، وہ جنتی ہے"[۲]۔

اسی لیے قاضی کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے گئے ہیں۔ اور بہت سے معاملات اس کی صواب دید پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔

صحیح روایت میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے زوجین کے درمیان حکم بننے والوں سے فرمایا: "اگر تفریق مناسب سمجھو تو تفریق کرا دو، اور اگر زوجین کو اکٹھا رکھنا مناسب سمجھو تو انھیں جمع کر دو"[۳]۔

ملزموں اور مجرموں سے سلوک: ملزموں اور مجرموں کے ساتھ بھی محتاط رعایت کی پوری گنجائش موجود ہے۔

"حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں عام قیدیوں کو بیت المال سے کھانا کھلایا جاتا تھا ——— البتہ جو لوگ اپنے فسق و فجور کے باعث قید کیے جاتے تھے مالدار ہونے کی صورت میں ان کے مال سے ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا جاتا تھا، بہ صورتِ دیگر بیت المال سے روزینہ مقرر کر دیا جاتا تھا"[۴]۔

رفاہِ عام کے امور: اسلامی جمہوریہ، رفاہِ عام کے امور سرانجام دینے پر مجبور ہے:

امام سیوطیؒ نے اپنی کتاب حسن المحاضرہ میں لکھا ہے کہ پلوں کی تعمیر، نہروں کی صفائی اور دوسرے رفاہِ عام کے کام سرکاری بیت المال کی رقم سے انجام پاتے تھے[۵]۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں جو کارنامے انجام دیے وہ تاریخ کا ناقابلِ فراموش صفحہ بن چکے ہیں۔ انھوں نے رفاہِ عام سے متعلق بھی بہت سے

کارنامے انجام دیے۔ چنانچہ آپؓ کے زمانۂ خلافت میں نہریں بھی کھودی گئیں۔

اسی ذیل میں نہر ابو موسیٰ آتی ہے۔ یہ نہر ابو موسیٰ اشعریؓ حاکم بصرہ نے حضرت عمرؓ کے حکم سے کھدوائی تھی، اس لیے ان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس نہر کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ عہدِ فاروقی میں عراق کے مرکزی مقام پر بصرہ کا شہر تعمیر کیا گیا تھا، جو مسلمانوں کی بڑی زبردست چھاؤنی بن گیا تھا، اسی مقام سے اسلامی فوجیں تیار ہو کر ایران و خراسان کو فتح کرنے کے لیے روانہ ہوتی تھیں، جب اس شہر کی آبادی روز بروز بڑھتی گئی تو اس کی آبادی کے لیے پانی کی قلت ہو گئی۔ اس وقت شہر سے چھ میل کی مسافت سے پانی شہر میں لایا جاتا تھا۔ جو نہایت دقت طلب کام تھا۔ اس لیے حضرت عمرؓ کے حکم سے ابو موسیٰ اشعریؓ نے یہ نہر کھدوائی۔ یوں اہلِ بصرہ کے لیے آب رسانی کی دقت رفع ہو گئی اور گھر گھر پانی کی افراط ہو گئی[۲۶]۔

اسلامی جمہوریہ اسے بھی گوارا نہیں کر سکتی کہ داد و دہش کا غلط مظاہرہ کیا جائے حضرت خالدؓ کی اسی طرح کی سخاوت کا جب حضرت عمرؓ کو پتہ چلا تو انھوں نے سالارِ اعلیٰ ابو عبیدہؓ کو تحریر فرمایا:

"خالد نے یہ انعام اپنی جیب سے دیا تو فضول خرچی کی، اور بیت المال سے دیا تو خیانت کی۔ دونوں صورتوں میں وہ معزولی کے قابل ہیں[۲۷]۔"

اجتہاد: اسلامی جمہوریت کی خصوصیت: اسلامی جمہوریت کی ایک ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھتی ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب اپنے پیروؤں اور ماننے والوں سے سب سے پہلے جو چیز چھینتے ہیں وہ ہے متاعِ فکر و نظر۔ نصرانیت، یہودیت، بدھ مت، جین مت، ہندو دھرم، ان سب کے مطالعے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح روشن ہو جائے گی کہ ان مذاہب میں تحقیق اور اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ اس کے برعکس اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو قدم قدم پر "تفکر" اور تعقل کی دعوت دیتا ہے۔ جو بار بار اپنے ماننے والوں یعنی مسلمانوں اور کافروں کو اس پر ابھارتا ہے کہ جو راستہ اختیار کریں سوچ

سمجھ کر اختیار کریں، جس عقیدہ کو اپنائیں اسے اچھی طرح چھان پھٹک لیں۔ جس نظام دین کی پیروی اختیار کریں۔ اسے پورے طور پر جان لیں وہ لوگوں کے ذہن و دماغ پر پہرہ نہیں لگاتا، انھیں موقعہ دیتا ہے کہ وہ اپنے ذہن سے کام لیں اپنے دماغ کی راہ نمائی میں رہ روی کریں۔

اجتہاد — اسلام کا سب سے بڑا تحفہ ہے، جو اس نے دنیائے انسانیت کو عطا فرمایا ہے، یہی وہ چیز ہے جس نے مسلمانوں کو ایسی قوم بنا دیا جس نے مختصر ترین عرصہ میں دنیا پر اپنی سلطانی کا سکہ جما لیا، اور یہی وہ چیز ہے، جسے چھوڑنے کے بعد ادبار و انحطاط کے گڑھے میں گر گئے، جب تک ان کی قوتِ اجتہاد قائم رہی، وہ "خیر الامم" رہے۔ جس دن اس قوت سے محروم ہو گئے، کچھ بھی نہ رہے۔

تاریخ ادیان کا اہم واقعہ: اجتہاد کو جس منظم طریقے پر مسلمانوں نے آزمایا وہ تاریخ ادیان کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اجتہاد ہی کی ایک صورت مصلحت مرسلہ بھی ہے۔

مصلحت مرسلہ کی تعریف کیا ہے؟

عام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مصلحتِ مرسلہ سے مراد یہ ہے کہ وہ مصلحت جو شارع علیہ السلام کے زمانہ میں نہ درپیش آئی ہو اور جس کے منفی یا مثبت پہلو سے متعلق کوئی واضح حکم پہلے سے ناموجود ہو۔

ایسے مواقع پر خود صحابہ کرام نے بھی حالات کے مطابق نئے نئے احکام وضع کیے: مثلاً قرآن شریف کا ضبطِ تحریر میں لانا، یا حضرت ابو بکرؓ کی طرف سے حضرت عمرؓ کی خلافت کے لیے ان کا نام پیش کرنا، یا دفاتر کا قائم کرنا، یا سکہ کا ڈھالنا یا جیل خانوں کا بنانا، یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جو نئے حالات میں نئے احکامات کے تحت عمل میں آئیں، جن کی نظیر عہدِ شارع میں کہیں نہیں ملتی، یہ سب چیزیں مصلحتِ مطلقہ کے ماتحت عالمِ وجود میں آئیں۔

اصول شہادت: شرع نے اصولِ شہادت میں بڑی سختی ملحوظ رکھی ہے روایت کے اصول میں بھی اتنی سختی نہیں ہے۔ شہادت کے اہم شروط میں سے یہ بھی ہے کہ شہادت

دینے والے آزاد ہوں - ان کی تعداد بھی معین کر دی گئی ہے ۔ مثلاً زنا کی شہادت چار آدمیوں سے کم کی مقبول نہیں ہے ۔ اور قتل کی گواہی کے لیے دو آدمی کافی ہیں ۔

اگرچہ خون کا معاملہ بے حد اہم ہے لیکن زنا کے بارے میں گواہوں کی تعداد جو زیادہ رکھی گئی ہے وہ اس لیے کہ مقصود جرم کا افشا نہیں بلکہ عیب پوشی ہے۔[۹۸]

اجتہاد کی چند مثالیں :

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضؓ سے ثابت ہے کہ انھوں نے ایک شرابی پر جس نے نشہ کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی، حد جاری کی اور طلاق تسلیم نہیں کی۔[۹۹]

اسی طرح : حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ایک شخص نے ماہ صیام میں شراب پی لی، اسے اسّی تازیانوں کے بجائے سو تازیانوں کی سزا دی - کیونکہ اس نے شراب بھی پی، اور رمضان کی بے حرمتی بھی کی۔[۱۰۰]

رائے عامہ کا احترام : اسلامی جمہوریت میں رائے عامہ کا احترام کس درجہ ملحوظ رہتا ہے ؟ اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہوگا:۔

حضرت عثمان رضؓ نے عبداللہ بن ابی سرح سے وعدہ کیا تھا کہ فتح افریقہ کے سلسلے میں مال غنیمت کا پانچواں حصہ انھیں بطور انعام دیا جائے گا - چنانچہ بعد فتح عبداللہ نے پانچواں حصہ لے لیا - مگر عام مسلمانوں کو یہ بات پسند نہ آئی ؛ انھوں نے اعتراض کیا، حضرت عثمان رضؓ نے عبداللہ بن ابی سرح سے یہ رقم بیت المال میں واپس کرا دی ۔ اور فرمایا : ''میں نے وعدہ تو کیا تھا لیکن مسلمان نہیں مانتے''۔[۱۰۱]

اسلام کے اصولوں میں جمود نہیں، لچک ہے ۔ مقتضیات زمانہ کے مطابق انھیں روبراہ کیا جا سکتا ہے ۔ درحقیقت یہ چیز بھی اجتہاد ہی کے ذیل میں آتی ہے اس لیے کہ نئی چیزیں اسی صورت میں قبول کی جا سکتی اور رکھی جا سکتی ہیں کہ وہ اسلام کی روح اور اصولوں سے متصادم نہ ہوں ۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ اس سلسلے میں ہمارے سامنے کوئی اسوہ ہے یا نہیں؟

عابد بن یحییٰ حارث رضؓ بن فضل سے روایت کرتے ہیں کہ عمر رضؓ نے مسلمانوں سے دفاتر قائم کرنے کے متعلق مشورہ کیا۔

حضرت علی رضؓ نے فرمایا کہ آپ رضؓ ہر سال کی آمدنی صرف کر دیا کریں، بچایا نہ کریں۔

حضرت عثمان رضؓ نے فرمایا کہ اب مال کی کثرت ہو گئی ہے، اگر یہ پتہ نہ چلا کہ کس نے لیا اور کس نے نہیں لیا تو بہت دقت اور پریشانی کا سامنا ہو گا۔

خالد رضؓ بن ولید نے کہا: "میں نے شام کے بادشاہوں کو دیکھا ہے کہ دفاتر کا قیام اور عساکر کی تنظیم کرتے ہیں۔ آپ رضؓ بھی ایسا ہی کیجئے۔"

حضرت عمر رضؓ نے ان کی بات مان لی اور عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل، جبیر بن مطعم قریش کے نوجوانوں کو بلا کر حکم دیا کہ لوگوں کے نام مراتب کے لحاظ سے لکھو، انھوں نے سب سے پہلے بنو ہاشم کے نام لکھے۔ ان کے بعد ابوبکر رضؓ اور ان کی قوم کے نام لکھے، پھر حضرت عمر رضؓ اور ان کی قوم کے نام لکھے، گویا خلافت کی ترتیب کا اعتبار کیا، اور حضرت عمر رضؓ کے پاس لے گئے، آپ رضؓ نے دیکھ کر فرمایا، یہ ٹھیک نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کے اعتبار سے لکھو۔ جو جس قدر آپ صؐ سے قریب ہو۔ اسی قدر مقدم ہوا، اور عمر رضؓ کو اس مرتبہ پر لکھو جس پر اس کو اللہ نے رکھا ہے[12]

دفاتر کا نظام اور حضرت عمر رضؓ: اس سلسلے میں ایک اور روایت ذرا وضاحت کے ساتھ: "حضرت عمر رضؓ نے ایک ایرانی سردار کے مشورہ سے دفاتر کا نظام جاری کیا۔ اسلامی فتوحات پے در پے ہو رہی تھیں، دولتِ عربیہ ایرانی خزانوں سے لبریز ہو گئی تھی، حضرت عمر رضؓ اس مال کو مسلمانوں میں تقسیم کرنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے دفاتر کی تدوین کی۔ وظائف مقرر کیے، ہر مسلمان کے وظیفہ میں اس کے سبقت فی الدین اور غزوات میں نصرتِ رسول صؐ کا خیال رکھا گیا، دفاتر میں اس غرض کے لیے متعدد کلرک رکھے گئے، انھوں نے لوگوں کے مختلف طبقات کی فہرست تیار کی۔ سرِ فہرست حضرت عباس رضؓ عمِ نبی

صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بعد بنی ہاشم تھے۔ پھر اور لوگوں کے اسماء تھے یہی صورت حال ان کی اور حضرت عثمانؓ کی خلافت میں جنھوں نے اپنے دور میں قابل ذکر "تبدیلیاں" کیں، قائم رہیں۔

"دیوان" ایک فارسی لفظ ہے جس کے معنی "سرکاری کاغذات" یا دفتر کے ہیں۔ لیکن دیوان کا اطلاق مجازاً اس جگہ پر کیا جانے لگا، جہاں یہ دیوان محفوظ رکھا جائے۔

ماوردی کی تصریحات: ماوردی نے لکھا ہے: "حقوق سلطنت سے متعلق اعمال و احوال اور ان کو سرانجام دینے والے جیوش و عمال کی تفصیلات کے اندراج کو محفوظ رکھنے کے لیے دیوان کی ضرورت پڑی"۔

جہشیاری نے حضرت عمرؓ کے تدوین (دواوین) دفاتر کا سبب ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"عربوں میں حضرت عمرؓ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اسلامی حکومت میں دواوین (دفاتر) کا نظام داخل کیا"[۱]

اسلامی جمہوریہ کا سیکرٹریٹ آستانۂ عدل اور مرکز حکومت مسجد تھی۔

سر ٹامس آرنلڈ نے اس امر سے بحث کی ہے کہ مسجد کا تعلق اس حیثیت سے کہ وہ عبادت کی جگہ ہے (یعنی وہ مقام ہے جہاں خلیفہ یا والی نماز میں لوگوں کی امامت کرتا ہے) دولت کے سیاسی و اجتماعی مسائل کے نظم و ضبط سے کیا رہا ہے اور کس طرح خلیفہ یا والی کی ذات کے اندر ایک طرف نماز میں مسلمانوں کی امامت اور دوسری طرف دولت یا ولایت (صوبہ) کا انتظام و انصرام دونوں حیثیتیں جمع ہوتی ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں:

"مسجد محض عبادت کی جگہ ہی نہ تھی بلکہ وہ سیاسی و اجتماعی زندگی کا مرکز بھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں سفراء کا استقبال کرتے، اور وہیں بیٹھ کر مہمات دولت کا انتظام و انصرام فرماتے۔ اور منبر پر سیاسی و دینی مسائل کے متعلق

مسلمانوں کو خطاب کرتے، حضرت عمرؓ نے مدینہ کے منبر پر کھڑے ہو کر عراق میں مسلمان فوجیوں کی پسپائی کا اعلان کیا، اور اپنی قوم کو اس ملک کی طرف چل پڑنے کی ترغیب دی، حضرت عثمانؓ نے بھی اسی منبر پر کھڑے ہو کر اپنی مدافعت کی۔ اسی طرح ہر خلیفہ اپنی تخت نشینی کے وقت اسی منبر پر جمہور کے سامنے اپنا وہ پہلا خطبہ دیتا جو بمنزلہ حکومت کی پالیسی کا اعلان ہوتا ہے[۱۱۴]!

رائے عامہ کے احترام کے سلسلے میں ایک اور واقعہ گورنر کوفہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے متعلق:

"مسلمانوں کی ایک جماعت شکایت لے کر مدینہ منورہ آستانۂ عثمانؓ پر پہنچی! اور ان کی معزولی کا مطالبہ کیا، حضرت عثمانؓ نے انھیں معزول کر دیا، اور ان کی جگہ عبداللہ بن عامر کو نامزد کیا[۱۱۵]!"

عہد بہ عہد کے مجتہدات: ایک نئی چیز یعنی "دیوان" وغیرہ اختیار کرنے سے متعلق عہد بہ عہد کے مزید مجتہدات و معلومات:

"اس دیوان کے وجود میں آنے کا سبب یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے ایک شخص کو عراق کے والی زیاد بن ابیہ کے پاس خط دے کر بھیجا کہ حامل رقعہ کو ایک لاکھ درہم عطا کیے جائیں، اس شخص نے راستہ میں اس مکتوب کو پڑھ لیا — اس زمانہ تک بنی امیہ کے فرامین مختوم نہ ہوتے تھے — اور ایک لاکھ کو دو لاکھ بنا دیا۔ جب زیاد نے حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حساب پیش کیا تو انھوں نے انکار کیا اور کہا کہ میں نے صرف ایک لاکھ کے لیے لکھا تھا، اس کے بعد اس شخص کو بلا کر ایک درہم جو اس نے زائد لیے تھے، واپس لیے، اور دیوان الخاتم کا نظام جاری کیا۔ تمام فرامین مختوم کرنے کے بعد صادر ہونے لگے، نہ کسی شخص کو یہ علم ہو سکتا تھا کہ فرمان میں کیا لکھا ہے اور نہ کوئی اس میں کسی قسم کا تغیر پیدا کر سکتا تھا۔

عبدالملک بن مروان (۶۵ — ۸۶ھ) کے عہد میں دواوین کے نظام

میں ترقی ہوئی، اس کی سیاست دواوین میں یونانی، فارسی دونوں زبانوں کے رائج رکھنے پر مشتمل تھی، اسی طرح رومی سکہ کے ختم کرنے کا اس نے مصمم ارادہ کر لیا۔ یہ عزم اس وقت خاص طور پر راسخ ہوگیا۔ جب اس کے اور قسطنطین رابع اور جسٹینان ثانی کے درمیان عداوت کی آگ بھڑک اٹھی، اس کے اوائلِ عہد میں رجسٹر شام میں یونانی زبان میں اور ایران میں فارسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ اس نے عربی زبان میں لکھنے کا حکم جاری کیا۔

عبدالملک ہر ہفتہ شاہنشاہِ روم کو ایک ہزار دینار دیا کرتا تھا۔ اب عبدالملک نے اجنبی سکّوں کے بجائے عربی سکّوں کے ڈھالنے کا انتظام کیا دمشق میں سکّوں کی ڈھلائی کے لیے ایک ٹکسال گھر بنوایا۔ جمیع اطراف دولت میں مستعمل سکّوں کے رواج کو بند کرنے کا حکم صادر کیا، اور ان کے بجائے سونے اور چاندی کے جدید سکوں کو جن پر آیات قرآنیہ نقش تھیں، رائج کیا۔

دیوان الزمام : موجودہ زمانے کے آڈٹ آفس کے مشابہ تھا۔ صیغہ ہائے نظم ونسق کا سب سے اہم شعبہ تھا، جسے خلیفۂ اول نے روشناس کیا تھا۔

حضرت عمر رضی ابن الخطاب وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے فوج کو ایک مخصوص طبقہ میں منتقل کیا، اور ان کے نظم ونسق کے لیے ایک محکمہ "دیوان المنبر" کے نام سے قائم کیا۔ جس میں سپاہیوں کے نام، اوصاف، ان کے وظائف کی مقدار اور ان کے اعمال و فرائض کی تفصیلات کا اندراج ہوتا تھا۔

عبدالملک نے جبری فوجی بھرتی کا نظام جاری کیا۔

دولتِ عباسیہ کے اوائلِ عہد بالخصوص منصور کے دورِ حکومت میں حربی مسائل پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ "عرض جیش" (فوجوں کا معائنہ) کو عسکری تربیت کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا۔ منصور کو یہ امر بہت ہی محبوب تھا کہ "خود" پہنے اور اپنے تخت پر بیٹھ کر فوجوں کا معائنہ کرے، چنانچہ اس کے سامنے فوج کی صف بندی تین قسموں میں ہوا کرتی تھی[16]!

بحرِ روم کی گودیوں کے پاس بسنے والی قوموں پر یورپ کی دوسری قوموں سے زیادہ گہرا اثر عربوں پر پڑا۔

فان کریمر لکھتے ہیں: "قدیم عربی بیڑا مسیحی دنیا کے بیڑوں کے لیے تھا۔ بہت سی عربی بحری اصطلاحات جنوبی یورپ میں تجارتی زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔ مثلاً:

اطالوی زبان میں Cable عربی لفظ "حبل"، Arsenale، Darsena " عربی لفظ "دارالصناعۃ" سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح " Corvette عربی لفظ "غراب" اور " Admiral " عربی لفظ "امیر البحر" سے لیے گئے ہیں۔[1]"

"جدید" کو قبول کرنے میں تامل نہ تھا: جدید کو قبول کرنے ترقی سے بہرہ ور ہونے اور ایجاد و اختراع سے مستفید ہونے کا سلسلہ برابر جاری رہا:

"بسا اوقات سلاطین یا امراء اپنے اور صاحب البرید کے درمیان خفیہ اشارات مقرر کر لیتے تھے۔ صاحب البرید کا خط اگر ان اشارات کا حامل نہ ہوتا تو گو وہ خود صاحب البرید کے ہاتھ کا لکھا ہوتا، اور اس پر اس کی مہر بھی ثبت ہوتی لیکن وہ اس کو قابلِ اعتماد نہ سمجھتے، اس لیے کہ صاحب البرید کبھی اپنی مرضی کے خلاف ایسا کرنے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔

مثلاً ابو مسلم خراسانی کو خراسان سے جب منصور نے بغداد بُلایا، تو ابو مسلم کھٹکا، اس نے ابو نصر مالک بن الہثیم کو اپنے لشکر پر اپنا جانشین بنایا، اور اس کو یہ ہدایت دی کہ جب تک میرا خط تمہارے پاس نہ آجائے اس وقت تک تم یہاں قیام کرو۔ اگر خط پر نصف مہر لگی ہو تو سمجھنا کہ یہ مہر میں نے لگائی ہے اور اگر پوری لگی ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ مُہر میں نے ثبت نہیں کی ہے۔" ابو مسلم جب مدائن پہنچا تو منصور نے اسے قتل کرا دیا اور اس کے بعد ابو مسلم خراسانی کی طرف سے ابو نصر کو اس مضمون کا خط لکھا، کہ ابو مسلم جو کچھ مال و اسباب وہاں چھوڑ آیا ہے

اسے یہاں بھیج دو۔ خط پر ابو مسلم کی مہر لگا دی۔ ابو نصر نے جب دیکھا کہ مہر پوری لگی ہوئی ہے تو سمجھ گیا کہ ابو مسلم نے نہیں لکھا ہے[۱۸]!

پولیس کی تنظیم: حضرت علیؓ بن ابی طالب کے عہد میں پولیس کی تنظیم کی گئی، اور اس کے افسر اعلیٰ کو صاحب الشرطہ کا نام دیا گیا صاحب شرطہ کا انتخاب قوم کے معززاور صاحب عصبیت و صاحب قوت افراد سے ہوتا، وہ اس زمانہ کے محافظ: (Gove[illegible]) کا ہم پلہ تھا اس لیے کہ صاحب شرطہ اس منظم جمعیت کے افسر اعلیٰ کو کہا جاتا تھا، جو قیام امن، حفظ نظام، اور مجرموں اور فتنہ پردازوں کی دار و گیر، میں والی کی اعانت کرتی تھی، ابتدا میں پولیس محکمہ قضا کے ماتحت تھی۔ عدالت کے فیصلوں کی تعمیل کراتی، اور صاحب الشرطہ اقامت حدود کا ذمہ دار ہوتا، لیکن بعد کو یہ دونوں شعبے الگ الگ ہو گئے اور صاحب الشرطہ کو جرائم پیشگی کے مقدمات، خود دیکھنے کے کامل اختیارات ملے۔ ابتدا میں صاحب الشرطہ کے احکام ہر طبقہ کے آدمیوں پر جاری نہیں ہوتے تھے۔ صرف عوام الناس چال چلن کے مشکوک افراد، غنڈوں اور فاجروں پر انھیں اختیارات حاصل تھے۔ لیکن بعد کو دولت بنی امیہ کے دور میں اس منصب کی عزت بڑھی، اور شرطۂ کبریٰ (پولیس اکبر) و شرطۂ صغریٰ (پولیس اصغر) کے نام سے دو شعبوں میں اسے تقسیم کر دیا گیا، پولیس اکبر کے زیر اقتدار عوام و خاص دونوں تھے۔ یہ شاہی عہدیداروں کے خلاف کارروائیاں کرتی اور ارتکاب جرم پر ان کو، ان کے افراد کو اور ان کے علاوہ دوسرے ذی جاہ و عظمت افراد کو سزائیں دے سکتی تھی، لیکن پولیس اصغر کا تعلق صرف عوام الناس کے ساتھ مخصوص تھا۔

پولیس اکبر کا افسر اعلیٰ سلطانی محل کے دروازے پر کرسی لگا کر بیٹھتا، اور عملہ کے دیگر ملازمین اس کے سامنے بیٹھتے۔ یہ اپنی جگہوں سے اسی وقت ہل سکتے تھے جب یہ ان کے سپرد کوئی کام کرتا۔ اکابر دولت میں کسی کو یہ عہدہ

ملنے کے یہ معنی تھے کہ وزارت اور حجابت کے مناصب کی امیدواری کا حق اس کو حاصل ہو گیا[۱۹]

وصولی خراج: وصولی خراج کا نظم و نسق خلفاء خود اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے، اور ولاۃ و عمال خراج سے اس معاملہ میں نہایت سخت محاسبہ کرتے تھے چنانچہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے اس مقصد کی خاطر ایک نظام جاری کیا۔ جو نظام مقاسمہ کے نام سے موسوم ہوا، اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ولاۃ کی تولیت سے پہلے ان کی دولت و ثروت کی ایک مکمل فہرست تیار کر لی جاتی تھی۔ جب وہ اپنی خدمات سے سبکدوش ہوتے تھے تو اموال کا نصف ان سے لے لیا جاتا تھا۔ جو ان کی تنخواہ کی آمدنی سے زائد اپنے دوران حکومت میں ان کے پاس جمع ہو جاتے تھے[۲۰] چنانچہ حضرت معاویہؓ نے عہدِ گورنری میں دولت جمع کی تھی، اس کا نصف اس نظام کے تحت انھیں بیت المال میں داخل کرنا پڑا، تاکہ بقیہ مال ان کے لیے حلال ہو جائے[۲۱]

حضرت عمرؓ کا نظامِ حکومت:

حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کی دولت کو نصف نصف تقسیم کر لیا تھا۔

بلاذری کی تصریحات: بلاذری نے لکھا ہے: "حضرت عمرؓ اپنے عمال کو جب حاکم بنا کر بھیجتے تو ان کے اموال کی ایک فہرست تیار کر لیتے پھر بعد کو اس سے زیادہ جو کچھ ان کے پاس نکلتا، اسے نصف نصف تقسیم کر لیتے، اور بسا اوقات سب کا سب ان سے چھین لیتے تھے، چنانچہ آپؓ نے عمروؓ بن العاص کے نام ایک مرتبہ یہ تحریر بھیجی:

"تمھارے مال و متاع، غلاموں، برتنوں اور جانوروں کے اسرار منکشف ہو چکے ہیں، جس وقت تم مصر کے والی بنائے گئے تھے، اس وقت یہ چیزیں تمھارے پاس نہ تھیں۔"

حضرت عمرو رضؓ بن العاص نے جواب میں لکھا :

" ہمارا یہ ملک زراعت و تجارت کا ملک ہے ، اس لیے یہاں ہماری ضروریات سے زیادہ ملتا ہے "

اس پر حضرت عمر رضؓ نے ان کو لکھا کہ مجھے عمالِ سوء کے متعلق ضرورت سے زیادہ معلوم ہو چکا ہے ، میرے نام تمھارا خط اس شخص کے خط کا سا ہے جو اخذ بالحق پر مطمئن نہیں ہوتا ، میری رائے تمھارے متعلق اچھی نہیں رہی ہے ۔ میں تمھارے پاس محمد بن مسلمہ کو بھیج رہا ہوں ۔ تاکہ وہ تمھارے مال و دولت کو نصف نصف کر لیں ۔ تم ان کو صحیح صحیح باتیں بتا دو ، جو کچھ وہ تم سے طلب کریں ، ان کے سامنے رکھ دو ، اور اگر وہ تم پر کچھ سختی کریں تو برا مت مانو کہ اب راز ظاہر ہو چکا ہے !

چنانچہ محمد بن مسلمہ نے حضرت عمرو رضؓ بن العاص کے مال و متاع کو نصف نصف تقسیم کر لیا۔[۲۲]

ٹیکس اور زکوٰۃ کی جداگانہ حیثیت : بعض لوگوں کا خیال ہے ، کہ اسلامی حکومت ، عوام سے زکوٰۃ وصول کرنے کے بعد کوئی ٹیکس نہیں وصول کر سکتی ۔ یہ غلط خیال ہے ، زکوٰۃ اگر ٹیکس ہے تو صرف خدا کے لیے ہے ۔ اس کے مصارف متعین ہیں ، ان مصارف کے علاوہ کسی اور مد پر اسے خرچ نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن نظم مملکت کو استوار کرنے ، فلاحی امور سر انجام دینے ، اور مصالح عامہ کو برقرار رکھنے کے لیے حکومت کو جو مصارف کرنا پڑتے ہیں ۔ ان کے پیش نظر وہ اپنی صواب دید پر ، محاصل عائد کر سکتی ہے ۔ اور اس کا یہ اقدام قطعاً خلافِ شریعت نہیں ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے :

" زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں حق ہے ![۲۳] "

یہ ارشاد اس امر کی طرف ایک واضح اشارہ ہے کہ حکومت حالات و

مقتضیات کے مطابق ٹیکس لگا سکتی ہے!

حضرت ابن عباس رضؓ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ رضؓ بن جبل کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو ہدایات دیتے وقت ان سے فرمایا:

"وہاں کے لوگوں کو اس امر کی طرف دعوت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی ذات عبادت کے لائق نہیں، اور میں (یعنی محمدؐ) خدا کا رسول ہوں۔ اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیں۔ پھر انھیں یہ بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن اور رات میں پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے، اگر وہ اسے بھی مان لیں، پھر انھیں یہ بتلانا کہ خداوند تعالیٰ نے ان پر صدقہ (زکوٰۃ) فرض کیا ہے جو ان کے مال داروں سے لیا جائے گا، اور ان کے غریبوں پر تقسیم کر دیا جائے گا۔"[۲۴]

ہنگامی حالات میں چندہ: زکوٰۃ اور ٹیکس کے علاوہ حکومت ہنگامی ضرورت کے وقت بھی چندہ وصول کر سکتی ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال موجود ہے کہ ۹ ھ میں جب قیصر روم کے حملے کی افواہیں پھیلیں تو آپؐ نے لوگوں کو ترغیب دی کہ سامانِ جنگ کی تیاری کے لیے روپیہ دیں۔ سب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جس میں حضرت عثمانؓ اور حضرت ابو بکر رضؓ پیش پیش تھے ایک دولت مند تھا، اس نے تھیلیوں کا منہ کھول دیا۔ دوسرا بوریۂ فقر کا تاجدار تھا۔ اس نے گھر کی ساری پونجی لاکر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر ڈال دی، اور اہل وعیال کے لیے خدا اور اس کے رسولؐ کو چھوڑ آیا۔[۲۵]

ٹیکس کی ایک اور صورت:

قاضی ابو یوسفؒ اپنی کتاب "الخراج" میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"عاصم بن سلیمان حسنؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ابو موسیٰ اشعریؓ نے عمر رضؓ بن الخطاب کو نوشتہ بھیجا کہ جو مسلمان تاجر ارضِ حرب میں جاتے ہیں۔ ان سے عشر وصول کیا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضؓ نے لکھا جس طرح وہ مسلمان تاجروں

سے عشر وصول کرتے ہیں، تم ان کے تاجروں سے وصول کرو، ذمیوں سے نصف عشر لو، اور مسلمانوں سے ہر چالیس درہم پر ایک درہم، دو سو سے کم پر کچھ نہ لو، اور اگر دو سو ہوں تو پانچ درہم، زیادہ ہوں تو اسی حساب سے۔

درآمد برآمد پر ٹیکس: حضرت عمرؓ کے وقت سے اسلامی حکومتوں میں یہی دستور نافذ ہو گیا، اور درآمد برآمد پر ٹیکس لگ گیا، تاجر اگر مسلمان ہے تو اس سے عشر کا چوتھائی لیا جائے گا جو گویا زکوٰۃ کے معیار کے مطابق ہے، اور اگر تاجر ذمی ہے تو اس سے نصف عشر لیا جائے گا۔ اور اگر حربی ہے تو اس سے وہی سلوک کیا جائے گا، جو اس کی قوم مسلمان تاجروں کے ساتھ کرتی ہے، وہ اگر مسلمان سے عشر لیتے ہیں تو یہاں بھی عشر لیا جائے گا، اگر وہ نصف عشر لیتے ہیں، تو مسلمان بھی نصف عشر لیں گے۔ اور اگر وہ عشر کا چوتھائی لیتے ہیں تو اسلامی حکومت بھی یہی لے گی۔ اور اگر یہ معلوم نہ ہو سکے کہ وہ لوگ مسلمانوں سے کیا ٹیکس لیتے ہیں تو اسلامی حکومت صرف عشر لے گی[۲۶]۔

اسلامی حکومت میں ہر چیز پر مقدم جو چیز ہے وہ فلاح عوام ہے اور فلاح کو صحیح طور بروئے کار لانے کے لیے احتساب اور مؤاخذہ کا سلسلہ قائم رکھنا، جانچ پڑتال کرنا، اور اس بات کی نگرانی کرنا کہ نفع اندوزی کے جوش میں سادہ لوح عوام سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ بسا اوقات ضروری اور لازمی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو حکومتیں اسلام کا پرچم دیانت کے ساتھ بلند کر کے قائم ہوئیں، انھوں نے اس چیز کو کبھی بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔

فاطمی حکومت اسلام کے نام پر قائم ہوئی تھی، اس نے بہت سے معاملات میں اپنی اس شان کو قائم رکھا، اور فلاحِ عوام کا مسئلہ بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ نظام احتساب و مواخذہ کو بہت زیادہ منظم طور پر، پہلی مرتبہ اسی حکومت نے قائم کیا اور اس کے خوش گوار

نتائج بھی نظر کے سامنے آئے اور لوگوں کو بہت سی زحمتوں اور پریشانیوں سے نجات مل گئی۔

فاطمیوں نے بہت سی اصلاحات رائج کیں۔ ہم صرف چند ایک کا ذکر کریں گے۔

عدالت ازالہ شکایات حکام: بہت ہی اہم اور نتائج کے اعتبار سے دُور رس اصلاح یہ کی گئی کہ ایسی عدالت بہ عہدِ معز قائم کی گئی، جس میں ملک کے والیوں اور عہدہ داروں کے خلاف شکایات کی سماعت ہوتی تھی، ایسی شکایات کا ازالہ معمولی عدالتیں نہیں کر سکتی تھیں، اس عدالت کا نام "عدالت ازالہ شکایات حکام" رکھا گیا، اس میں خود جوہر وزیر، قاضی اور چند فقہاء حاضر ہوتے تھے۔ اس کا فیصلہ خلیفہ کے پاس بھیجا جاتا تھا، اور اس کی منظوری کے بعد وہ صادر کیا جاتا تھا[۲۷]!

دوسری اہم اصلاح یہ تھی کہ:

"جانب داری کو روکنے کے لیے ہر ملکی عہدے پر ایک مصری کے ساتھ ایک مغربی بھی شریک کیا گیا[۲۸]"

احتساب اور مواخذہ: احتساب و مواخذے کا نظام بھی، اس عہد میں زیادہ سے زیادہ استوار تھا:

محتسب احکام شرع کی پابندی پر نظر رکھتا تھا۔ بازاروں کے نظام کو درست رکھتا تھا۔ دوکانوں کے سامنے ان تمام باتوں کا سدِّباب کرتا تھا، جن سے نظام آمد و رفت میں خلل پیدا ہوتا ہو۔ قرض ادا کراتا تھا۔ وزنوں، اور پیمانوں کی جانچ پڑتال کرتا رہتا تھا۔ اس کے لیے ایک باقاعدہ آفس تھا[۲۹]

اس آفس میں وہ دوکانداروں کو اوقات معینہ میں مع ان کے ترازوؤں باٹوں اور پیمانوں کے طلب کرتا، دیکھ پرکھ کے بعد اگر ان میں کوئی نقص نکلتا تو یہ سب باٹ وغیرہ ضبط کر لیے جاتے تھے، اور دوکانداروں کو حکم دیا جاتا کہ دوسرے

باٹ اور پیمانے خرید لیں یا انھیں درست کرلیں، یہ آفس فاطمیہ، ایوبیہ دونوں کے پورے دور میں قائم رہا ہے۔[۳۰]

حضرت عمرؓ بن الخطاب وہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے احتساب کی بنیاد رکھی، آپؓ خود محتسب کے فرائض انجام دیتے تھے، ایک مرتبہ آپؓ ایک شتربان کو مارتے اور یہ کہتے ہوئے دیکھے گئے۔ "تم نے اپنے اونٹ پر اس کی سکت سے زیادہ بوجھ لاد دیا ہے۔"

محتسب کی تعریف مختصر طور پر یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا اور آداب کا محافظ اور فضیلت و امانت کا پاسبان ہوتا ہے۔

فاطمیوں کے عہد میں احتساب کے نظام نے ترقی کی۔ محتسب کے کئی نائب ہوتے تھے جو بازاروں میں پھرتے، گوشت، ہانڈیوں اور باورچیوں کے پکانے کے طریقوں کی تفتیش اور دیکھ بھال کرتے، جانوروں کے مالکوں کو جانوروں پر مناسب حد سے زیادہ مال نہ لادنے دیتے۔ سقّوں کو مشکوں کے ڈھانپے رکھنے اور آدابِ عامہ کے غیر منافی پائجاموں کے پہننے کی تاکید کرتے، اور معلموں کو چھوٹے بچوں کو بے دردی سے مارنے سے روکتے تھے۔ محتسب لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے اپنی عدالت کے اجلاس جامع عمر اور جامعہ ازہر میں کیا کرتا تھا۔ اس کے اختیارات اس حد تک وسیع ہوگئے تھے کہ اس نے پولیس کے آدمیوں کو اپنے احکام کی تنفیذ کا فریضہ انجام دینے پر مجبور کیا۔[۳۱]

آج بہت سی چیزیں عام ہیں اور ان میں کوئی ندرت نظر نہیں آتی۔ لیکن آج سے چودہ سو برس پہلے یہ کیفیت نہیں تھی، اس وقت سرے سے کوئی باقاعدہ نظام عدالت ہی نہیں تھا، اور جو تھا وہ بہت سے قانونی اور آئینی سقم اپنے اندر رکھتا تھا، لیکن اسلام کے نمودار ہونے کے بعد جو اسلامی

حکومت قائم ہوئی۔ اس نے ان اسقام کا تقریباً خاتمہ کر دیا، اور نئی نئی صورتیں اقتضائے انصاف کو بروئے کار لانے کی پیدا کیں۔ انہی میں ٹریبونل کا قیام اور قاضی کے حدود ذاتی کی توضیح بھی ہے۔

ٹریبونل : فریقین کے معین مقدمے کو فیصل کرنے کے لیے بھی قاضی کا تقرر ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں کسی اور مقدمے کو لینے کا مجاز نہ ہو گا جب تک یہ معین مقدمہ فریقین میں چلتا رہے گا، اس وقت تک اس کی حکومت باقی رہے گی، اور فیصلہ کرنے کے بعد حکومت زائل ہو جائے گی، پھر ان فریقین میں کوئی دوسرا مقدمہ چلے تو اس کا تصفیہ جدید اجازت کے بغیر نہیں کر سکتا۔

قاضی کے حدود ذاتی کی توضیح :

تصفیہ مقدمات کو تعویق میں ڈالنا، قاضی کے لیے جائز نہیں ہے۔ ایسے ہی اوقات استراحت کے علاوہ اپنے دروازہ پہ حاجب (دربان) کا تقرر کرنا جائز نہیں، اپنے والدین یا اولاد کے حق میں محل تہمت ہونے کی وجہ سے فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ ہاں ان کے خلاف فیصلہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ بدگمانی کا احتمال نہیں۔ اسی طرح ان کے حق میں شہادت نہیں دے سکتا۔ مگر خلاف دے سکتا ہے۔ اپنے دشمن کے موافق شہادت دے سکتا ہے خلاف نہیں دے سکتا، اور اس کے موافق فیصلہ کر سکتا ہے، مگر خلاف نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ حکم کے اسباب اگرچہ ظاہر ہیں مگر شہادت کے اسباب خفی ہیں۔ لہٰذا شہادت کی بدگمانی حکم کی طرف متوجہ ہو جائے گی۔[۳۲]

اقتدار اعلیٰ کی امیدواری جائز ہے یا ناجائز؟ : ایک سوال یہ بھی بعض حلقوں میں گشت کرتا رہتا ہے کہ اسلام میں کوئی شخص بطور خود خلافت یا امامت کا امیدوار نہیں بن سکتا، حالانکہ یہ دعویٰ اسلام کی روح سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اگر ایک شخص پوری دیانت داری کے ساتھ اپنے تئیں خلیفہ کی حیثیت سے ملک وملت کی خدمت کرنے کا اہل پاتا ہے تو آخر کیا سبب ہے کہ وہ امیدواروں کی سے حیثیت سے منظرِ عام پر نہ آئے؟ کم از کم اسلام اس سے منع نہیں کرتا اور ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں دُور کی نہیں۔ صدرِ اوّل کی مثالیں پیش کریں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے معاً بعد انصار نے اپنی خدماتِ جلیلہ کے باعث اپنا امیدوار اس منصب کے لیے پیش کیا، اور صاف الفاظ میں ترغیب دی کہ:

"اللہ نے اپنے نبیؐ کو جب اپنے حضور میں واپس بلایا تو وہ تم سے ناراض نہ تھے، اور تم ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے، قبل اس کے کہ دوسرے ان کی نیابت کے لیے آگے بڑھیں، تم یہ چیز اپنے لیے یہ چیز خاص کر لو، کہ تم دوسروں کی نسبت اس منصب کے زیادہ اہل ہو[۳۳]!"

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"خلفائے راشدین کے طریقۂ انتخاب کی اگرچہ کوئی منظم شکل نہ تھی لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی بیعت میں شوریٰ کا وہ عکس تھا جو موروثی نظام سے ہر طرح دُور اور پورے طور پر عربی روح کے موافق تھا۔

بیعت اور نقضِ بیعت: اگر یہ کہا جائے کہ پہلے طریقہ (حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب) میں کوئی ایسی صورت نہ تھی جس سے یہ ثابت ہو کہ امیدوار انتخاب کے لیے نامزد کیے جا سکتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ انصار نے سعدؓ اور حضرت ابوبکرؓ نے ابوعبیدہؓ اور حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی عجلت کی، حاضرین نے ان کا ساتھ دیا۔ (اور پھر دوسرے دن) عامۃ المسلمین نے اس بیعت کی تصدیق کر دی[۳۴]

صرف تصدیق ہی نہیں کی، بلکہ امیدواری پر کوئی تنقید بھی نہیں کی، بلکہ مفاہمت کر کے انصار کو دستبردار ہو جانے پر آمادہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"مہاجرین اولین کے بعد ہمارے نزدیک تم ہی قدر و منزلت کے حامل ہو۔ پس ہم امیر ہوں گے اور تم وزیر، تمھارے مشورے کے بغیر ہم کوئی کام نہیں کریں گے۔"[۳۵]

پھر حضرت علیؓ کے دور میں جب حضرت طلحہؓ و زبیرؓ نے نقض بیعت کی۔ تو حضرت علیؓ نے ان سے جواب طلب کیا۔

"طلحہؓ نے نقض بیعت کا سبب یہ بتایا کہ وہ "جبری" تھی؟ اور زبیرؓ نے فرمایا کہ ہم آپ کو اپنے سے زیادہ مستحق زیادہ نہیں خیال کرتے ہے!"[۳۶]

دونوں حضرات کے دعوے کی صحت یا عدم صحت پر گفتگو مقصود نہیں۔ لیکن اس بیان سے جو بات ثابت ہوتی ہے یہ ہے کہ:

۱۔ جبری بیعت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

۲۔ خلافت کی امیدواری میں کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت علیؓ کا ایک خطبہ بھی اس سلسلے میں قابلِ غور ہے:

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں خلافت کا ہر شخص کے مقابلہ میں زیادہ شائستہ اور سزاوار تر ہوں، پھر بھی ایثار سے کام لوں گا، اور اس وقت تک اس بیعت کو تسلیم کرتا رہوں گا جب تک امورِ مسلمین رو براہ رہیں گے!"[۳۷]

اس سے ایک تیسری بات معلوم ہوئی کہ رضامندانہ بیعت بھی اس وقت ختم کی جا سکتی ہے، اگر "امورِ مسلمین" رو براہ نہ رہیں۔

امیدواری کے بارے میں ماوردی کا فیصلہ: اور ماوردی نے تو امیدواری کے بارے میں بڑا واضح فیصلہ کر دیا ہے:

جمہور علماء اس بات کو مانع امامت نہیں سمجھتے، اور نہ امامت کی خواہش کو مکروہ جانتے ہیں!"[۳۸]

دنیا کی دوسری قوموں اور ملتوں نے اور ادیان غیر کے ماننے والوں نے غیر قوموں اور غیر مذہب والوں کے ساتھ عہد مظلمہ سے لے کر اب تک اتنا غیر جانب دارانہ فراخ دلانہ اور شریفانہ برتاؤ نہیں کیا، جتنا ہر دور کی اسلامی حکومت کرتی آئی ہے

یہ تاریخ کا عجیب اور حیرت انگیز واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے جب دوسروں کو چھوڑ کر اپنوں کی گردنیں کاٹنا شروع کیں تب بھی کسی غیر مسلم کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ انتہا یہ ہے کہ جن لوگوں کو امتِ مسلمہ کا سفاک ترین انسان قرار دیا جا سکتا ہے اُن کی سفاکی بھی صرف اپنوں تک ہی محدود رہی۔ غیر مسلموں کو اُن سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اب دنیا میں ایک نئے سکے کا چلن شروع ہوا ہے۔ جس کا نام "سیکولرازم" ہے۔ جو حکومتیں سیکولر ہونے کی مدعی ہیں ان کے ہاں بھی اقلیتوں اور غیر مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ انسانیت سوز سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ کاغذ پر انھیں ہر طرح کے حقوق عطا کر دیئے گئے ہیں لیکن عمل کی دنیا میں یہ سارے حقوق چھین لیے جاتے ہیں۔

اسلام کی ساری تاریخ سامنے ہے۔ چودہ سَو برس کی اس طویل مُدت میں شاید ہی کوئی ایسا واقعہ پیش کیا جائے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ کسی شخص کو صرف اس لیے ہدفِ ستم بنایا گیا کہ وہ مسلمان نہیں تھا، بلکہ اس طرح کی بکثرت مثالیں مل جائیں گی کہ مذہب کے سوال کو نظر انداز کر کے اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مراعات کا سلوک روا رکھا گیا، تاریخِ اسلام کے آئینے میں، کچھ ہرج نہیں، اگر ایک جھلک اس دعوے کی صداقت پر بھی ڈال لی جائے۔

غیر مسلموں سے حُسنِ سلوک و مراعات: ثمامہؓ نے جب اسلام قبول کیا تو مسلمانہ جوش کے ساتھ ملک یمامہ سے ایک دانہ گندم بھی مکہ مکرمہ کی طرف نہ بھیجنے کا اعلان کر دیا۔ جو لوگ اسلام اور داعی اسلام کے بدترین دشمن تھے ان کے ساتھ رعایت کیسی؟ ثمامہؓ نے اس فیصلے پر پوری سختی کے ساتھ عمل بھی کیا، آخر اہلِ مکہ، فریاد کناں آپؐ کے پاس حاضر ہوئے، آپؐ نے ثمامہؓ کو لکھ دیا کہ غلے کی نقل و حمل جاری رہنے دی جائے[۳۹]

دشمن کے ساتھ حُسنِ سلوک کی دنیا میں کیا یہ پہلی مثال نہیں تھی؟

جزیہ ان غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے جو لڑ کر شکست کھا چکے ہوں یا جنگ

کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں۔ ایسے غیر مسلموں کی جان و مال کی حفاظت اسلامی حکومت کے ذمے ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ ذمی کہلاتے ہیں یعنی اسلامی حکومت ان کی حفاظت کا ذمہ لے چکی ہے۔ اس ذیل میں فقہ حنفی مشہور کتاب کا فتویٰ یہ ہے:

"جزیہ دینے والے (ذمی) کی جان و مال کی اس طرح حفاظت کی جائے گی جیسے مسلمانوں کی، ان کے لیے وہی اصول ہوں گے جو مسلمانوں کے لیے ہیں، کیونکہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ کفار جزیہ اس لیے دیتے ہیں کہ ان کا خون مسلمان کے خون کی مانند اور ان کا مال مسلمانوں کے مال کی مانند محترم ہو جائے[۴۰]!"

جنگی قیدیوں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ: جو لوگ جنگی قیدی بن کر آتے تھے سب سے پہلے آپؐ ان کے لباس کا فکر کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا تھا کہ وہ ثنا خوانی کے لیے مجبور ہو جاتے تھے۔ جنگِ بدر کے ایک قیدی کا بیان ہے:

"اللہ مسلمانوں پر رحم کرے، یہ اپنے اہل و عیال سے اچھا کھانا ہمیں کھلاتے تھے، اور اپنے گھر کے لوگوں سے کہیں زیادہ ہماری آسائش کا خیال رکھتے تھے[۴۱]!"

اور یہ سلوک اس لیے کیا جاتا تھا کہ، اسلام دشمن کو بھی انسان سمجھتا ہے اور کسی کے فکر اور عقیدے میں جبر و جور کے ذریعے تبدیلی پسند نہیں کرتا، اس کا واضح ارشاد ہے:

"لا اکراہ فی الدین" یعنی دین کے معاملہ میں جبر روا نہیں[۴۲]۔

جب دین کے معاملے میں جبر روا نہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ غیر مسلموں کو انسانی حقوق سے محروم کر دیا جائے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ذیل میں پیش کی جاتی ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ آپؐ کی نظر میں غیر مسلم کا خون بھی اتنا ہی محترم تھا جتنا مسلمان کا، آپؐ نے فرمایا:

"اگر کوئی مسلمان کسی معاہد (غیر مسلم رعایا) کو قتل کر ڈالے گا تو وہ جنت کی

خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا، حالانکہ وہ چالیس سال کی مسافت سے آنے لگتی ہے[۴۳]

غیر معاند غیر مسلموں سے استعانت: جو غیر مسلم اپنے مذہب پر تو استوار تھے لیکن اسلام کے معاند نہیں تھے۔ ان سے استعانت تک کی مثال اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتی ہے۔ اور وہ بھی کب؟ فتح مکہ کے موقعہ پر:۔

آپؐ نے فرمایا: "اے ابو امیہ! ہمیں اپنے ہتھیار مستعار دو، کل ہم ان سے اپنے دشمن کا مقابلہ کریں گے!"

صفوان بولا: "اے محمدؐ! کیا غصب کرنا چاہتے ہو"؟

آپؐ نے فرمایا: "نہیں، مستعار لے رہا ہوں، اور واپس دینے کی ضمانت لیتا ہوں۔!"

وہ کہنے لگا: "اچھا پھر کوئی حرج نہیں، اس نے آپؐ کی خدمت میں ایک سو زرہیں پیش کیں، اور ساتھ ہی بقدر کفایت ہتھیار بھی مہیا کیے، نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سواریوں کے متعلق بھی فرمایا، اس کی تعمیل بھی ہوئی۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نکلے، آپؐ کے ہمراہ اہل مکہ کے دو ہزار اور مدینہ سے آنے والے دس ہزار مسلمان تھے۔ جن کے ہاتھ پہ اللہ تعالیٰ نے مکہ فتح کرایا[۴۴]

غیر مسلم، مسلم حکومت کی انتظامیہ کا عہدہ دار بھی بن سکتا ہے۔

ہر وہ شخص جو اس کام کا اہل اور امانت دار ہو، عامل ہو سکتا ہے۔ پس اگر عامل تفویض کا عہدہ ہو تو حریت اسلام اور اجتہاد کا ہونا شرط ہے۔ اور عامل تنفیذ کا عہدہ ہو تو چونکہ اجتہاد کی ضرورت نہیں، لہٰذا حریت اور اسلام بھی شرط نہیں[۴۵]

غیر مسلم معاہدین کو مسلمانوں پر ترجیح: اسلام غیر مسلم معاہدین کے خلاف مسلمانوں کی مدد کرنے تک کا بھی روادار نہیں:۔

"وان استنصروکم فی الدین" یعنی اگر وہ مسلمان دین کے معاملہ میں تم سے مدد

فعلیکم النصر الا علیٰ قوم بینکم وبینہم میثاق" کے طالب ہوں تو مدد کرنا تم پر فرض ہے لیکن کسی ایسی (غیر مسلم) قوم کے خلاف نہیں جس سے تمھارا معاہدہ ہو[۴۶]!"

"اسلامی حکومت میں جو حد مسلمانوں پر جاری ہوتی ہے، غیر مسلم اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً زنا کے جرم میں سنگساری کی سزا صرف مسلمان کو دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس سزا کے نفاذ کے لیے اسلام شرط اوّل ہے۔ یہ جُرم کسی کافر سے سرزد ہو تو اسے سزائے تازیانہ دی جائے گی، سنگسار نہیں کیا جائے گا[۴۷]!"

فتح مکہ تاریخ اسلام کا سب سے زیادہ عہد آفرین واقعہ ہے۔

آج کے فاتح، کل بے بس اور مجبور ہو کر اپنے دیس سے ہجرت پر مجبور ہو گئے تھے۔ جب تک یہ اپنے دیس میں رہے کون سا لرزہ خیز ظلم تھا جو اُن پر روا نہیں رکھا گیا۔ اُن کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا گیا۔ مکان اور کھیت ہتھیا لیے گئے۔ بیوی اور بچوں کو چھین لیا گیا۔ ان میں سے نہ جانے کتنوں کو قتل کر دیا گیا——— یہ فاتح کی حیثیت سے اپنے دیس میں داخل ہو رہے تھے۔

مفتوحوں سے فراخدلانہ برتاؤ: مکہ کا ہر باشندہ سہما ہوا تھا۔ دیکھیے کاتبِ تقدیر کیا لکھتا ہے؟

یہ ڈرے اور سہمے ہوئے لوگ ایک ایک کر کے اپنے ظلم اور شقاوت کو یاد کر رہے تھے۔ یہ جانتے تھے کہ حاکم مفتوح کے ساتھ کیا کرتا ہے؟

یہ خود بھی اپنے زیردستوں کے ساتھ کیا کچھ نہ کر چکے تھے، آج ان کی باری تھی، اور انھیں اپنا حساب چکانا تھا!

انھیں مال و دولت کی فکر نہیں تھی، زندگی کی فکر تھی، آج وہ چھنتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

لیکن فاتح فوج کا سپہ سالارِ اعلیٰ صرف سپہ سالارِ اعلیٰ نہ تھا رحمۃ للعلمین

بھی تھا۔ اس نے داخلے کے وقت اپنی منظم اور اطاعت کیش فوج کے لیے
فرمان صادر کیا :

۱ : جو ہتھیار پھینک دے، قتل نہ کیا جائے۔
۲ : جو خانہ کعبہ میں پناہ گزیں ہو جائے اسے قتل نہ کیا جائے۔
۳ : جو شخص ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ قتل سے محفوظ ہو جائے گا۔
۴ : جو خانہ نشین ہو جائے اس کا قتل ممنوع ہو گا۔
۵ : جو حکیم بن حزام کے گھر چلا جائے وہ قتل سے بری ہو گا۔
۶ : بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔
۷ : کسی جنگی قیدی کو قتل نہ کیا جائے[۴۸]

اور : جنگ کے بارے میں امن کے قانون بالائے طاق رکھ دیئے جاتے ہیں، صرف شقاوت اور سفاکی کا قانون چلتا ہے۔ لیکن اسلامی حکومت جنگ کے بارے میں بھی امن ہی کے قانون پر عمل پیرا رہتی ہے۔

اسلامی جنگ کے احکام متعدد پہلوؤں سے قانون بین الاقوامی کے احکام سے متفق ہیں۔ نہ صرف متفق بلکہ ان سے برتر اور اعلیٰ ہیں، البتہ اختلافی پہلو جو کچھ ہے وہ صرف یہ ہے کہ یہ احکام دینی اور شرعی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اور ان کی تنفیذ میں مسلمان کی قوت یقین اور اس کا ایمان بھی کارفرما رہتا ہے جس طرح دوسرے احکام میں یہی جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس دوسروں کے ہاں یہ چیز مفقود ہے۔

قانون بین الاقوامی کے احکام میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے لیے قوت تنفیذ نہیں ہے جو ان کی بجا آوری کی ضامن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مفکرین احکام دولیہ کو ایسا قانون کہتے ہیں جو تسامح کے اقسام میں سے ایک ہے۔ یہ قانون صرف اس صورت میں نافذ ہو سکتا ہے کہ کوئی قوت اس کی حمایت و حفاظت و تنفیذ کے لیے موجود ہو، جس کے احکام کو کسی حالت میں رد نہ کیا جا سکے۔

جنگ سے پہلے اعلانِ جنگ ضروری ہے :- قوانین بین الاقوامی میں سے ایک اہم قانون یہ ہے اگر کوئی حکومت کسی دوسری حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے پر مجبور ہو تو اس پر واجب ہے کہ باقاعدہ اعلانِ جنگ کرے ، اور اس کی رعایا کو اپنے ارادہ جنگ سے مطلع کر دے ۔ اس اعلان کی غرض یہ ہے کہ اچانک حملہ نہ ہو ، اور بدعہدی نہ ہو ۔ اگرچہ یہ قانون صرف قانون ہے ۔ اس پر عمل درآمد ضروری نہیں ۔ جاپان نے چین پر ، اطالیہ نے حبش پر ، جرمنی نے روس پر ، بھارت نے پاکستان پر اعلانِ جنگ کیے بغیر حملہ کر دیا تھا ۔

اب شرع اسلام کو ملاحظہ فرمائیے ۔ کفار سے مقاتلہ کرنے سے پیشتر مسلمانوں پر واجب ہے کہ انھیں باقاعدہ دعوت دیں ۔ وہ دعوت اگر رَد ہو جائے تو جنگ کریں ۔

قوانین دولت میں سے ایک قانون یہ بھی ہے کہ جو لوگ غیر فوجی ہوں ، انھیں دشمن نہ سمجھا جائے ، اور انھیں تکلیف نہ پہنچائی جائے ۔ لیکن یہ قانون بھی صرف زینت قرطاس ہے ورنہ اس پر عمل درآمد کا یہ حال ہے کہ غیر جنگجو لوگوں کو بدترین دشمن سمجھ کر انہی کو زیادہ سے زیادہ ہدفِ ستم بنایا جاتا ہے ۔

لیکن شریعتِ اسلامیہ نے کوئی مجمل بات نہیں کی ہے بلکہ صاف صاف کہہ دیا ہے کہ عورتوں اور بچوں ، راہبوں ، پادریوں ، بوڑھوں ، بیماروں ، اور نکموں کا قتل قطعاً ناجائز ہے ۔ نیز جو لوگ جنگ آزما نہ ہوں ، انھیں بھی قتل نہ کرنا چاہیے ، اور اس قانون پر اسلامی حکومت میں ہمیشہ سختی سے عمل درآمد ہوا ۔

غیر محارب غیر مسلموں اور محصورین کے ساتھ رعایت : شریعتِ اسلامیہ میں وضاحت کے ساتھ ان لوگوں کے قتل کی ممانعت کی گئی ہے جو جنگ سے الگ تھلگ ہوں ، اور اس کی بھی ممانعت کی گئی ہے کہ زندہ یا مردہ کو آگ میں جلایا جائے ۔ اس کی بھی ممانعت کی گئی ہے کہ فصلوں کو ، پھلوں کو کھیتیں

خراب اور ناکارہ بنایا جائے، اور تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کی ان ہدایات پر ان ملوک و سلاطین نے بھی سختی سے عمل کیا جن کا برتاؤ خود مسلمانوں کے ساتھ یعنی اپنی قوم اور ملت کے ساتھ حد درجہ بہیمانہ اور سفاکانہ تھا۔ حجاج بن یوسف ثقفی کتنا بڑا خون آشام انسان تھا، اس نے ہزارہا مسلمانوں کو بے جرم و خطا موت کے گھاٹ اتارا، انھیں طرح طرح کی اذیتیں دیں لیکن اس کے سارے دورِ حیات میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ اس نے غیر مسلموں پر ظلم کیا ہو بلکہ ملتی ہے تو یہ کہ اس نے بایں ہمہ شقاوت و سنگ دلی غیر مسلموں کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کیا۔

یہی نہیں، بلکہ محصورین کے ساتھ یہ رعایت رکھی ہے کہ وہ اگر حصار سے تنگ آجائیں، اور ذرا بھی صلح و مفاہمت کی طرف مائل ہوں تو محاصرہ اٹھالیا جائے اور نرم شرائط پر صلح کرلی جائے، تاریخ اسلام میں اس طرح کی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ مسلمانوں نے مغلوب و عاجز دشمن سے جب صلح کی اپنے شرائط نہیں ٹھونسے بلکہ خود اس کے پیش کیے ہوئے شرائط پر صلح کرلی، اور اسے عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کا موقع دیا۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے دھوکہ کی اجازت نہیں دی ہے اثنائے قتال میں جو احکام اسلام نے دیئے ہیں اس سے بھی تخفیف ویلات مخصوص ہے۔ مثلاً یہ کہ مثلہ نہ کیا جائے۔ عذاب نہ دیا جائے۔ ضروریات زندگی کا اتلاف نہ کیا جائے۔ یہاں تک کہ اگر مسلمانوں کے دشمن مثلہ کریں، یعنی کسی مسلمان پر قابو پاکر اس کے ہاتھ پاؤں، ناک، کان کاٹ ڈالیں تو افضل یہ ہے کہ اس تکلیف دہ مثال کی پیروی نہ کی جائے، یعنی مستحسن یہ ہے کہ مسلمان کے قبضہ میں اگر دشمن کا کوئی آدمی آجائے تو اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا جائے![۴۹]

معاہدۂ صلح کا احترام: امیر معاویہ رضؓ کا رومیوں سے معاہدۂ صلح

تھا لیکن صلح کے زمانے میں انھوں نے رومیوں سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور فوج لے کر بڑھے کہ معاہدہ ختم ہوتے ہی سرکوبی شروع کر دیں۔ اثنائے سفر میں، عمرو بن عینیہ نے ٹوکا: "اللہ اکبر، اللہ اکبر! یہ نقضِ عہد؟"

امیر معاویہؓ نے انھیں قائل کرنا چاہا۔ جواب میں انھوں نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اگر کوئی شخص کسی قوم سے معاہدہ صلح کرتا ہے، تو نہ وہ اس کی گرہ باندھے نہ کھولے، یہاں تک کہ مدت معاہدہ ختم ہو جائے، یا ختم معاہدہ کا کھلم کھلا اعلان کر دیا جائے (تاکہ دشمن بھی جنگ کی تیاری کر لے)۔ آخر امیر معاویہ نقضِ عہد نہ کر سکے اور واپس آ گئے۔"[۵]

حضرت عمرؓ اور ہرمزان: ایران کا ہرمزان، جو جنگ کے دوران میں، بہت سے مسلمانوں کو قتل کر چکا ہے اور جلیل القدر صحابہؓ کے خون سے بھی اس کے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں، اسلام کی رواداری سے بہرہ ور ہو کر جان بخشی کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ دربارِ عمرؓ میں حاضر ہو کر اپنا حکم قتل سنتا اور پانی مانگتا ہے گلاس ہاتھ میں لے کر کہتا ہے جب تک یہ پانی نہ پی لوں مجھے قتل نہ کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں۔ ہاں کوئی حرج نہیں، وہ پانی پھینک دیتا ہے اور کہتا ہے میں تو نہیں پیتا۔ پھر حضرت عمرؓ نے جب اس کے قتل کا حکم دیا تو حضرت انسؓ نے کہا۔ آپؓ اسے امان دے چکے ہیں۔ لہٰذا قتل کیسا؟

حضرت عمرؓ نے کہا: اے انس، اس نے براء بن مالک اور مخراق بن ثور الدوسی کو قتل کیا ہے!

انسؓ کہتے ہیں، میں نے کہا: "آپ کے پاس اس کے قتل کی کوئی سبیل نہیں ہے!"

حضرت عمرؓ نے کہا: "کیا اس نے تجھے کچھ دے دیا ہے؟"

میں نے کہا نہیں! لیکن امیرالمومنین نے اس سے کہا تھا۔ لا بأس!

حضرت عمرؓ نے کہا: "بہ میں نے کب کہا تھا؟ شاہد لاؤ، ورنہ میں

تمھیں سزا دوں گا!"

انس رضؓ کہتے ہیں، مَیں اُٹھا اور زبیر رضؓ بن عوام کے پاس گیا، وہ اس وقت مجلس میں موجود تھے، اور انھیں وہ بات یاد تھی، جو مجھے یاد تھی، وہ آئے اور انھوں نے شہادت دی۔

حضرت عمر رضؓ نے ہرمزان کو رہا کر دیا، وہ اسلام لایا، اور اس کے لیے روزینہ مقرر کر دیا گیا۔

حضرت عمر رضؓ نے اپنے سالارِ عساکر سعد رضؓ کو ایک خط لکھا۔ اس خط میں انھوں نے عجمیوں کے بارے میں فرمایا: "اگر تم میں سے کوئی شخص بطور کھیل کے بھی کسی عجمی کو امان دے یا ایسا اشارہ کرے، یا ایسے الفاظ کہے، جن کو عجمی نہ سمجھتے ہوں، مگر وہ اس کو امان جانیں، تو تم اس امان کو برقرار رکھو!"[۱۵۱]

اسلامی حکومت جن آدابِ جنگ کو ملحوظ رکھنے پر مجبور ہے وہ کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں۔ اس لیے ناقابلِ ترمیم ہیں:

"عورتوں اور بچوں کو اگر قتال نہ کرتے ہوں تو کسی حالت میں بھی قتل کرنا جائز نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ نیز خدمت گار اور غلاموں کے قتل سے بھی آپ صؐ نے روکا ہے، اگر عورتیں اور لڑکے قتال میں حصہ لے رہے ہوں تو ان کو بھی قتل کیا جائے، بشرطیکہ سامنا کر رہے ہوں۔ اور اگر پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے ہوں تو قتل کرنا جائز نہیں۔"

اگر دشمن صلح کرتے وقت یہ اصرار کریں کہ ہمارا آدمی مسلمان ہو جائے تو وہ ہمیں واپس کر دیا جائے، تو یہ شرط منظور کر لینی جائز ہے۔ اگر ان میں سے کسی نے اسلام قبول کر لیا، اور واپس کرنے میں اس کی جان تلف ہونے کا خطرہ نہیں ہے تو وہ واپس کر دیا جائے، اور اگر خطرہ ہو تو واپس نہ کیا جائے اور اگر کوئی عورت اسلام لے آئے، تو اس کے واپس کرنے کی شرط منظور نہیں ہے اس لیے کہ وہ کفار پر حرام ہو جاتی ہے۔ اگر یہ شرط تسلیم کر لی گئی

ہو، تب بھی واپس نہ کی جائے۔[۵۲]

کفار سے خواہ مخواہ جنگ بھی نہیں کی جا سکتی۔ اس کے بھی کچھ حدود و شرائط ہیں:

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین ۝

یعنی اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو، کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔[۵۳]

یعنی جنگ صرف ان کافروں سے کی جا سکتی ہے، جو خود ہی نبرد آزما ہوں۔ ایسے لوگوں سے بھی زیادتی نہ کرنا چاہیے، اور جو کافر جنگ آزما نہ ہوں، ان سے لڑائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک سفرِ جہاد میں صحابہؓ بھوک کی شدت سے نڈھال ہو گئے۔ آخر یہاں وہاں سے چند بکریاں لوٹ کر لائے۔ ذبح کر کے ان کا گوشت دیگچیوں میں چڑھا دیا۔ آپؐ کو خبر ہوئی تو کمان کی نوک سے دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا:

"لوٹ کا مال مردار کی طرح ہے!"[۵۴]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی غزوہ میں ایک مقتول عورت دیکھی۔ اس پر آپؐ نے بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرما دیا۔[۵۵]

اسلامی حکومت کافروں سے نہ صرف خواہ مخواہ جنگ نہیں کر سکتی، بلکہ چوکس رہنے کے ساتھ ساتھ دعوتِ صلح دینے پر بھی مجبور ہے:

"فلا تھنوا وتدعوا الی السلم وانتم الاعلون ۝

یعنی سست نہ پڑ جاؤ، اور دعوتِ صلح دیتے رہو، یاد رکھو تم غالب و سربلند ہو۔[۵۶]

کفار مائل بہ صلح ہوں تو صلح کر لینا ضروری ہے: اگر جنگ کا انجام دیکھ کر کفار میدانِ جنگ سے ہٹ جائیں تو بھی ان سے جنگ نہیں کی جا سکتی، صلح کر لینی چاہیے۔

فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم

یعنی اگر کفار تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور

وان قوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیہم سبیلا ط ۔ جنگ نہ کریں بلکہ صلح کی پیش کش کریں، پھر خدا نے تمھیں ان سے جنگ کا اختیار نہیں دیا ہے[۵۷]

مسلمان فاتح مفتوح کافروں سے اپنا مال مغصوبہ بھی واپس نہیں لے سکتا۔

فتح مکہ کے دن مہاجرین جب مکہ واپس آئے تو انھوں نے اپنے مکانوں کا مطالبہ کیا جن پر مشرکین قابض ہو چکے تھے لیکن آپؐ نے کسی مشرک کے قبضہ سے چھین کر مسلمان کا چھنا ہوا مکان اسے واپس نہیں دیا۔[۵۸]

اسیرانِ جنگ غلام نہیں بنائے جا سکتے: اسیرانِ جنگ کے بارے میں یہ سمجھ لینا کہ وہ غلام بنا لیے جائیں گے، قطعاً غلط ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کسی جنگی قیدی کو غلام نہیں بنایا۔ اسلام غلامی کو مٹانے آیا تھا، برقرار رکھنے کے لیے نہیں، اس نے یہ البتہ کیا کہ جو غلام بہ تعداد کثیر پہلے سے سوسائٹی میں موجود تھے اُن کی تدریجی آزادی کا لائحہ عمل تیار کیا، باقی جنگی قیدیوں کے لیے قرآن کا صاف حکم موجود ہے۔

"فاما منا بعد و اما فداء" یعنی یا تو انھیں احسان رکھ کر رہا کر دیا جائے یا فدیہ لے کر پروانۂ رہائی عطا کیا جائے۔[۵۹]

اس کے علاوہ کوئی تیسری صورت اسلام میں نہیں ہے۔

ان مراعات و رعایات کے ساتھ ساتھ جہاں تک جنگی چوکسی کا تعلق ہے داعئ اسلامؐ اور صحابۂ کرامؓ نے کبھی کسی طرح کے "وہن" (تکاسل) کا اظہار نہیں کیا، بلکہ خود پیش قدمی نہ کر کے دفاع کے لیے ہمیشہ آمادہ اور تیار رہے۔

جب آپؐ کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو جنگی چال سے کام لیتے۔ مثلاً آپؐ نے جب غزوۂ حنین کا ارادہ فرمایا تو دریافت کیا کہ نجد کا راستہ کون سا ہے؟ اور اس کا پانی کیسا؟ اور وہاں کون دشمن ہے؟

یعنی حنین کے بجائے نجد کا راستہ معلوم کیا اور دوسری معلومات فراہم کیں۔ لیکن یہ نہیں فرمایا کہ ہم نجد جائیں گے کیونکہ غلط بیانی ہوتی اور یہ ربی[۶۰]

معصوم ہوتا ہے۔

نیز لڑائی میں آپؐ صحابہؓ کا ایک نشان مقرر فرما دیتے، جب وہ آپس میں ملیں (تاکہ دشمن دھوکا دے کر شریک نہ ہو سکے) ایک بار ان کا شعار یہ تھا، امت امت ایک بار "یا منصور"، شعار مقرر کیا گیا۔ ایک "ھم لا ینصرون" تھا۔

کسی وجہ سے مسلمان اگر کافروں سے عہد کرلے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ شریک جنگ ہو کر ان کے مقابلے میں نہیں آئے گا، تو اس عہد کی پابندی لازمی ہے:

"نیز آپؐ کی سنتِ طیبہ تھی کہ اگر آپؐ کے دشمن کسی صحابیؓ سے معاہدہ کو (محدود حد تک) جاری نہ رکھتے، جیسا کہ حضرت حذیفہؓ اور ان کے والدؓ نے کفار سے معاہدہ کرلیا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ آلہٖ وسلم کے ہمراہ ان کے خلاف جنگ نہ کریں گے۔ تو آپؐ نے اسے (عہد کو) جاری رہنے دیا، اور فرمایا کہ تم دونوں واپس جاؤ، جو عہد کیا ہے، اسے پورا کرو، اور ہم کافروں کے مقابلہ میں صرف اللہ تعالیٰ سے مدد چاہتے ہیں۔

میدانِ جنگ میں کلمہ پڑھ لینے کے بعد کسی کی نیت پر اور اس کے اسلام پر شک نہیں کیا جا سکتا:

"حضرت اسامہؓ ایک آدمی کے پیچھے نکلے، جس کا نام نہیک بن مرداس تھا۔ جب اس کے قریب آئے، اور تلوار سے اس پر حملہ کیا، تو اس نے "لا الٰہ الا اللہ" پڑھ دیا۔

انھوں نے پھر بھی اسے قتل کر دیا پھر انھوں نے بکریوں، چوپایوں وغیرہ کو ہنکایا، ہر آدمی کو دس بکریاں یا اس کے برابر چوپائے ملے۔

جب یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، آپؐ کو حضرت اسامہ کے اس فعل کی خبر دی گئی۔

آپؐ کو یہ بات سخت ناگوار گذری، اور فرمایا کہ تو نے "لا الٰہ الا اللہ" کہنے کے بعد بھی اسے قتل دیا؟

انھوں نے جواب دیا: "اس نے محض جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا تھا"

آپؐ نے فرمایا: "کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟"
پھر فرمایا: "قیامت کے دن "لا الٰہ الا اللہ" کے مقابلے میں کون تیرا مددگار ہوگا؟ پھر آپؐ یہ بات دُہراتے رہے، یہاں تک کہ اسامہؓ نے دل میں کہا، کاش! میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا" پھر کہا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اللہ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی اس آدمی کو قتل نہ کروں گا جو لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوگا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ:
"خالد بن ولید کی شمشیر خاراشگاف کے سامنے چند کافر آگئے۔ انھوں نے گھبراہٹ میں کہا: "ہم صابی ہوگئے، ہم صابی ہوگئے!" اور صحیح انداز سے یوں نہ کہا کہ ہم مسلمان ہوگئے۔ اس گفتگو کے بعد انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔
پھر خالدؓ نے حکم دیا کہ انھیں گرفتار کرلو، وہ گرفتار کرلیے گئے، بعض کو باندھ دیا، اور اپنے اصحاب میں تقسیم کردیا، جب سحر ہوئی تو خالدؓ نے آواز دی کہ جس کے ساتھ کوئی قیدی ہو، اسے قتل کردو، بنو سلیم نے اپنے اپنے قیدیوں کو قتل کردیا، اور مہاجرین و انصار نے اپنے قیدیوں کو چھوڑ دیا۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خالدؓ بن ولید کے اس فعل کی خبر ملی تو آپؐ نے فرمایا: "اے اللہ خالد نے جو کچھ کیا، میں اس سے بری ہوں، پھر حضرت علیؓ کو بھیجا تاکہ مقتولوں کا خون بہا ادا کیا جائے"[۵۶]

غلامی کا استیصال: میں عرض کرچکا ہوں، اسلام غلامی ختم کرنے آیا تھا، اور اسلامی حکومت نے اس کام کو سرانجام دینا بہت آسان بنادیا، کیونکہ زکوٰۃ میں غلاموں کا حصہ رکھ دیا گیا کہ وہ آزادی حاصل کرسکیں:
"زکوٰۃ میں پانچواں حصہ غلاموں کا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مکاتبین کو رقم دی جائے جس سے خود کو آزاد کرلیں، امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ غلام خرید کر آزاد کیے جائیں"[۵۷]

غلام کے حقوق اور مرتبہ: امر واقعہ یہ ہے کہ: "غلام کو آزاد کرانے کے جتنے مواقع ہو سکتے تھے، اسلام نے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں دریغ نہیں کیا، "تدبیر" بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے مفہوم اس کا یہ ہے کہ آقا یہ وصیت کر دے کہ اس کی موت کے بعد غلام آزاد ہوگا۔ علماء کا اتفاق ہے کہ کسی انسان کے قبضے میں کوئی عاقل بالغ شخص ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ میرا غلام ہے، غلام تکذیب کرتا ہے تو غلام کی بات قسم دلانے کے بعد تسلیم کر لی جائے گی۔ کہ وہ آزاد آدمی ہے۔ مشہور قاعدہ: "البینہ علی المدعی والیمین علی من انکر" کی روشنی میں اگر اس کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی حریت کو شریعت نے اصل سمجھا ہے اور غلامی کو ایک امر عارض، اسی لیے مدعی پر بار ثبوت ڈالا اور منکر کے ساتھ محض یمین (قسم) پر کفایت کی، اس سے شارع علیہ السلام کی اس شدت حرص کا پتہ چلتا ہے جو آپؐ کے اندر غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے ہر گنجائش کے موقع پر پائی جاتی تھی، اسی کے ساتھ فقہاء کے اس اجماع کا بھی اضافہ کر لیجیے کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ اس کا غلام ہے، اور کافر کہے کہ نہیں وہ اس کا لڑکا ہے تو اس کو آزاد رکھنے اور غلامی کی لعنت سے بچانے کے لیے کافر کا لڑکا ہی قرار دیا جائے گا، اور فیصلہ مسلمان کے خلاف ہوگا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ حریت اسلام کے نزدیک کس قدر مقدس چیز ہے؟

د اصل الاحرب سے روایت ہے کہ انھوں نے معرور بن سوید کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ: "میں نے ابوذر غفاریؓ کو دیکھا کہ وہ اور ان کا غلام ایک ایک حلّہ پہنے ہوتے ہیں۔ ہم لوگوں نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا، تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے ایک مرتبہ اس شخص کو گالی دی۔ اس نے جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کر دی، آنحضرتؐ نے مجھے کہا: "تم نے اس کو ماں کی گالی دی؟"

پھر آپؐ نے فرمایا: "تمھارے ملازم تمھارے بھائی ہیں۔ اللہ نے ان کو

تمھارے ماتحت کر دیا ہے پس جس شخص کا بھائی اس کے ماتحت ہو، اس کو چاہیے کہ اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے، اور اسے وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالو اور اگر ڈالو تو پھر ان کی مدد کرو۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تم میں سے کسی کے پاس جب اس کا نوکر کھانا لے کر آئے اور وہ اس کو کھانے پر نہ بٹھائے تو چاہیے کہ اس میں سے ایک یا دو لقمہ اس کو ضرور دے دے کہ اس نے کھانا پکانے کے تمام لوازمات اور ضروریات کی مشقتوں اور آگ کی گرمی کو برداشت کیا ہے۔

ابن مسعودؓ انصاری سے روایت ہے کہ "میں اپنے غلام کو مار رہا تھا۔ یک بہ یک میں نے یہ آواز سنی:

"خبردار! ابن مسعود!!"

تھوڑے وقفے کے بعد پھر یہی آواز سنائی دی، میں نے مڑ کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے تھے۔ کوڑے کو میں نے پھینک دیا۔

آپ نے فرمایا: "خدا کی قسم جتنی قدرت تم کو اس غلام پر ہے، اس سے زیادہ اللہ تم پر قادر ہے!"

ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو سوار اور اس کے غلام کو اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے دیکھ کر فرمایا:

"بندۂ خدا! اس کو بھی اپنے پیچھے بٹھالو، اس کی جان بھی تمھاری ہی جان کی طرح ہے۔ چنانچہ اس شخص نے اپنے غلام کو بھی اپنے پیچھے سواری پر بٹھا لیا۔

غلاموں کے ساتھ یہ عنایتیں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تک محدود نہ تھیں۔

روایت ہے، حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: "مجھے شرم آتی ہے کہ میں ایک انسان کو غلام بناؤں، جو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب کہتا ہے[62]۔"

حضرت علیؓ کے متعلق ایک نہایت ہی عمدہ روایت ہے کہ آپؓ نے اپنے غلام کو کچھ درہم دیے کہ وہ قطعے کپڑا متفاوت قیمت کے خرید لائے۔ غلام جب کپڑا لے کر آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو باریک ٹکڑا اور گراں قیمت والا ٹکڑا آپؓ نے غلام کو عنایت فرمایا، اور دوسرا اپنے لیے رکھ لیا؛

اور فرمایا: "جو ٹکڑا بہتر ہے اس کے تم مجھ سے زیادہ مستحق ہو، اس لیے کہ تم جوان ہو، تمہارا دل زینت و آرائش کی طرف ہوگا، رہا میں، تو اب بوڑھا ہو چکا ہوں[۵۶۳]"

خلفائے عباس کی ایک بہت بڑی تعداد امہات اولاد سے تھی، مامون کی ماں ایک ایرانی لونڈی تھی۔ اسی طرح متوکل کی ماں "شجاع" رومی (یا خوارزمی) باندی تھی، اور مقتدر کی ماں سیدہ رومی لونڈی تھی، خلیفہ مستکفی کی ماں بھی لونڈی ہی تھی۔ اور مطیع کی ماں ایک صقلبی باندی تھی جو نہایت ہی عمدہ سیٹی بجاتی اور تمام خوش آواز چڑیوں کی بولیاں بول لیتی تھی۔

لونڈیوں کے ساتھ عقد صرف عباسی خلفاء ہی کا دستور نہ تھا، بلکہ فاطمیوں نے بھی ان کی تقلید کی۔ چنانچہ مستنصر کی ماں ایک یہودی ابوسعید تستری کے گھر کی لونڈی تھی۔ اس لونڈی نے اپنے ہم قوم سوڈانیوں کو کثرت سے دولت فاطمیہ میں لینا شروع کیا، یہاں تک کہ ان کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی۔ خلیفہ مستنصر کی موجودگی میں جبر خلیج میں جو جشن منایا گیا تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے حکیم ناصر خسرو نے جو تفصیلات بیان کی ہیں ان کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس جشن میں جن گروہوں نے شرکت کی تھی، ان میں تیس ۳۰ ہزار سوڈانی تھے۔ جنھیں عبید الشراء یعنی اسیران زر خرید کہا جاتا تھا۔ اور ان کے علاوہ اور دوسرے غلام بھی بہت بڑی تعداد میں موجود تھے[۵۶۴]

J. B. Frend اپنی کتاب "تراث الاسلام" کی اس فصل

میں جس کا تعلق اسپین اور پرتگال سے ہے، رقمطراز ہیں:

"مسلمانوں کے ازدواجی تعلقات مسیحی عورتوں کے ساتھ کثرت سے قائم ہوئے، عبدالعزیز موسیٰ بن نصیر، اور دوسرے سپہ سالاروں نے اسپین کے ملوک قوط کے آخری فرماں روا وترا کے خاندان میں شادیاں کیں۔ اور بعد کی آنے والی نسلوں ——— مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں ——— کی مائیں ہسپانوی نسل کی مستورات ہونے لگیں۔ اسی طرح زمانہ مابعد کی نسلوں کے مسلم افراد ان سرخ بالوں والی قیدی خاتونوں کا جو سپین کے شمالی حصے سے گرفتار کرکے لائی جاتی تھیں، اس شرط پر اپنی امہات اولاد بنانے لگے کہ ان کو اپنی قوم کی عورتوں کے برابر درجہ دیں گے۔ پروفیسر ریبیرا نے قرطبہ کے عہد بازار بردہ فروشی کے متعدد کاغذات کے مطالعے اور بحث وتنقیح کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ باندیوں کی خرید و فروخت کوئی آسان چیز نہ تھی۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھتے ہیں، بلکہ خریدار کو اپنی خریداری کی تکمیل کاتب العقود کے سامنے کرنی پڑتی تھی۔ اور جن اسباب کی بناء پر کسی لونڈی کی خرید ہوتی تھی ان کی وضاحت کی جاتی اور "موضع الاختیار" (رجسٹریشن آفس) میں ان کے نام درج ہوتے تھے۔

اندلس کے امویوں کے زیر سایہ عورتوں کو آزادی کا بہت بڑا حصہ ملا۔ اس عہد میں ان کا بہت زیادہ پاس ولحاظ کیا جاتا۔ بغداد کے عباسیوں کے دور میں ان کو جو حیثیت حاصل تھی۔ وہ اس دور سے بھی زیادہ تھی، شریف خاندان جن باندیوں کو اپنی امہات اولاد بنانا چاہتے تھے، ان کے متعلق زیادہ مرغوب چیز یہ تھی کہ وہ گوری چٹی یا اگر ممکن ہو تو جلیقی (اندلس میں ایک خطہ جلیق کی طرف نسبت) ہوں۔ ہسپانوی عورتوں کے ساتھ ازدواجی زندگی قائم کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی قرن میں عربی عنصر خالص النسل نہ رہا، لیکن باوجود اس کے جہاں تک سلسلۂ نسب کا تعلق ہے، اس میں آباء و اجداد ہی کا اعتبار کیا جاتا تھا۔[۶۵]

اسپین کے غلاموں کے ساتھ مسلمان فاتحوں کا سلوک: سرٹامس آرنلڈ

نے اس باب میں جس کا تمام تر تعلق اسپین کے عیسائیوں میں اسلام کے نشر و اشاعت سے ہے، لکھا ہے کہ اس ملک کے غلاموں کو جو کیتھولک عیسائیوں کے عہد میں غربت و افلاس کے شکار تھے مسلمانوں کے زیر حکومت آنے کے بعد ان کی مذہبی رواداری کے باعث بہت سے حقوق ملے۔ اسی لیے یہ غلام جو تحت الثریٰ میں پہنچ چکے تھے۔ اگر اسپین میں سب سے پہلے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، ان کے نقش قدم کی پیروی دوسرے باشندوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے بھی کی جو ہمیشہ سے بت پرستی کرتے چلے آرہے تھے۔

اسپین کے فتح کرنے میں اس ملک کے غلاموں کے طبقہ سے بڑی مدد ملی انھوں نے عربوں کو خوش آمدید کہا، اس لیے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ لوگ اس قید و بند سے ان کو نجات دلائیں گے۔ جس میں ان کے قوط آقاؤں نے انھیں ڈال رکھا ہے۔ ان کے بہت سے افراد مشرف بہ اسلام ہو گئے، اور چند ایسے مدنی حقوق سے مستفیض ہوئے جن سے اب تک محروم تھے، انھیں کاشت کے لیے اراضی ملیں جو انھیں کے قبضے میں ہوتیں، انھیں صرف حکومت کو کچھ خراج دینا پڑتا۔

غلام کا مسلمان قاتل قتل کیا جائے گا - غلام کو قتل کرنے والا مرد حر قتل کی سزا سے نہیں بچ سکتا:

"امام محمدؒ نے سمرہ سے حسنؓ کی حدیث روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "جو اپنے غلام کو قتل کرتا ہے، ہم اسے قتل کی سزا دیتے ہیں۔"!

آپؐ نے اس بات کی ممانعت فرمائی کہ غلام اپنے آقا کو "ربی" (پروردگار) یا آقا اپنے غلام کو "عبدی" (میرا غلام) کہے اور فرمایا: بلکہ یوں کہو "میرے بچے" "میری بچی"!

آنحضرتؐ کا "غلام"! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت خدیجہؓ سے نکاح کیا تو انھوں نے حضرت زید بن حارثہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہبہ کے طور پر پیش کر دیا۔ زیدؓ کے والد اور چچا فدیہ دینے حاضر ہوئے، ان دونوں

نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق معلوم کیا۔ پتہ چلا کہ آپؐ مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ چنانچہ دونوں وہاں آئے اور عرض کیا: "اے عبد المطلب کے بیٹے! اے ابنِ ہاشم! اے سردارِ قوم کے بیٹے! آپ حرم کے محافظ اور اس کے پڑوسی ہیں۔ آپؐ مسکین کی مدد کرتے اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم آپؐ کے پاس اپنے بیٹے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ ہم پر احسان کیجیے، اور اس کا فدیہ قبول کرکے ہم پر کرم کیجیے۔"

آپؐ نے دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟ انھوں نے عرض کیا، زیدؓ بن حارثہ۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک اور کام کیوں نہ کر لیا جائے۔"

انھوں نے عرض کیا: "وہ کیا ہے؟"

آپؐ نے فرمایا: "زید کو بلاؤ۔ میں اسے اختیار دیتا ہوں، اگر وہ تمھیں منتخب کرے تو وہ تمھارا ہے۔ اور اگر مجھے منتخب کرے تو اللہ کی قسم! میں اس آدمی کے ساتھ نہیں جو اختیار سے اختلاف رکھتا ہو۔"

ان دونوں نے عرض کیا۔ "آپؐ نے انصاف کیا اور بہت ہی خوب فرمایا!"

چنانچہ انھیں بلایا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: تم ان کو جانتے ہو؟"

انھوں نے عرض کیا: "جی ہاں! یہ میرے والد اور میرے چچا ہیں۔"

آپؐ نے فرمایا: "میں کون ہوں، یہ بھی تمھیں معلوم ہے! اور تم نے میری صحبت بھی دیکھ لی۔ اس لیے اب یا مجھے انتخاب کرلو، یا ان دونوں کو منتخب کرلو!"

حضرت زید بن حارثہ نے عرض کیا: "میں کبھی بھی آپؐ کے علاوہ کسی اور کو منتخب نہیں کروں گا۔ آپؐ میرے نزدیک باپ اور ماں کے مقام پر ہیں!"

وہ دونوں کہنے لگے۔ "اے زید تعجب ہے تو آزادی اور اپنے والد اور چچا کے مقابلے میں غلامی قبول کرتا ہے!"

حضرت زید نے فرمایا: "ہاں! میں نے اس ہستی میں ایسی بات دیکھی ہے جس کے باعث میں اس کے سوا کبھی بھی کسی دوسرے کو منتخب نہیں کر سکتا!"

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معاملہ دیکھا تو انھیں اپنے دامن میں لے لیا۔

زرِفدیہ نقد کے بجائے کسب وہنر سے بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔

"امام احمدؒ نے حضرت ابنِ عباسؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ کچھ قیدی ایسے تھے جن کے پاس فدیہ دینے کے لیے مال نہ تھا، تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کا فدیہ مقرر فرمایا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں[۶۷]!"

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں: "میں نے اپنے غلام کو گالی دی یعنی اس کو اس کی ماں کی غیرت دلائی۔ اس کی خبر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: ابوذر! کیا تو نے اس کو اس کی ماں سے غیرت دلائی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ تم میں اب تک ایامِ جاہلیت کا اثر باقی ہے تمھارے غلام تمھارے بھائی ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمھارے قبضے میں دے دیا ہے پس جس شخص کے قبضے میں اس کا کوئی بھائی ہو وہ اسے وہی اور ویسا ہی کھانا کھلائے جو خود کھاتا ہے، اور ایسا ہی لباس پہنائے جیسا خود پہنتا ہے۔ انھیں کبھی ایسی تکلیف نہ دے جو اُن پر گراں گذرے، اور اگر انھیں کوئی ایسا کام کرنے کے لیے کہو جو اُن کے لیے کرنا مشکل ہو، تو اس کام میں خود بھی ان کا ہاتھ بٹاؤ[۶۸]"

اسلام کا دشمن اور مسلمانوں کا قاتل دربارِ رسولؐ میں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نجد کی طرف لشکر روانہ فرمایا۔ چنانچہ وہاں سے بنی حنیفہ کے سردار ثمامہ بن اثال حنیفی کو گرفتار کر کے لایا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا۔ پھر آپؐ اس کے پاس سے گذرے اور فرمایا:

"اے ثمامہ کیا حال ہے!"

وہ کہنے لگا: "اے محمدؐ! اگر آپؐ مجھے قتل کریں تو ایک قاتل کو قتل کریں گے اور اگر معاف کریں تو ایک شکرگذار کو معاف کریں گے، اور اگر آپؐ مال (فدیہ) چاہتے ہوں تو فرمائیے! جتنا مال درکار ہو، میں دوں گا!"

آپؐ آگے بڑھ گئے، پھر دوبارہ پاس سے گذرے اور وہی سوال کیا، اس نے وہی جواب دیا۔ پھر تیسری بار گذرے تو فرمایا: ثمامہؓ کو چھوڑدو (صحابہ نے انھیں چھوڑ دیا)۔ یہ مسجد کے قریب ایک کھجور کے پاس گئے، غسل کیا۔ پھر واپس آکر اسلام قبول کر لیا، اور کہا: "اللہ کی قسم! میرے نزدیک زمین پر آپؐ کے چہرے سے زیادہ مبغوض کوئی چہرہ نہ تھا، لیکن اب یہ چہرہ تمام دنیا سے زیادہ میرے لیے محبوب بن چکا ہے۔ خدا کی قسم! آپؐ کے دین سے زیادہ مجھے اس زمین پر کوئی دین مبغوض نہ تھا، لیکن آپؐ کا دین تمام ادیان سے بڑھ کر اب میرے لیے محبوب بن چکا ہے۔ میں عمرہ ادا کرنا چاہتا ہوں[۶۹]!"

نفس غلامی اگر مابہ النزاع ہو تو غلام کا قول مدعی آقا کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ہے۔

ائمہ کا اجماع ہے کہ اگر ایک شخص کے قبضے میں عاقل بالغ غلام ہے، اور وہ دعوےٰ کرے کہ یہ میرا غلام ہے اور غلام کو اس سے انکار ہو، ایسی حالت میں قسم کے بعد غلام کا قول معتبر ہوگا۔ اور اسے آزاد خیال کیا جائے گا۔ اس جگہ اسلام کے مشہور قانون: "شہادت مدعی پر اور قسم مدعا علیہ پر ضروری ہے۔" کے مطابق یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی زاویۂ نگاہ سے غلامی ایک عارضی چیز ہے۔ اس لیے مدعی کو شہادت پیش کرنے کی تکلیف دی گئی اور مدعا علیہ کی قسم پر اکتفا کیا گیا[۷۰]!

حضرت عمرؓ کی مثال: ہلال طائی وسق رومی سے روایت کرتے ہیں کہ میں عمرؓ کا (مملوک) غلام تھا۔ انھوں نے فرمایا۔ اسلام قبول کر لے۔ اگر تو مسلمان ہو جاتے تو مسلمانوں کی امانت کے سلسلہ میں تو میرا ہاتھ بٹا سکے گا۔ کیونکہ یہ کام کسی غیر مسلم سے نہیں لیا جا سکتا لیکن میں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپؓ نے فرمایا:

"لا اکراہ فی الدین" "یعنی دین کے معاملہ میں کسی طرح کا جبر روا نہیں"!

آپؓ کا وقتِ وفات قریب آیا، تو آپ نے مجھے آزاد کر دیا، اور فرمایا: "تیرا جہاں جی چاہے، چلا جا!"[۱۷۹]

غیر مسلم غلام کی توکیل جائز ہے:

اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم ذمی کو اپنے نکاح کے سلسلے میں وکیل بنانا چاہے، تو شرع اسے رد نہیں کر سکتی، وہ ایسا کر سکتا ہے، اور ذمی کی توکیل جائز ہوگی، اس میں کوئی قباحت نہیں![۱۸۰]

حضرت عمرؓ کو احترام انسانیت کس درجہ عزیز تھا، اس کا اندازہ واقعۂ ذیل سے ہوگا:

"عمروؓ بن العاص (فاتح مصر) کے صاحبزادے نے ایک قبطی عیسائی کو مارا پیٹا۔ حضرت عمرؓ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے اس قبطی کے ہاتھ سے انہیں مجمع عام میں سزا دلوائی، پھر عمروؓ ابن العاص اور ان کے صاحبزادے سے تخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "تم نے لوگوں کو غلام کب سے بنا لیا ہے؟ حالانکہ ان کی ماں نے تو انھیں آزاد جنا تھا!"[۱۸۱]

ایک مسلمان نے عبادیوں کے ایک آدمی کو قتل کر ڈالا، حضرت عمرؓ سے فریاد کی گئی۔ آپؓ نے مسلمان کے قتل کا حکم صادر فرما دیا!

حضرت علیؓ کا فیصلہ: حضرت علیؓ کے پاس اہل حیرہ کا ایک شخص آیا، اس نے کہا: "یا امیر المومنین! ایک مسلمان نے میرے لڑکے کو قتل کر دیا اور اس کا میرے پاس ثبوت بھی ہے۔ چنانچہ اس نے گواہوں کو پیش کیا، اور انھوں نے گواہی دے دی۔ حضرت علیؓ نے ان گواہوں سے پوچھ گچھ کے بعد قاتل مسلمان کو طلب فرمایا، اور ایک تلوار حیری کے ہاتھ میں دے کر فرمایا:

"قاتل کو قتل گاہ میں لے جاؤ تاکہ یہ حیری اسے قتل کر دے!"

حیری سے لوگوں نے کہا: "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم دیت قبول کر لو، تاکہ ہم تمھارے ممنون ہوں، اور پھر دیت کی رقم سے اطمینان کی زندگی بسر کرو!"

حیری نے یہ بات مان لی، تلوار میان میں رکھی، اور حضرت علیؓ کے پاس واپس آیا۔

آپؓ نے پوچھا: "شاید تجھ کو لوگوں نے بُرا بھلا کہا، اور ڈرایا دھمکایا ہے؟"

جبری نے کہا: "نہیں خدا کی قسم نہیں! میں خوشی سے دیت لینے پر رضامند ہو گیا ہوں!"

حضرت علیؓ نے کہا: "اگر یہ بات ہے، تو تم جانو۔"

پھر مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: "ہم نے ذمیوں کو وہ حقوق دیے ہیں کہ ہمارا خون ان کے خون کی طرح اور ہماری دیت ان کی دیت کے مانند ہو جائے!"

ذمیوں کے حقوق کی ایک مختصر فہرست: "جب یہ لوگ اپنے دینی مسائل و عقائد میں باہم نزاع و اختلاف کریں تو ان سے تعرض یا ان کے شبہات کا ازالہ نہ کیا جائے۔"

: اپنے حقوق کا مقدمہ اپنے حاکم کے پاس لے جانے سے نہ روکے جائیں۔

: اگر ہمارے حاکم کے پاس مرافعہ کریں تو وہ قانون اسلامی کے ماتحت تصفیہ کرے، یا سزائے حدود کے مستوجب ہوں — تو ان پر جاری کی جائے۔

: ان میں سے جو شخص نقض عہد کرے، اسے اس کی جائے پناہ میں پہنچا دیا جائے، اس کے بعد سے وہ حربی ہو گا۔

: اہل عہد (غیر مسلم) دارالاسلام آ کر جان و مال سے محفوظ ہوں گے۔ اور چار مہینے بغیر جزیہ اور سال بھر جزیہ دے کر رہ سکتے ہیں۔ ان دونوں مدتوں کے درمیان کے متعلق اختلاف ہے۔ ذمیوں کی طرح ان کو بھی نقصان پہنچانا ممنوع ہے، مگر دوسرے حملہ آوروں کا دفاع ضروری نہیں، ذمیوں سے غیروں کا دفاع بھی ضروری ہے۔

: عاقل بالغ مسلمان کسی حربی کو امان دے تو تمام مسلمانوں پر اس کی پابندی ضروری ہے۔

: امان دینے میں عورت، مرد، غلام، حر مساوی ہیں۔

: اگر حربی اسلامی قانون سے واقف نہ ہو تو پہلے اس کی پناہ گاہ میں پہنچا دیا جائے، اس کے بعد حربی ہوگا۔

: اہل عہد اور اہل ذمہ جس وقت مسلمانوں کے خلاف جنگ کا مظاہرہ کریں تو فوراً حربی ہو جائیں گے۔

: لڑنے والوں کو قتل کیا جائے، اور باقیوں کا قصہ ان کے انکار اور رضامندی پر موقوف رکھا جائے، ذمی جزیہ دینا چھوڑ دیں تو یہ نقضِ عہد ہے۔

امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک اس صورت میں دار الحرب جانے سے پیشتر نقضِ عہد نہیں ہے۔ دیون کی طرح جبراً وصول کیا جائے۔

ذمی نقضِ عہد کے بعد جب تک قتال نہ کریں ان کو قتل کرنا، مال لوٹنا، ان کے اہل و عیال کو گرفتار کرنا مباح نہیں۔ اس سے قبل ضروری ہے کہ ان کو امن کے ساتھ دار الاسلام سے نکال کر دار الحرب کے قریب ترین مقام میں بھیج دیا جائے۔ اگر وہ خود نہ جائیں تو جبراً نکالا جائے[۱]

دوسرے اکابر بھی اسی طرف گئے ہیں:

دو جزیہ دینے سے انکار کرنا، یا کسی مسلمان کی خطا کرنا، یا کسی جرم کا ارتکاب کرنا بشرطیکہ وہ شخصی ہو، اجتماعی نہ ہو، نقضِ عہد کو مستوجب نہیں ہوتا۔ یہ پابندیاں جو مسلمان پر عائد کی گئی ہیں وہ اس اصول پر مبنی ہیں کہ اگر ذمی سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جس کی تاویل ہو سکتی ہو، یا محتمل شک ہو۔ اس سے "ذمہ" کا معاہدہ نہیں ٹوٹتا، بلکہ وہ بدستور عائد رہتا ہے۔

کیا یہ رواداری اور وسعتِ قلب و ظرف کی انتہا نہیں ہے؟

شام کے شہر حمص کے ذمیوں کی داستان: "امام ابو یوسف رح کہتے

ہیں کہ جب ذمیوں کو مسلمانوں کے پاسِ وفا اور حسنِ سیرت کا خوب اچھی طرح تجربہ ہو گیا تو یہی کافر مسلمانوں کے دشمن کے کٹر دشمن اور مسلمانوں کے دوست کے بہترین دوست بن گئے۔

دشمنوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مدد کرنے لگے، ان تمام غیر مسلم شہروں کے لوگوں میں سے جن سے مسلمانوں کی صلح تھی، کچھ لوگ چھانٹ چھانٹ کر جاسوس بنا کر روم بھیجے گئے کہ وہ معلوم کر کے بتائیں، وہاں کیا تیاریاں ہو رہی ہیں، وہ لوٹ کر آئے اور انھوں نے بتایا کہ رومیوں نے اتنا بڑا لشکر جمع کر لیا ہے، کہ اس سے پہلے کبھی جمع نہیں کیا ہوگا۔

جب یہ خبریں کثرت اور تواتر سے ابو عبیدہؓ کو پہنچنے لگیں تو وہ اور عام مسلمان چوکنے ہو گئے، اور ابو عبیدہؓ نے ان تمام ممالک کے گورنروں کو جنھیں وہ صلح کر کے پیچھے چھوڑ آئے تھے، لکھا کہ انھوں نے غیر مسلموں سے جو فدیہ اور خراج وصول کیا ہے، واپس کر دیں اور ان سے کہہ دیں کہ تمھارا مال ہم تم کو واپس کرتے ہیں کیونکہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ہمارے مقابلے کے لیے بہت بڑا لشکر تیار ہے، اور ہماری شرط یہ تھی کہ ہم تمھاری حفاظت کریں گے، اور حفاظت اس وقت ہم کر نہیں سکتے۔ لہٰذا ہم نے تم سے جو کچھ لیا تھا وہ واپس کرتے ہیں البتہ اگر خدا نے ہماری مدد کی اور ہمیں فتح حاصل ہوئی تو جو شرائط ہمارے تمھارے درمیان طے پائے ہیں، ہم ان پر ضرور عمل کریں گے،!

جب گورنروں نے ذمیوں سے یہ کہا، اور ان کا مال واپس کیا تو ذمیوں نے کہا: "خدا تمھیں ہمارے درمیان جلد واپس لائے، اور تمھاری مدد کرے، اگر آج تمھارے بجائے ہمارے ہم مذہب ہوتے تو نہ صرف یہ کہ وہ یہ رقم واپس نہ کرتے بلکہ ہمارے پاس اس کے علاوہ جو کچھ ہوتا، چھین لیتے!"

پھر جب روم کو شکست ہوئی اور مسلمانوں کو خداوند کریم نے فتح و نصرت عطا فرمائی، تو حضرت ابو عبیدہؓ نے عمر رضؓ بن خطاب کو اس واقعہ کی اطلاع دی، حضرت

عمرؓ نے انھیں تحریر فرمایا: "میں مسلمانوں کو تلقین کرتا ہوں کہ وہ ذمیوں پر ظلم نہ کریں، انھیں تکلیف نہ پہنچائیں، بغیر حق کے ان کا مال نہ کھائیں، تم نے ان سے جو شرطیں کی ہیں انھیں پورا کرو، اور جو کچھ ان سے عہد کیا ہے اسے اچھی طرح نبھاؤ[۱۷۱]"

جزیہ، اس کی مقدار اور مستثنیات: جزیہ وہ ٹیکس تھا جو اہل ذمہ یعنی یہود و نصاریٰ سے وصول کیا جاتا تھا جو سالانہ لیا جاتا تھا لیکن صرف اس شخص سے جو جزیہ ادا کرنے کی مالی اعتبار سے سکت رکھتا ہو۔ جزیہ صرف ان لوگوں سے وصول کیا جاتا تھا جو برسرِ روزگار اور برسرِ کار ہوں[۱۷۲]

ناداروں اور پریشان حالوں سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا، نہ عورتوں، بچوں، غلاموں اور راہبوں سے لیا جاتا تھا۔ جزیہ کی شرط یہ تھی کہ جس سے لیا جائے وہ عاقل ہو، بالغ ہو، آزاد ہو[۱۷۵]

جزیہ قبولِ اسلام کے بعد ساقط ہو جاتا تھا۔[۱۷۶]

جزیہ کی رقم ان سے حفاظت، جان و مال کے لیے لی جاتی تھی۔ کیونکہ ان سے فوجی خدمت نہیں لی جاتی تھی، اور جو فوجی خدمات انجام دیتے تھے، ان پر سے جزیہ ساقط ہو جاتا تھا۔

ماوردی نے بھی جزیہ کی اس طرح تصریح کی ہے۔ جزیہ صرف عاقل مردوں پر واجب ہے۔ عورت، بچے، مجنون، غلام سے نہ لیا جائے وہ تابع اور اولاد کے حکم میں ہوتے ہیں۔

اگر کوئی عورت اپنے شوہر یا رشتہ دار سے الگ ہو تو اس سے جزیہ نہ لیا جائے گا۔ اس صورت میں اپنی قوم کے مردوں کی اگرچہ وہ رشتہ دار نہ ہوں، تابع ہو گی۔ اگر کوئی عورت دار الحرب کو چھوڑ کر دار الاسلام میں رہنے لگے اور یہاں رہنے کی وجہ سے وہ جزیہ دینا چاہے تو یہ اس پر واجب نہ ہو گا اس کی طرف سے ہدیہ سمجھا جائے گا۔

جزیہ دینا چھوڑ دے تو مجبور نہ کیا جائے، اس صورت میں اگرچہ اپنی قوم کے تابع نہیں ہے، مگر اس کی حفاظت کی ذمہ داری کی جائے گی۔

جزیہ کی مقدار میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ ابو حنیفہؒ تین قسم کے آدمی قرار دے کر کہتے ہیں کہ دولت مندوں سے اڑتالیس درہم سالانہ متوسط طبقے سے چوبیس درہم سالانہ، اور فقیروں سے بارہ درہم سالانہ لیے جاتے ہیں۔ امام موصوف کے نزدیک اس میں کمی بیشی نہ ہوگی۔ نہ اجتہاد عالم کو دخل ہوگا۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ کمی بیشی معین نہیں۔ امام کے اجتہاد پر ہے[۱۰]

غیر مسلم رعایا کے ساتھ رواداری: اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ کم وبیش ہر زمانے میں انتہائی رواداری اور رحمت کا برتاؤ کیا گیا:

یعقوب بن کلس یہودی تھا۔ بغداد میں پیدا ہوا اور وہیں پروان چڑھا، پھر اپنے باپ کے ساتھ شام آیا۔ وہاں سے اس کے باپ نے اس کو ۳۳۱ھ میں مصر بھیج دیا۔ یہ اخشید، موسس، دولت اخشیدیہ کا دور تھا، اخشید کی وفات کے بعد اس کا تعلق کافور اخشیدی کے ساتھ قائم ہوگیا، جو مصر کا خودسر فرماں روا بن گیا تھا کافور نے اپنے محل کی تعمیر کا کام اس کے سپرد کر دیا، اور پھر اس کی نجابت و نزاہت کو دیکھ کر اسے اپنے دیوان خاص کے عملہ میں شامل کر لیا۔ کافور کی نگاہوں میں اس کی قدر و منزلت بڑھتی گئی، اور ایک دن وہ آیا جب کافور نے افسران دفاتر کے نام حکم جاری کیا کہ خزانہ سے کوئی رقم ابن کلس کے دستخط کے بغیر خرچ نہ کی جائے۔ مصر میں دولت اخشیدیہ کے آخری عہد میں یعقوب بن کلس حلقۂ اسلام میں داخل ہوگیا۔

غیر مسلموں کی زبان عدالتی زبان بھی تھی:

عہد اموی میں قاضیوں کے اجتہاد و آزادی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ٹھیک اس وقت جب کہ وہ کرسی عدالت پر ہوتے تھے انھیں گواہوں کی شہادت ان کی مادری زبان میں سننے میں کوئی تامل نہ ہوتا تھا، چنانچہ مصر کے قاضی خیر بن نعیم

خضری (۱۲۰ - ۱۲۷) قبطیوں کی گواہی انہی کی زبان میں سنا کرتے تھے۔[۸۱]

مسجد میں عیسائیوں کی عبادت:

ابن اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد حاضر ہوا۔ مجھے محمد بن جعفر بن وزبیر نے بتایا کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں نجران کا وفد آیا تو یہ لوگ عرصہ کے بعد مسجد میں آپ کے سامنے حاضر ہوئے، اور مسجد میں اپنی نماز ادا کرنے لگے۔ لوگوں نے انھیں منع کرنا چاہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار! انھیں مت ٹوکو! چنانچہ انھوں نے مشرق کی طرف رُخ کیا اور اپنی مخصوص عبادت کی۔[۸۲]

مجوسیوں کے ساتھ اہلِ کتاب کا سا برتاؤ: مجوسیوں کے بارہ میں علمائے کرام کا متفقہ فتویٰ ہے کہ یہ اہلِ کتاب نہیں اور مسلمان مرد کو صرف کتابیہ عورت سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے لیکن خلافتِ راشدہ کے دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خیال کے پیشِ نظر مجوسیوں کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا، جو اہلِ کتاب کے ساتھ جاری تھا لیکن ان سے جزیہ لیا گیا، اور ان کے ساتھ اہلِ کتاب کا سا سلوک کیا گیا، اور پھر ان کی عورتوں سے مسلمان مردوں کا نکاح بھی جائز ہوا۔ چنانچہ بعض ائمہ کا فتویٰ ہے کہ مجوسی عورتوں کے ساتھ نکاح جائز ہے۔

امام شافعیؒ کا قول مجوسی عورتوں سے جواز نکاح کی تائید میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ ان کا ذبیحہ جائز ہے لہٰذا ان کی عورتوں سے نکاح بھی ہو سکتا ہے۔[۸۳]

صفوان بن اُمیہ قریش کا بہت بڑا سردار تھا۔ فتح مکہ کے بعد اسے اپنا اعمال نامہ یاد آیا۔ ہر ہر جرم موت کا آئینہ دار تھا۔ ٹھہر نہ سکا، جدہ بھاگ گیا کہ جان بچالے۔ آپؐ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، امان کی علامت کے طور پہ آپؐ نے

اپنا عمامہ عمیرؓ کو مرحمت فرمایا کہ وہ جائیں اور اس کو لے آئیں۔ جس نے اسلام کے قلع قمع کرنے میں واعئ اسلام کو ایذائیں پہنچانے میں مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔

عمیرؓ گئے اور روٹھے ہوئے دشمن کو منالائے جو خوف و ہراس کے باعث لرزاں و ترساں گیا تھا، وہ وفورِ نشاط و مسرت سے تبسّم کناں اور غنچہ دہاں واپس آگیا۔[۸۴]

حضرت عمرؓ نے عیسائیوں کے اصرار کے باوجود قیامِ شام کے دوران کلیسا میں اس خیال سے نماز پڑھنے سے انکار کر دیا کہ کہیں مسلمان اسے مثال نہ بنالیں۔[۸۵]

غیر مسلموں سے تعلقات کی بنیاد امن نہ کہ جنگ : نظر صحیح ان لوگوں کی تائید کرتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں مسلمانوں اور نامسلموں کے درمیان تعلق کی بنیاد مسالمت اور امان قرار دی ہے، نہ کہ حرب و قتال! سوا اس صورت کے مسلمان فتنہ میں مبتلا کر دیے گئے ہوں، ان کے دین کے معاملہ میں روکاوٹیں ڈالی جارہی ہوں۔ ان کی دعوتِ اسلام کا دروازہ بند کر دیا گیا ہو۔ اس صورت میں مسلمانوں پر بلاشبہ جہاد فرض ہے کہ وہ شر کو رفع کر دیں، اور دعوت و تبلیغ کا راستہ کھول دیں۔

قرآن میں آیا ہے:

لاینھکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین ○ انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم	دین کے معاملے میں جو "غیر مسلم" تم سے مقاتلہ نہ کریں اور تمھیں جلاوطن کرنے کی سعی نہ کریں، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے اور ان کے ساتھ انصاف سے منع نہیں کرتا، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے البتہ خدا ان لوگوں سے دوستی رکھنے کو منع کرتا ہے جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں مقاتلہ کیا۔

ومن یتولھم فاولٰئک ھم الظّٰلمون ○ اور تمھیں جلاوطن کرنے کی کوشش کی، ایسے لوگوں سے (تم میں سے) جو دوستی کرے گا وہ ظالموں میں سے ہوگا۔"

اسلام دین میں اکراہ کو پسند نہیں کرتا، وہ اسے کبھی پسند نہیں کرتا کہ لوگوں کو خلاف مرضی دین اسلام میں داخل کر لیا جائے، اور پھر یہ ممکن بھی کس طرح ہے کہ جبر و جور سے ایمان پیدا ہو جائے اور تلوار کی نوک دل تک بھی پہنچ جائے۔

دعوتِ اسلام، دعوتِ توحید، اور دعوتِ اخلاص کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے دلیل و حجت نہ کہ تلوار و خنجر، چنانچہ اسلام کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ جب کبھی غیر مسلموں نے فتنہ و شر سے علیحدگی اختیار کیے رکھی، اور مسلمانوں کو دعوتِ اسلام میں آزاد چھوڑا تو مسلمانوں نے کبھی تلوار نہیں اٹھائی اور کبھی اعلانِ جنگ نہیں کیا۔

پروفیسر کرد علی کا بیان ہے: "اس میں کوئی شک نہیں کہ امویوں کا نظم و نسق نقائص سے پاک نہ تھا۔ لیکن اس میں اصلی نقص یزید بن ولید کے زمانے میں پیدا ہوا، یہ اپنے اعمال و کردار میں اپنے اسلاف کی راہ سے ہٹا ہوا تھا، ان ان کے آخری فرماں روا کو باوجود اس کی رفعت، ہمت، شدتِ جرأت کے خائنت کی رافعت میں برابر مصروف رہنا پڑا، اور خلفشار و انتشار اتنا بڑھا کہ مملکت کا شیرازہ بکھر گیا، امویوں کی حکومت کے اختیارات معزز و شریف خاندان کے افراد کو ملا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بنی امیہ کے اقتدار کے زوال کے اہم اسباب میں خبروں کا ان سے چھپایا جانا۔ سپہ سالارانِ دولت کو برافروختہ رکھنا، اور خود خاندانِ اموی کے اراکین میں ولایت عہد کے بارے میں پھوٹ اور نفاق کا پیدا ہو جانا تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ فوج کی تنخواہ کی ادائیگی میں لیت و لعل سے کام لیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان کے خلاف عباسیوں کی مدد کی۔

علماء قانون کا اس پر اتفاق ہے کہ قوتِ حاکمہ اور امتِ محکومہ کے درمیان جو اقتدار و اختیار کا علاقہ ہو وہ محدود ہو تاکہ حاکم کے داب اور محکوم کی حریت میں ہم آہنگی رہے۔ ان تعلقات کے اختلاف سے حکومت کی شکل و وضع بدل جاتی ہے۔ اور وہ یا تو دستوری حکومت میں منتقل ہو جاتی ہے یا استبداد کی حکومت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے[۸۶]

ماخذ:

۱ نہج البلاغۃ۔ طبع مصر، ص ۱۷۱، ۳ ، ۲ سراج الملوک (طرطوشی) طبع مصر، ص ۷۵
۳ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۴، ص ۴۴! ۴ کتاب الخراج (ابو یوسفؒ) ص ۸۸۔
۵ حسن المحاضرہ (امام سیوطی) ج ۱، ص ۶۳۔
۶ المقریزی، ج ۱، ص ۱۸۴ ۷ الکامل (ابن اثیر) ج ۲، ص ۴۱۸۔
۸ السیاستہ الشرعیہ (علامہ خلاف) طبع مصر، ص ۳۲ ۳۳۔
۹ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۴، ص ۱۴۵، ۱۰ کتاب الخراج (امام ابو یوسفؒ) ص ۱۰۰
۱۱ طبری، ص ۲۸۱۵ ، ۱۲ الاحکام السلطانیہ (سیوطی) ص ۲۷۱، ۲۷۲۔
۱۳ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۳۷۶، ۳۷۷۔
۱۴ The Khalaphate P 37.38 ۱۵ طبری ص ۲۸، ۲۹۔
۱۶ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۳۸۰، ۳۸۵، ۳۸۸، ۳۹۰
۳۹۵، ۳۹۷، ۴۱۲۔
۱۷ Von kremer orink under the caliphs
.P. 356.
۱۸ تاریخ التمدن الاسلامی (جرجی زیدان) طبع مصر، ج ۱، ص ۲۲۱۔
۱۹ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳)

۲۰ طبری ج ۱، ص ۲۸۶۴ ۲۱ طبری ج ۲، ص ۲۰۲

۲۲ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۴۶۲ – ۴۶۴)

۲۳ ترمذی میں اور دیگر کتب سنن میں یہ حدیث وارد ہوئی ہے۔

۲۴ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، عن ابن عباس۔

۲۵ ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، نیز مستدرک حاکم، ج ۳، ص ۱۰۲، نیز زاد المعاد (ابن قیم) طبع مصر، ج ۳، ص ۳۳، ۳۴۔

۲۶ السیاستہ الشرعیہ (علامہ خلاف) طبع مصر، ص ۲۷۵، ۲۷۶۔

۲۷ A short story of fatimid khalaphate

۲۸ العاظ الخنفاء ص ۸۷ ۲۹ الاحکام السلطانیہ، (ماوردی) ص ۲۲۷۔

۳۰ مقدمہ ابن خلدون ص ۲۲۵: ۲۲۶، ۲۳۰ –

۳۱ تاریخ دولت فاطمیہ ص ۴۹۶،

۳۲ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۱۳۰، ۱۲۳۔ ۳۳ الطبری ج ۳، ص ۴۰۸

۳۴ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۸۶، ۸۷ –

۳۵ الطبری، ج ۳، ص ۴۰۷ –

۳۶ صرف طبری ہی میں نہیں، دوسری متداول تاریخوں میں بھی یہ بیان موجود ہے۔

۳۷ نہج البلاغۃ، طبع مصر، ص ۵۴۲، ۳۸ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۱۵

۳۹ صحیح بخاری کتاب المغازی، عن ابی ہریرہؓ، نیز زاد المعاد (ابن قیمؒ) ج ۲ – ص ۲۱۳، ۲۱۴ – ۴۰ ہدایہ ج ۲، ص ۴۱۲

۴۱ صحیح بخاری، باب الکسوۃ للاساریٰ عن جابرؓ

۴۲ سورۃ بقرہ، رکوع آیت ۴۳ صحیح بخاری کتاب الجزیہ عن عبد اللہ بن عمرؓ۔

۴۴ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۲، ص ۳۱۸، ۳۱۹، طبع مصر۔

۴۵ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۲۰۱، ۴۶ سورۃ انفال، آیت ۷۲

۴۷ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۲۹۷ –

۴۸ زاد المعاد (ابن القیم) ج ۱، ص ۴۱۳
۴۹ السیاستہ الشرعیۃ (علامہ خلاف) طبع مصر، ص ۱۹۴، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱۔
۵۰ سنن ابی داؤد، اور دوسری کتب سنن میں یہ حدیث روایت کی گئی ہے۔!
۵۱ الطبری، ج ۴، ص ۳۱۲ ۵۲ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۷۷، ۹۱۔
۵۳ سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۰
۵۴ سنن ابی داؤد اور دوسری کتب سنن میں یہ حدیث طرق کے ساتھ مروی ہے۔
۵۵ صحیح مسلم اور دوسری کتب سنن ومسانید میں یہ بھی طرق کے تعدد کے ساتھ روایت کی گئی ہے ۵۶ سورۂ محمدؐ، پ ۲۶، رکوع ۴، آیت ۳۶
۵۷ سورۂ نساء، پارہ ۴، رکوع ۱۲، آیت ۹۰۔
۵۸ زاد المعاد (ابن القیم) ج ۳، ص ۵۱۷۔
۵۹ سورۂ محمدؐ، پارہ ۲۶، رکوع ۶، آیت ۵۸
۶۰ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۲، ص ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵ – ۲۹۶، ۲۹۷۔
۶۱ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۱۸۳
۶۲ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۶۱۰، ۶۱۱
۶۳ عینی، شرح بخاری، طبع مصر، ج ۱۳، ص ۲۷۔
۶۴ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) طبع مصر، ص ۶۲۰
۶۵ The legacy of Islam P. 11 & 12
۶۶ Preaching of Islam p. 146
۶۷ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۲، ص ۸۲، ۹۶، ۹۷، ۱۴۸،
۶۸ صحیح بخاری، کتاب الایمان عن ابی ذر غفاری رضؓ۔
۶۹ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۲، ص ۲۱۳
۷۰ محمدۃ الفقہیہ (ابن قدامہ) طبع مصر، ص ۱۴۵

۷۱ احکام القرآن (جصاص) طبع مصر، ج ۲، ص ۴۴ -
۷۲ مختصر الفتاویٰ (ابن تیمیہ) طبع مصر ۴۲۹ -
۷۳ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۱۱ ۷۴ احکام القرآن ج ۲ (جصاص)، ص ۱۲۵
۷۵ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۲۱۲، ۲۱۳ -
۷۶ السیاستہ الشرعیہ (علامہ خلاف) طبع مصر، ص ۲۴۱، ۲۴۲ -
۷۷ المقریزی، الخطط، طبع بولاق، ج ۱، ص ۸۲ -
۷۸ الفاطمیون (الاستاذ الیوبی) طبع مصر، ج ۲، ص ۱۴۸، ۱۴۹ -
۷۹ مقدسی کا بیان کہ چوتھی صدی ہجری میں قاہرہ کے اندر سات لاکھ اور اسکندریہ میں تین لاکھ یہودی اقامت گزین تھے -
۸۰ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۲۱۰ -
۸۱ النظم الاسلامیہ (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، طبع مصر، ص ۳۰۶، ۵۷۵ -
۸۲ زاد المعاد (ابن قیم) ج ۳، ص ۱۲۰ -
۸۳ مختصر الفتاویٰ المصریہ (ابن تیمیہ) طبع مصر - ص ۲۲۷
۸۴ اسلام اور رواداری، ج ۱، ص ۴۱۳ -
۸۵ فتوح البلدان (بلاذری) ص ۱۲۷ -
۸۶ السیاستہ الشرعیہ (علامہ خلاف) طبع مصر، ص ۴۷، ۱۷۶، ۵۵، ۵۶، ۸۴ -

(۱۴)

اسلامی سوشلزم یا اسلامزم؟

۱۹۱۴ء کی پہلی عالمگیر جنگ نتیجہ تھی عالمگیر معاشی بحران کا۔ سرمایہ دار اور سرمایہ کار بادشاہت کر رہے تھے۔ ملوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے نگاہِ حسرت سے ان کی طرف دیکھتے تھے، اور پکار اُٹھتے تھے ؎

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!

اس معاشی بحران نے، سیاسی بحران پیدا کر دیا ہے، یعنی جتنا جتنا محکوم اور زیردست اپنے حالات کو سازگار بنانے کے لیے اُبھرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی شدت اور جوش و خروش کے ساتھ قیصریت اور شہنشاہیت کی قوتیں انھیں پامال کرنے، کچلنے اور دبانے کے لیے آگے بڑھتی تھیں۔ خفیہ اور اعلانیہ جنگ کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ حاکم اور محکوم، مزدور اور سرمایہ کار، غلام اور آقا کے مابین جاری تھا۔

اس جنگ کے اختتام کا "معجل" ردِّ عمل وہ تھا، جو فوراً روس کے اندر اشتراکیت کی صورت میں رونما ہوا، اور "موجل" ردِّ عمل وہ تھا جو ہٹلر کی صورت میں ساری دنیا کے لیے بالخصوص یورپ اور یہودیوں کے لیے "شامتِ اعمال کا طوفان بن کر نمودار ہوا۔ اور جس نے ساری دنیا کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔

اس کتاب کا موضوع سیاسیاتِ عالم نہیں ہے۔ لہٰذا پہلی جنگِ عظیم کے "موجل" ردِّ عمل پر بحث و گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن "معجل" ردِّ عمل کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ اس کے باعث دنیا ایک نئے تجربے سے روشناس

ہوئی، جو اشتراکیت کی صورت میں آج دنیا کی دو تہائی سے زیادہ آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔

اشتراکیت اور اشتمالیت: اشتراکیت (کمیونزم) یا اشتمالیت (سوشلزم) میں صرف الفاظ کا فرق ہے، ورنہ حقیقتاً دونوں ایک ہی ہیں اور اگر فرق ہے بھی تو بہت معمولی ہے۔

اشتراکیت، ابطال ملکیت کی علمبردار تھی، ("ہے" میں نے اس لیے نہیں کہا کہ اب اس میں لچک پیدا ہو چلی ہے) اور اشتمالیت (سوشلزم) اور خاص طور پر ہٹلر کی ایجاد کردہ "قومی اشتمالیت" (نیشنل سوشلزم) کا مقصد ان جملہ وسائل کو قومیا لینا تھا جو عوام کی ضروریات زندگی سے متعلق ہوں۔

یہ دونوں تحریکیں خوب پھلیں پھولیں، اور نہ صرف یہ کہ مائل بہ انحطاط نہیں ہیں بلکہ ان کی جاذبیت میں برابر اضافہ ہی ہو رہا ہے، ایسے ملک بہت کم ہیں، جہاں "انقلاب" آیا ہو، اور فوراً ہی اشتراکیت یا اشتمالیت نے سکۂ رائج الوقت کی حیثیت نہ اختیار کر لی ہو۔

۱۹۱۴ء سے پہلے یہ دونوں الفاظ صرف ایک دلچسپ اصطلاح کی حیثیت رکھتے تھے اور اب ایک بہت بڑا فلسفۂ انقلاب اور فلسفۂ حیات بن چکے ہیں۔

یورپ اور ایشیا اور افریقہ بلکہ امریکہ تک میں ان کے قدم جم چکے ہیں، اور روس کا پورا ملک چین کی ۷۵ کروڑ آبادی، افریقہ کی کئی ریاستیں، یورپ میں مشرقی جرمنی، اور سابق بلقان کی ریاستیں پولینڈ، البانیہ اور کئی دیگر ممالک، تمام کے تمام یہ مذہب اختیار کر چکے ہیں۔ ویت نام کی جنگ اسی سیل سبک سیر و زمیں گیر کو روکنے کے لیے لڑی جا رہی ہے، حد یہ ہے کہ لاطینی امریکہ کی کئی ریاستوں تک، اس طوفان بلاخیز کی صدائے بازگشت سنی جا رہی ہے، اقبال آج زندہ ہوتے تو ایک مرتبہ پھر کہتے ؎

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

پس ماندہ، مفلوک الحال اور غریب ممالک نے، اشتراکیت اور اشتمالیت کا

کا چرچا سنا تو وہ بھی اس کی آرزو اور تمنا کرنے لگے، اور یہ انسان کی فطرت بھی ہے کہ نامساعد حالات میں جب گھر جاتا ہے تو ایک انقلاب کی توقع کرنے لگتا ہے کہ شاید اس طرح حالات اگر پورے طور پر نہ سہی، کسی حد تک سہی رو براہ ہو جائیں۔ چنانچہ معاشی اعتبار سے فرومایہ ممالک میں بھی اس تحریک کی مقبولیت کم از کم ذہنی طور پر بڑھتی جا رہی ہے۔

اس طوفان کو روکنے کے لیے بعض سیاسی رہنماؤں اور مدبروں نے "اسلامی سوشلزم" کا پرچار شروع کیا ہے، اشتراکیت اور اشتمالیت میں پہلی زد مذہب پر پڑتی ہے اور اسے رخصت کر دیا جاتا ہے۔ اسلامی سوشلزم کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کو قائم رکھتے ہوئے یہ فلسفۂ حیات جتنا زیادہ سے زیادہ اپنایا جا سکتا ہے، اپنا لیا جائے۔

اسلامی سوشلزم: جو لوگ اسلامی سوشلزم کے علم بردار ہیں، ان کی دیانت فکر سے انکار مقصود نہیں، لیکن سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ اسلام میں مصالح عمومی، اور مفاد عمومی اور مساوات بین الناس کا جتنا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ وہ اگر پورے طور پر ذہن میں ہو تو ماننا پڑے گا، اسلام کو ان تحریکوں سے کچھ نہیں لینا ہے، بلکہ یہ تحریکیں، اسلام کے پیش کردہ اور ایک عرصے تک عمل میں لائے ہوئے فلسفۂ حیات کی ناتمام اور بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔

اسلام ازم ہی اصل الاصول ہے: اگر اسلام سے پوری واقفیت ہے تو پھر "اسلامزم" ہی کا نعرہ ہونا چاہیئے، کمیونزم یا سوشلزم کو ایک روز خود اسلام کے آستانے پر سر جھکانا پڑے گا۔ کیونکہ ان تحریکوں میں بشری کمزوریاں موجود ہیں، اور اسلام چونکہ ایک خدائی مذہب ہے۔ اس لیے وہ ہر طرح کی کمزوریوں سے بری ہے۔ ان تحریکوں میں نفی زیادہ ہے اثبات کم ہے انکار کی افراط ہے۔ اقرار نایاب ہے۔ مضرت رساں انتہا پسندی کی کثرت ہے، فائدہ بخش اعتدال و توسط نایاب ہے۔ اپنی بات، اپنا عقیدہ، اپنا مسلک اور

اپنی فکر منوانے کے لیے چمکتی ہوئی تلوار موجود ہے: "لا اکراہ فی الدین" کی بشارت نہیں، اور جو چیز جبر و جور کے ذریعہ پیدا کی جائے، وہ اپنے واقعی اور حقیقی محاسن سے بھی رفتہ رفتہ محروم ہو جاتی ہے۔

اسلام ازم کے خصائص: اسلام نے ملکیت قائم رکھی ہے، لیکن اسے محدود کر دیا ہے۔ اس نے نفع اندوزی کی ممانعت نہیں کی ہے۔ لیکن گراں فروشی چور بازاری، اسمگلنگ اور ذخیرہ اندوزی کا دروازہ بند کر دیا ہے، اس نے منقولہ اور غیر منقولہ جائداد پر مالکانہ حق تسلیم کیا ہے لیکن اپنے قوانین وراثت کے ذریعہ کسی کے لیے بھی فورڈ یا راک فیلر بننے کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے، اس نے تجارت لین دین اور منافع کی عام اجازت دے دی ہے، لیکن سود (ربٰو) کو حرام قرار دے دیا ہے اور اسی طرح وقت کے شائلاکوں کے ابھرنے کے مواقع ختم کر دیے ہیں، اس نے ایک ایسے سماج، ایک ایسے معاشرے، ایک ایسے نظامِ حیات اور ایک ایسے طرزِ زندگی کی تخلیق و تشکیل کی ہے جس میں کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا، کوئی کسی کی جیب نہیں کاٹ سکتا، کوئی کسی کے ساتھ سماجی ناانصافی نہیں کر سکتا، کوئی کسی کے حقوق پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتا۔ کوئی کسی کی محنت سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ کوئی صرف اپنے سرمایہ اور دولت کے بل پر دادِ عیش و عشرت نہیں دے سکتا، کیا اس کے بعد بھی اشتراکیت یا اشتمالیت کی ضرورت ہے کہ ایک غلط اصطلاح "اسلامی سوشلزم" کے نام سے وضع کی جائے؟ بقول شیکسپیئر کے، الفاظ میں کیا رکھا ہے۔ گلاب کو جس نام سے بھی پکارا جائے وہ گلاب ہی رہے گا۔ لہٰذا اگر "اسلامی سوشلزم" کا لفظ محض "اسلامی" کے بجائے کسی کو بھاتا ہے تو چنداں تعرض کی ضرورت نہیں لیکن اسلام کے ساتھ سوشلزم کا دم چھلا لگا دینے سے ایک طرح کی معذرتی ذہنیت ابھرتی ہے، ایک قسم کی مرعوبیت جھلکتی ہے، اور یہ بات کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتی۔ اس لیے اس جدت سے احتراز اور اجتناب ہی اولیٰ ہے۔

احسن ہے۔ لیکن اگر تسلی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ یہ اصطلاح استعمال کی جائے تو اوراق ذیل سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اسلام سے بڑا، سچا، کھرا، حد درجہ غیر مضر اور حد درجہ نافع سوشلسٹ کوئی نہیں ہے۔

اسلامزم کا سربراہ مملکت: کتاب و سنت سے قدم قدم پر جس چیز کی طرف رہنمائی ہوتی ہے، وہ بھی "سوشلزم" ہے، اور یہ ایسا سوشلزم ہے جس کا سربراہ کسی کریملن میں نہیں رہ سکتا، نہ شراب پی سکتا ہے، نہ رقص کر سکتا ہے، نہ اپنی ذاتی صوابدید پر بے تحاشا خرچ کر سکتا ہے۔ نہ عیش و عشرت اور تنعم کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ نہ عام افرادِ امت سے اچھا کھا سکتا ہے، نہ اچھا پہن سکتا ہے۔ اسے راتوں کو اٹھ کر، بے نواؤں اور تباہ حالوں کی خبر گیری اور دستگیری کرنا پڑتی ہے۔ اسے "پارٹی" کے اندر نہیں، صحن مسجد میں بر سرِ عام نکتہ چینی کا مقابلہ کرنا اور بیان صفائی دینا پڑتا ہے۔ نہ یہ کسی ٹیکس سے محفوظ، نہ کسی خصوصی رعایت سے بہرہ ور سفر کرنا ہو تو اپنی سواری پر جائے گا، گھر میں رہے گا تو اپنا کام کاج خود کرے گا مسند امارت پر بیٹھنے کے بعد اس کی کوئی چیز بھی پرائیویٹ نہیں رہ جاتی، ہر چیز پبلک بن جاتی ہے۔ حد یہ ہے کہ اپنی اولاد تک کے لیے جائز منفعت کے دروازے اسے بند کر لینا پڑتے ہیں حالانکہ دوسرے افرادامت کے لیے کھلے ہوتے ہیں۔ اس سے کوئی جرم ہو گا، تو قاضی کی عدالت میں اصالتاً حاضر ہو کر جواب دہی کرنی پڑے گی، قاضی کی عدالت میں نہ اس کے لیے کرسی خالی کی جائے گی، نہ اسے فریق مقابل پر ترجیح دی جائے گی، اور اگر قاضی اس کے خلاف فیصلہ صادر کر دے گا تو بے چون وچرا اسے مان لینا پڑے گا۔ یہ دن کو امور مملکت انجام دے گا، اور رات کو مصلی بچھا کر خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت کرے گا۔ اپنے کردہ اور نا کردہ گناہوں کے لیے بارگاہِ الٰہی میں معافی مانگے گا اور روئے گا، اور روتے روتے اس کی داڑھی آنسوؤں

سے تر ہو جائے گی۔ پھر بھی اپنے کو خطا کار تصوّر کرتا رہے گا، اور آخرت کی جواب دہی سے ڈرتا رہے گا۔ شمع کی روشنی میں سرکاری کام کرنے بیٹھے گا، اس اثنا میں کوئی شخص آ جائے اور ذاتی باتیں چھڑ جائیں تو شمع بجھا دے گا، کہ سرکاری چیز ذاتی استعمال میں کیوں آئے؟ بیمار پڑے گا، طبیب شہد تجویز کریں گے تو بغیر اذن بیت المال کا شہد بھی استعمال نہیں کرے گا، اور جب اس خاکدانِ عالم سے کنارہ کش ہونے کا وقت آئے گا تو وصیت کر جائے گا کہ عہدِ امارت میں اپنے آذوقے اور پوشش کے لیے میں نے جتنی رقم لی ہے وہ میری فلاں جائداد فروخت کر کے بیت المال کو واپس کر دی جائے، اور پھر بھی ڈرتا اور روتا رہے گا کہ کاش بے حساب کتاب نجات ہو جائے۔ سچا سوشلزم یہ ہے یا وہ؟

دنیا کی اصل آبادی کسانوں اور کاشتکاروں پر مشتمل ہے، یہ کھیت جوتتے ہیں، غلّہ اگاتے ہیں، پسینہ بہاتے ہیں، دن رات ایک کرتے ہیں۔ تب خوشۂ گندم پیدا کرتے ہیں، لیکن اس محنت کا صلہ انھیں کیا ملتا ہے؟ ــــ صرف فقر و فاقہ!

محدود حقِ ملکیت و سبیع تر مراعات: اشتراکیت نے اسی چیز کو مدارِ فکر بنا کر قدم آگے بڑھائے اور زمین کا حقِ ملکیت سوخت کر لیا۔ مطلق طور پر زمین کا حقِ ملکیت سوخت کرنے سے جو مفاسد پیدا ہوئے۔ ان کا ذکر یوئی فشر نے اپنی کتاب "اسٹالن" میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اسلام نے حقِ ملکیت تو سوخت نہیں کیا ہے، لیکن اس حق کے استعمال کو اتنا دشوار کر دیا ہے، اور کاشتکاروں کو اتنی سہولتیں دے دی ہیں کہ پھر یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کون اپنے حق سے محروم رہا، اور کس نے اپنے حق سے زیادہ لے لیا۔

زہیر بن رافع کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں ایسے کام سے روک دیا، جس سے ہم بہت مزے میں رہتے تھے۔ آپؐ

نے ایک دن مجھے بُلایا، اور دریافت فرمایا: "اپنے کھیتوں کے بارے میں تم کیا کرتے ہو؟
مَیں نے عرض کیا: "اپنے کھیتوں کا کبھی چوتھا حصہ بٹائی پر دے دیتے ہیں، کبھی وسق کھجور اور جَو پر اٹھا دیتے ہیں"۔
یہ سُن کر آپؐ نے فرمایا: "ایسا نہ کرو، خود کاشت کرو، یا کسی کو کاشت کے لیے دے دو"۔
فاضل پانی کو معمولی ضرورت کے لیے روک کر دوسرے کی اہم ضرورت کو نظرانداز کر دینا بھی اسلام پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔
ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"بچے ہوئے پانی کو گھاس کے ترو تازہ رکھنے کے لیے مت روکو!"
چراگاہیں تو بالکل سرکاری مِلک قرار دی گئیں۔
صعب بن جثامہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"چراگاہ صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہے!"
حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جو شخص کسی افتادہ زمین کو آباد کرے تو وہ اس کا زیادہ مستحق ہے!"[1]

کیا مکان کا کرایہ جائز ہے؟ غلط قسم کی نفع اندوزی کا ایک ذریعہ مکان بنانا، اور اسے کرایہ پر دینا اور من مانا کرایہ وصول کرنا ہے، لیکن اسلام کی نظر میں یہ غیر پسندیدہ فعل ہے۔
حضرت عمرؓ تین کمروں سے زیادہ بنانے کی اجازت نہیں دیتے تھے!
حضرت عمروؓ بن العاص مصر کے گورنر تھے، انھوں نے وہاں مکان تعمیر کیا۔
حضرت عمرؓ کو یہ بات سخت ناگوار گذری کہ جو شخص صرف منصبی ذمے داریوں کے لیے مصر گیا ہوا ہے، وہ اپنی مستقل جائے اقامت رکھنے کے لیے مکان بنوائے، چنانچہ آپؓ کے حکم سے وہ بازار میں تبدیل کر دیا گیا۔[2]

ذاتی ضرورت سے زیادہ زمین نہیں رکھی جا سکتی: طلحہ بن عبید رضؓ نے جب ایک زمین پر حق ملکیت ثابت کرنا چاہا، تو حضرت عمرؓ بگڑ گئے، اور ارشاد فرمایا: "یہ اتنی ساری زمین دوسرے مسلمانوں کو محروم کر کے صرف تمہاری کیسے بن سکتی ہے؟"[۴۳]

حضرت بلالؓ کی زائد زمین واپس لے لی گئی: بالکل ایسا ہی ماجرا مؤذنِ رسولؐ حضرت بلال کے ساتھ بھی گذرا، وہ اپنی زمین جب ایک عرصے تک کاشت نہ کر سکے تو عمرؓ نے ان سے واپس لے لی۔ صرف اتنی زمین رکھنے کی اجازت دی جس پر وہ خود کاشت کر سکیں۔

سرمایہ داری کے خلاف ابوذرؓ کا جہاد: حضرت ابوذر غفاریؓ جلیل القدر صحابی رسولؐ تھے۔ انھوں نے اس وقت، جب امویوں کا آفتاب عروج واقبال طلوع ہو رہا تھا خالص "اسلامی سوشلزم" کا پرچار شروع کر دیا۔ اُن کے لب ولہجہ کا تیکھاپن، اندازِ گفتگو اور جوشِ کلام اُبھرتی ہوئی سرمایہ دارانہ سوسائٹی کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔ اس سلسلے میں انھوں نے دکھ بھی جھیلے اذیتیں بھی برداشت کیں، اور مصیبتیں بھی سہیں۔ لیکن اپنے جادہ صواب سے منحرف نہ ہوسکے، ان کا مدارِ استدلال قرآن کریم کی یہ آیت تھی:

"والذین یکنزون الذھب والفضۃ فبشرھم بعذاب الیم"	یعنی جو لوگ سونے چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں، انھیں عذاب الیم کی بشارت دے دو!

حضرت ابوذرؓ نے یہ دعوت شام میں جو امیر معاویہؓ کا مرکز تھا، شروع کی تھی، اور یہ دعوت جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگی۔ عوام نے اس دعوت پر لبیک کہا۔ اور دولت مندوں اور سرمایہ داروں کو اپنی بگڑی سنبھالنا مشکل ہو گئی[۴۵]!

حضرت عثمانؓ نے امیر معاویہؓ کی فریاد پر واپس بلا لیا، اور اپنے پاس رکھ کر ان کی کفالت کرنا چاہی، مگر ان کا جواب یہ تھا: "مجھے آپ کی دنیا سے کوئی

کوئی سروکار نہیں[6]!"

حضرت ابوذرؓ مزاج شناس رسولؐ تھے۔ جانتے تھے، آپؐ کی رائے دولت مندوں اور سرمایہ داروں کے بارے میں کیا ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ جبل اُحد کو دیکھ کر فرمایا:

"یہ پہاڑ اگر سونا بن جائے تو بھی مَیں پسند نہیں کرتا کہ تین دن سے زیادہ ایک دینار بھی میرے پاس باقی رہ جائے۔ البتہ وہ دینار جسے مَیں نے قرض ادا کرنے کے لیے روک لیا ہو۔"

اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا: "دولت مند لوگ (بہ اعتبار نیکی) بہت کم ہیں، مگر وہ دولت مند جو اپنے مال کو اس طرح خرچ کرے۔"

یہ کہہ کر آپؐ نے دونوں ہاتھوں سے کھونچ بنا کر سامنے، داہنے، بائیں بھر بھر کر دینے کا وعدہ فرمایا (اور فرمایا) لیکن ایسے لوگ کم ہی ہیں[7]!

پانی فروخت نہیں کیا جا سکتا: بخاری کے اسی باب میں تقریباً اسی مفہوم کی ایک دوسری حدیث بھی ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں۔

آج بھی کھیتوں میں پانی کی بہم رسانی، اور استحقاق سے زیادہ پانی کے استعمال یا پانی کو روک لینے، یا اس کی قیمت لینے کا رواج ہے۔

لیکن اسلامی سوشلزم ان تمام صورتوں کو ممنوع قرار دیتا ہے:

۱۔ صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ کی حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زائد از ضرورت پانی فروخت کرنے سے منع کیا ہے۔

۲۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے پانی کو عباد و بہائم کے درمیان مشترک پیدا کیا ہے۔ تاکہ وہ اسے پی سکیں، لہٰذا اس باب میں کوئی بھی ایک دوسرے پر خصوصیت نہیں رکھتا، اگرچہ وہ اس کا پانی کیوں نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ مسافر پانی کا زیادہ مستحق ہے، کنواں بنانے والے سے!

۳۔ اپنی حاجت اور اپنے جانوروں کی حاجت سے جو پانی زیادہ ہو، اور

جس کے دوسرے آدمی اور بہائم محتاج ہوں، بغیر کسی معاوضہ کے ہر شخص ایسے پانی پر آ سکتا ہے۔ اسے پی سکتا ہے، اور اپنے جانوروں کو پلا سکتا ہے، پانی کا مالک منع نہیں کر سکتا ہے نہ وہ کوئی معاوضہ لے سکتا ہے۔

۴۔ اثرمؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا، ان سے سوال کیا گیا کہ کچھ لوگوں کے درمیان ایک نہر بہتی ہے جس سے وہ اپنے کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں۔ ایک دن یہ، دو دن وہ، اس تقسیم حصص پر اتفاق ہے۔ ایک دن جب میری باری آتی ہے تو میں پانی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہوں، اور چند روپے کرایہ لے کر کسی دوسرے کو دے دیتا ہوں۔

ابوعبداللہؓ نے کہا، میں نہیں جانتا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی بیچنے سے منع فرمایا ہے!۔

کہا گیا کہ وہ پانی نہیں بیچتا، کرایہ پہ دیتا ہے۔

ابوعبداللہ نے کہا کہ یہ ایک حیلہ ہے تاکہ ایک غلط چیز کو اچھا رنگ دیا جا سکے، ورنہ یہ چیز بیع کے علاوہ اور کیا ہے [۵۸]؟

ابطال ملکیت زمین: فاطمیوں نے اپنے عہد حکومت میں جو کم از کم ان کے نقطۂ نظر سے خالص مذہبی اور شرعی تھا۔ ابطال ملکیت زمین کے حق میں فیصلہ کر دیا، اور اسی پہ عمل درآمد ہوتا رہا۔

دیوان جیش سے ملحقہ دواوین میں ایک دیوان الاقطاع (محکمہ جاگیر بھی تھا۔ یہ فوجیوں کو حسب ضرورت زمین اور جائداد عطا کرتا تھا۔ دوسرے لوگ بھی اس سے بہرہ ور ہو سکتے تھے۔ عام طور پہ یہ جاگیریں ان لوگوں سے حاصل کی جاتی تھیں جن کے پاس فاضل ہوتی تھیں یا کسی سبب سے ضبط کر لی جاتی تھیں۔ اس طرح اسماعیلیوں نے ابطال ملکیت زمین کی بنیاد اشتراکیوں کی مانند ڈال دی تھی۔ جسے وہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ان اراضی سے انتفاع کا حق دیا جاتا تھا، ملکیت کا نہیں۔ وفات کے بعد پھر خلیفہ کی ہو جاتی تھیں۔ یہ

جاگیریں اور زمینیں نہ منتقل ہو سکتی تھیں۔ نہ ان میں وراثت چلتی تھی۔
فاطمی خلفاء کی طرف سے جن لوگوں کو جاگیریں اور زمینیں عطا ہوتی تھیں، وہ انھیں زرخیز اور شاداب کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے، بنجر زمینیں قابلِ کاشت بن جاتی تھیں، ان کے سینہ میں جو معاون چھپے ہوتے تھے وہ برآمد کر لیے جاتے تھے۔ ان سے بعض زرعی صنعتوں کی داغ بیل ڈالی جاتی تھی۔[۱۰]
حضرت ابوبکرؓ صدیق، خلیفہ اوّل نے وقت وفات اپنی تجہیز و تکفین کے بارے میں تاکید کی کہ بدن پر جو کپڑا ہے وہی دھو لیا جائے، حضرت عائشہؓ ضبط نہ کر سکیں فرمایا۔ "یہ تو بہت پرانا ہو گیا ہے۔ کفن تو نئے کپڑے کا ہونا چاہیئے!" یہ سُن کہ حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں فرمایا! "میرے لیے یہ بوسیدہ کپڑا کافی ہے۔ نئے کپڑوں کی ضرورت زندوں کو ہوا کرتی ہے[۱۱]!"
دنیا کی کسی سوشلسٹ حکومت کے سربراہ نے کیا کوئی ایسا اسوہ چھوڑا ہے؟
حضرت علیؓ اکثر بازار کا گشت کرتے، تاجروں اور سوداگروں کو اچھا اور سستا مال بیچنے کی تلقین کرتے، کبھی ایسی دکان سے مال نہ خریدتے جس کا مالک انھیں پہچانتا ہو۔ ایک مرتبہ بھیس بدل کر نکلے، دو دوکانداروں نے اس کے باوجود بھی پہچان لیا، اب تیسری دکان پر پہنچے، جہاں باپ کے بجائے ایک طفل نوخیز بیٹھا تھا، اس سے تین درہم میں ایک قمیص خریدی، وہیں اسے پہنا، اور تشریف لے گئے۔ باپ جب آیا تو اسے پتہ چل گیا، دوڑا دوڑا حاضر ہوا، اور ایک درہم واپس کرنے لگا کہ یہ زیادہ ہے، مگر آپؓ نے جواب دیا، یہ سودا تو باہمی رضامندی سے ہوا ہے ٹوٹ نہیں سکتا[۱۲]!
کسی سوشلسٹ ملک میں کوئی ایسا سربراہِ مملکت بھی ہے؟ کیا اس کے بعد بھی ہمیں سوشلزم، یا اسلامی سوشلزم کا پرچم بلند کرنے کی ضرورت ہے؟

ماخذ:

۱؎ صحیح بخاری، کتاب الحرث: عن زہیر بن رافع، عن ابی ہریرہؓ، وعن صعبؓ بن جثامہ، و عن عائشہؓ۔ نیز سنن ابی داؤد، کتاب الامارہ، سنن ترمذی، کتاب الاحکام، مؤطا امام مالکؒ، کتاب الاقضیہ۔

۲؎ الطبری، ج ۴، ص ۱۹۱

۳؎ کتاب الاموال (ابوعبید) ص ۲۰۷

۴؎ سورۂ توبہ پارہ ۱۰، رکوع ۵، آیت ۳۴۔

۵؎ البدایہ والنہایہ، ج ۵، ص ۱۳۔

۶؎ طبقات ابن سعد، ملاحظہ ہوں حالات ابوذرؓ)

۷؎ صحیح بخاری، کتاب الدیون والجر، عن ابی ذرؓ

۸؎ زاد المعاد (ابن قیم) طبع مصر، ج ۴، ص ۴۹۸ - ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۸۹۔

۹؎ تاریخ الحرکات الفکریہ فی الاسلام، ج ۱، ص ۲۸۔

۱۰؎ النجوم الزاہرہ، ج ۵، ص ۳۱۳

۱۱؎ طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۱۳۶؛

۱۲؎ البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۴۔

(۱۵)

اسلامی سیکولرازم

"اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح میرے نزدیک چند در چند، غلط فہمیوں کی موجب بن سکتی ہے، لیکن اسلامی "سیکولرازم" یقیناً ایسی چیز ہے جو درست اور بجا بھی ہے اور جس پر فخر بھی کر سکتے ہیں۔

سیکولرازم کا مطلب بعض لوگ "لا مذہبی" لیتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ اس سے مراد "مذہبی غیر جانبداری" ہے یعنی صحیح معنی میں وہ حکومت سیکولر کہلائی جا سکتی ہے، جو اکثریت رکھنے کے باوجود اپنے مذہب کے آئین، شعائر، رسوم روایات اور تہذیب و ثقافت، سرکاری دبدبے سے کام لے کر مسلّط کرنے کی سعی نامحمود نہ کرے اور اگر کوئی حکومت ایسا کرتی ہے تو وہ سیکولر نہیں کہلائی جا سکتی، وہ بدترین قسم کی مذہبی حکومت ہے، اور مذہب میں اتنا کٹرپن مذہب کا استخفاف بھی ہے۔ عقل عامہ کا بھی اور انسانیت کا بھی۔

فکری بددیانتی اور ذہنی نفاق: اس زمانے میں کسی حکومت کا "مذہبی" ہونا معیوب بن گیا ہے۔ مذہبی حکومتیں، مذہبی رہتے ہوئے بھی، اپنا مذہبی ہونا تسلیم نہیں کرتیں، بلکہ سیکولرزم کا نقاب اوڑھ کر اپنے آپ کو متعارف کراتی ہیں، حالانکہ یہ فکری بددیانتی اور ذہنی نفاق کی انتہائی افسوسناک مثال ہے، کوئی مذہب ہے جو کذب و دروغ کی تعلیم دیتا ہو؟ ایک طرف مذہب میں یہ تقشف کہ دوسرے مذاہب کے لوگ مطعون، معتوب، مقہور، ان کے وسائل

حیات مسدود، ان کے لیے مساوات مفقود، امور مملکت میں ان کا حصہ حد درجہ محدود اور دوسری طرف سیکولرازم کا ذہنی تحفظ کے ساتھ غلط اور خلافِ حقیقت اعلان!

اسلام نے یہ راستہ نہیں اختیار کیا ہے۔

اسلامی حکومت کا اختصاص: اسلامی حکومت فخر کے ساتھ اپنے مذہبی ہونے کی مقر ہوتی ہے اور اتنے ہی فخر کے ساتھ اپنی مذہبی غیر جانبداری، یعنی سیکولرازم کی بھی مقر ہوتی ہے، وہ اپنے ابنائے ملّت کے ساتھ خالص مذہبی حکومت ہے، ان کے لیے نماز قائم کرے گی، حلال و حرام کی پابندی کرائے گی۔ اسلامی حدود و تعزیرات کا ان پر اجرا کرے گی، ان سے زکوٰۃ لے گی، انھیں منظم کرے گی۔ ان کی اصلاح کرے گی۔ لیکن غیر مذاہب والوں کے پرسنل لا میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کرے گی، اپنے شعائر، رسوم، تہذیب و تمدن، ثقافت زبان، کوئی چیز بھی ان پر مسلط نہیں کرے گی، انھیں مساوات کی نعمت سے آشنا کرے گی۔ انھیں انسانی حقوق عطا کرے گی، ان کے مذہبی معاملات میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کرے گی، ان کے تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی ادارے آزاد اور خود مختار ہوں گے، ان کے معابد پر کسی طرح کا کنٹرول نہیں رکھے گی ان کے مذہبی منصب داروں سے کوئی تعرض نہیں کرے گی۔ مذہبی اداروں اور مذہبی منصب داروں کا قرار واقعی احترام کرے گی۔ ان کے ساتھ جو عہد و میثاق ہوگا، ہر قیمت پر اسے بجا لاتے گی۔ انھیں وسائلِ حیات سے محروم نہیں کرے گی۔ مسلمانوں کے مقابلے میں ان کے ساتھ زیادہ مراعات ملحوظ رکھے گی۔ انھیں کسی قیمت پر یہ محسوس نہیں ہونے دے گی کہ وہ دوسرے درجے کے شہری ہیں۔

سیکولرزم عمل کی میزان میں: جو حکومتیں خالص طور پر "سیکولر" ہونے کی مدعی ہیں۔ ان کے ہاں بھی بعض ایسے مواقع آتے ہیں۔ جب غیر مذ-

والے کی قابلیت، اہلیت، استحقاق اور خدمات کو نظرانداز کر کے "ہم مذہب" کو صفات بالا سے محروم ہونے کے باوجود ترجیح دی جاتی ہے۔ مثلاً فرانس میں کوئی یہودی، صدر مملکت نہیں بن سکتا۔ امریکہ میں کوئی حبشی صدر تو بڑی چیز ہے، وزیر خارجہ بھی نہیں بن سکتا۔ روس میں جو سراپا سیکولر ہے کوئی مسلمان نہ "پارٹی" کا لیڈر بن سکتا ہے، نہ وزیر اعظم، نہ صدر والا قدر۔ ہمارے پڑوسی ملک میں جو اپنے سیکولرازم کا اعلان گزشتہ ۲۰ سال سے بہ بانگ دہل کرتا چلا آرہا ہے۔ آج تک نہ کوئی مسلمان ہر طرح کی اہلیت، استحقاق، قابلیت اور خدمات جلیلہ کے باوجود مرکز یا صوبے کا وزیر اعظم بنا، نہ سپہ سالار عساکر کے منصب پر فائز ہوا، نہ آئندہ اس کا کوئی امکان ہے۔ گو "اصولی طور پر" ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس اصول کو ہمیشہ ٹھکرا دیا گیا، اور ہمیشہ ٹھکرایا جاتا رہے گا۔

اسلام نہ خود فریبی کو پسند کرتا ہے، نہ فریب کاری کو، وہ مذہبی غیر جانبداری پر تو سختی کے ساتھ قائم ہے، لیکن خالص مذہبی معاملات ہیں، وہ غیر مسلم کو مسلم پر ترجیح نہیں دیتا، اور اپنے اس مسلک پر نہ شرماتا ہے، نہ جھجک محسوس کرتا ہے، جو منصب خالص اسلامی امور سے تعلق رکھتے ہوں، ان پر وہ کسی غیر مسلم کو فائز نہیں کر سکتا۔ لیکن جو منصب مفاد عمومی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا دروازہ پوری رواداری کے ساتھ غیر مسلموں کے لیے کھلا ہوا ہے، ایسے مواقع پر کوئی غیر مسلم اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسلمان نہیں ہے نہ ہو مسلمان، لیکن اگر صلاحیت، قابلیت، اہلیت، استعداد اور استحقاق رکھتا ہے تو ضرور اس کے خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

اسلامی سیکولرازم: مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر اسلام کے سیکولرازم پر بھی ڈال لی جائے کہ آیا واقعی وہ ایک مذہب ہونے، اور معاملات ومسائل پر مذہبی نقطہ نظر رکھنے کے باوجود، مذہباً، سیکولر ہے؟ واقعات اور

حقائق کا جواب یقیناً اور بلاشبہ اثبات میں ہے۔ اور یہ ایسے واقعات و حقائق ہیں، جو تاریخ کے ایوان میں بقائے دوام کا خلعت پہن کر غیر فانی بن چکے ہیں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:

"ان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ ذٰلک بانہم قوم لایعلمون ہ"

یعنی اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اس کو پناہ دو۔ یہاں تک کہ وہ اطمینان سے کلام خدا کو سن لے، پھر اس کو اس کے امن کی جگہ واپس پہنچا دو، یہ سلوک اس لیے کرنا ضروری ہے کہ یہ مشرک ناواقف لوگ ہیں۔

صاوی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے: "کافر کو اس کے مقام امن تک پہنچا دو، یعنی اگر دعوتِ اسلام سننے کے بعد واپس جانا چاہے، اور اسلام نہ قبول کرے تو اسے اس قوم تک حفاظت سے پہنچا دو، تاکہ بعد میں وہ اطمینان کے ساتھ خالی الذہن ہو کر معاملہ پہ غور کر سکے۔!"

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ یہ "پناہ طلب کرنے والا کافر" وہ ہے جو جان بخشی چاہ رہا ہو۔

اس آیۂ کریمہ سے جو نتائج و ہدایات علامہ جصاص نے پیدا کیے ہیں، ان کا ذکر اس جگہ ضروری ہے۔ فرماتے ہیں:

اس آیت کا اقتضاء یہ ہے کہ حربی جب ہم سے امان طلب کرے تو اسے امان دے دینا جائز ہے، تاکہ وہ اسلام کی صحت و صداقت کے دلائل سن سکے، کیونکہ اللہ کا قول "استجارک" (اگر تم سے پناہ کا خواستگار ہو) یہ معنی رکھتا ہے کہ اگر وہ تم سے طالب امن اور اللہ تعالیٰ کا قول "پس اسے پناہ دو" یہ معنی رکھتا ہے کہ اسے امن دے دو۔ تاکہ وہ اللہ کا کلام سن لے، جس میں صحت توحید کے دلائل ہیں، اور

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحت نبوت کی دلیلیں ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی کافر اللہ کے بیان توحید اور نبی کی صحت نبوت کے بارے میں دلیل و برہان کا مطالبہ کرے تو ہمارے لیے اس کا قتل کر دینا ناجائز ہے، جبکہ اس سلسلہ میں وہ ہم سے طالب امن ہوا ہو۔ بجز اس صورت کے کہ ہم دلیلیں بیان کر چکیں، اور حجت قائم کر لیں، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اسے امان دیں۔ یہاں تک کہ وہ کلام الٰہی سن لے، اور اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی ہم سے امور دین کی تعریف وتبیین چاہے تو ہم اسے تعلیم دیں اس لیے کہ وہ کافر ہمارے پاس اس لیے پناہ گزین ہے کہ صحت دین کی معرفت حاصل کر سکے، اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ:

"پھر اسے اس کے مامن میں پہنچا دو"، دلیل ہے اس بات کی کہ مستجیر کی حفاظت امام وقت پر واجب ہے، اور لوگوں کو اسے گزند پہنچانے سے روکنا فرض ہے۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ: "اسے امان دو"

اور خدا کے اس قول سے کہ اسے اس کے مامن تک پہنچا دو۔ یہ دلیل بھی نکلتی ہے کہ امام وقت کا یہ فرض ہے کہ وہ اہلِ ذمہ کے جان و مال کی حفاظت کرے۔ انھیں کسی طرح کی اذیت نہ پہنچنے دے اور انھیں ہر طرح کے ظلم و جور سے بچائے۔[۲]

دشمن کا اعتراف: اصل بڑائی وہ ہے جس کا دشمن بھی اعتراف کریں۔ چنانچہ کرنل جیمس بیکر کا حسب ذیل تاریخی بیان خاص طور پر قابل ذکر و مطالعہ ہے لکھتے ہیں: "ایک شخص جارج برنیکووچ نے جو گریک چرچ کا پیرو تھا، ایک رومن کیتھولک شخص ہیناڈس سے پوچھا کہ اگر تم فتح یاب ہوئے تو کیا کرو گے؟"

اس نے جواب دیا: "تمام باشندوں کو جبراً رومن کیتھولک بناؤں گا!" اس کے بعد برنیکووچ سلطان (ترکی) خدمت میں گیا، اور ان سے بھی یہی سوال کیا۔ وہاں سے یہ جواب ملا کہ میں ہر مسجد کے قریب ایک گرجا بناؤں گا، اور تمام

لوگوں کو اجازت دوں گا کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق خواہ مسجدوں میں سجدہ کریں، یا گرجاؤں میں صلیب کے سامنے جھکیں۔

جب اہل سرویا نے یہ سُنا تو انھوں نے لٹین چرچ کے محکوم بننے کے مقابلہ میں سلطان کی رعایا بننا زیادہ پسند کیا۔[۳۳]

یہ سلطان محمد ثانی کا ذکر ہے، ان کے عہد میں بوسینیا اور بلغاریہ کے بہت سے اعیان و اشراف نے اسلام قبول کیا۔

لا اکراہ فی الدین : اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"لا اکراہ فی الدین" یعنی دین کے معاملہ میں کوئی جبر و جور روا نہیں۔[۳۴]

اس آیت کی شان نزول علامہ جصاص نے یہ بتائی ہے :-

"انها نزلت فی بعض ابناء الانصار، کانوا یهودیا فاجاؤھم اکراھھم علی الاسلام" یعنی یہ آیۃ کریمہ بعض انصار کے بیٹوں کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے جو یہودی ہو گئے تھے اور ان کے باپ انھیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا چاہتے تھے۔

پھر آگے چل کر اس بارے میں علامہ موصوف ایک شبہ رفع فرماتے ہیں، اس آیت کے انداز بیان سے بظاہر ایسا مترشح ہوتا ہے کہ یہ گویا خبر یا مشورہ ہے۔ لیکن وہ فرماتے ہیں :

"لا اکراہ فی الدین امر فی صورۃ الخبر" - یعنی اکراہ کی آیت خبر کی صورت میں امر ہے۔[۳۵]

اسلام نے قتل کی سزا قصاص رکھی ہے :

"ان النفس بالنفس والعین بالعین الخ" یعنی جان کے بدلے جان، اور آنکھ کے بدلے آنکھ ہے۔[۳۶]

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کر دے تو قتل کر دیا جائے گا۔

ایک ذمی اگر کسی مسلمان کو قتل کر دے، تو وہ بھی قتل کیا جائے گا۔

ایک مسلمان اگر ایک ذمی کو قتل کر دے، تو قطعاً قتل کر ڈالا جائے گا۔

"کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ ط" یعنی مقتولین کے بارے میں تم پر قصاص واجب کیا گیا ہے۔

اس کی تفصیل کے سلسلے میں مفسر ابوبکر جصاص فرماتے ہیں:

"مقتول ذمی کے بدلہ میں قاتل مسلمان کا قتل واجب ہے، کیونکہ عام حقوق میں ایک ذمی اور مسلمان کے مابین کوئی فرق نہیں ہے، اور قصاص کے واجب ہونے کا حکم عام ہے سب میں!

عام معاملات میں مسلم و کافر یکساں ہیں: "اس آیۂ کریمہ کی رو سے، (عام معاملات میں) ایک کافر اور مسلمان کے مابین کوئی فرق نہیں، قصاص کا حکم، دونوں پر جاری ہوگا، اور اس پر خداوند تعالیٰ کا یہ قول دلیل ہے کہ جو مظلوم قتل ہوا اور ہم نے اس کے ولی کو دعوے کا حق دیا ہے [۷]!"

قرآن مجید کی آیت ہے:

"ویطعمون الطعام علیٰ حبہ مسکیناً و یتیماً و اسیراً [۸]!"

علامہ جصاص نے اس آیت سے استشہاد کیا ہے کہ اس آیت میں جنگی قیدیوں سے مراد، کافر اور مشرک قیدی ہیں، اور فرماتے ہیں:

اقتضائے کلام یہ ہے کہ مشرکوں کو صدقہ دینا جائز ہے، اور ظاہر آیت سے متبادر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ ہر قسم کے صدقے کی رقم انھیں دی جاسکتی ہے۔

پھر آگے چل کر علامہ موصوف امام ابوحنیفہؒ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ زکوٰۃ کے سوا ہر صدقہ اہلِ ذمہ کو دیا جاسکتا ہے، البتہ زکوٰۃ اہلِ ذمہ پر نہیں صرف کی جاسکتی، مگر کفارہ، نذر اور صدقۂ فطر کی رقمیں اہلِ ذمہ کو دی جاسکتی ہیں [۹]!"

آنحضرتؐ کو استغفار کا حکم ایک یہودی کے لیے: یہودیوں کے بارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کا حکم: علامہ ابوبکر جصاص آیۂ

کریمہ "ولا تکن للخائنین خصیماً" (یعنی خیانت کرنے والوں کی پاسداری مت کرو)[۱] کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ یہ اس آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے ایک زرہ چرالی تھی، اور جب اندیشہ ہوا کہ چوری کھل جائے گی، تو ایک یہودی کے گھر میں پھینک دی، جب زرہ یہودی کے گھر میں پائی گئی، تو اس نے جرم سے صاف انکار کر دیا، اور اصل چور یہودی پر چوری کا الزام دھرنے لگا، اور مسلمانوں کی ایک جماعت نے یہودی کے مقابلہ میں مسلمان کا ساتھ دیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں کے قول کی طرف مائل ہو گئے، لیکن اللہ نے آپؐ کو اصل واقعہ کی اطلاع دے دی اور یہودی کو بری کر دیا، اور اس کے خلاف فیصلہ کرنے سے روک دیا، اور استغفار کا حکم دیا[۱۱]۔"

فتح مکہ کا اصل سبب معاہد مشرک تھے: اس حقیقت پر شاید بہت کم لوگوں کی نظر ہوگی کہ فتح مکہ کا اصل محرک آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ پاس عہد تھا جو آپؐ نے مشرک قبیلہ بنو خزاعہ سے کیا تھا، اگر بنو بکر خزاعہ پر یورش نہ کرتے، اور قریش مکہ خلافِ عہد بنو بکر کی مدد نہ کرتے، تو شاید فتح مکہ اس قدر جلد عمل میں نہ آتی۔ قریش کا خیال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مشرک حلیف کے لیے مسلمانوں کی جان قربان نہیں کریں گے، لیکن جب معلوم ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خزاعہ کی حمایت میں جہاد کرنے کو تیار ہیں تو وہ گھبرائے، اور ابوسفیان کو بھیجا کہ تجدید صلح ہو جائے مگر وہ نہ ہو سکی، اس لیے کہ پیمان شکنوں پر بار بار اعتماد نہیں کیا جا سکتا[۱۲]۔

حاکم یمامہ مہاجر بن امیہ کے پاس چند لوگ دو عورتوں کو گرفتار کر کے لائے، ان میں سے ایک مسلمانوں کے خلاف ہجو سے بھرے ہوئے گیت گایا کرتی تھی، حاکم یمامہ نے سزا قطع ید اور دانت نکلوانے کی دی۔

بات خلیفہ اول صدیق اکبرؓ تک پہنچی، انھوں نے حاکم یمامہ کو لکھا:

"وہ عورت جو مسلمانوں کی ہجو کیا کرتی ہے، اگر دعوئ اسلام رکھتی ہے تو اس کی تادیب کرنا اور سرزنش کرنا چاہیے تھا، ہاتھ نہ کاٹنا چاہیے تھا، اور اگر ذمّی ہے تو یہ (ہجو مسلمین) شرک سے زیادہ بُرا فعل نہ تھا، جب اس کا شرک برداشت کیا جا سکتا ہے تو اس فعل کو بھی گوارا کرنا چاہیے تھا۔ قصاص کے سوا کسی اور جُرم میں ہاتھ کٹوانا میں مکروہ خیال کرتا ہوں، کیونکہ اس طرح کی سزا پانے والے کو ہمیشہ شرم دامنگیر رہتی ہے"[۱۳]

مسلمانوں اور یہودیوں کا معاہدہ: عہدِ رسالت میں اور اس کے بعد بھی اسلام اور داعی اسلام کے بدترین دشمن یہودی رہے ہیں، لیکن ان سے بھی ہم قومی کی بنا پر معاہدۂ امن کرنے میں آپؐ نے تامل نہیں فرمایا، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد جو معاہدہ مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین ہوا، اس کے خاص خاص حصص یہ ہیں:

۱۔ بنی عوف کے یہودی، اور مسلمان ایک قوم شمار ہوں گے۔

۲۔ طرفین میں سے اگر کسی سے بھی کوئی جنگ آزما ہو تو دونوں اس کے خلاف نبرد آزما ہوں گے۔

۳۔ طرفین کے مراسم باہم دگر خیرسگالی اور خیرخواہی پر مبنی ہوں گے۔ معصیت اور گناہ پر نہیں۔

۴۔ دورانِ جنگ میں یہودی، مصارفِ جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ شریک رہیں گے۔

۵۔ جن قبیلوں کی یہودیوں سے دوستی ہے، ان کے حقوق بھی یہودیوں کے برابر مسلمان مقرر کریں گے۔

۶۔ طرفین ایک دوسرے کے خلاف کوئی اقدام نہیں کریں گے۔

۷۔ مظلوم کی امداد اور پشت پناہی کی جائے گی۔

۸۔ اختلاف کی صورت میں فیصلہ خدا اور رسولؐ کے ہاتھ میں ہوگا،[۱۴]

اہل نجران (عیسائیوں) سے آپؐ نے جو معاہدہ فرمایا تھا، وہ اس لیے خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ اب مسلمان ایک طاقتور حکومت بن چکے تھے، عاجز اور بے دست و پا نہ تھے لیکن ان سے معاہدہ ہوا اور ایسا معاہدہ ہوا جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔

نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ: یہود سے جو معاہدہ ہوا تھا اس وقت مسلمان کمزور تھے لیکن نجران کے عیسائیوں سے آپؐ نے جو معاہدہ کیا وہ اس وقت جب مسلمانوں کے ہاتھ میں اقتدار و اختیار تھا، زمام کار اور عنانِ حکومت تھی۔ فتوحات کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا، ایسے ہی مواقع پر ظلم کا دروازہ کھلتا ہے، طاقتور کمزور کی آزادی ہی نہیں چھینتا۔ فکر و خیال اور عقیدے کی آزادی بھی سلب کر لیتا ہے۔

معاہد قوموں سے زبردست اور باجبروت قوموں کی ایک شرط یہ بھی ہوتی ہے کہ جب حالات اور مصالح کا تقاضا ہوگا، ہماری فوجیں تمہاری سرزمین پر خیمہ زن ہو کر دشمن سے لڑیں گی، اور تم کو یہ اجازت دینا پڑے گی اور جو کمزور ہوتا ہے اسے بے چون و چرا یہ شرط ماننی پڑتی ہے ؎

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی کوئی شرط عائد نہیں کی۔ معاہدے کی رُو سے:

۱۔ نجران اور مضافات کے باشندوں کی جان، زمین، جائداد، املاک، اہلِ نجران کے حاضر اور غائب، ان کے جانور، ان کے قاصد، ان کی مورتیاں، ان کی عبادت گاہیں، اللہ کی امان اور محمدؐ (رسول اللہ) کی ضمانت میں ہیں۔

۲۔ نہ تمہاری موجودہ حالت میں تبدیلی کی جائے گی۔

۳۔ نہ تمہارے حقوق میں دست اندازی کی جائے گی۔

۴۔ نہ تمہاری مورتیں مسخ کی جائیں گی۔

۵۔ کوئی اسقف اسقفیت سے، کوئی راہب راہبانیت سے، اور کوئی وافہ وفاہیت سے برطرف نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ جو کچھ کم زیادہ تمھارے قبضے اور تصرف میں ہے، اسے بدلا نہیں جائے گا۔

۷۔ تم سے جاہلیت کے کسی جرم کا مؤاخذہ نہیں کیا جائے گا۔

۸۔ نہ فوجی خدمت پر بلایا جائے گا۔

۹۔ نہ کوئی عشر (ٹیکس) لگایا جائے گا۔

۱۰۔ نہ کوئی لشکر تمھاری سرزمین کو پامال کرے گا۔

۱۱۔ اگر کوئی اپنا حق تم سے طلب کرے گا، تو دونوں کے درمیان انصاف کیا جائے گا۔

۱۲۔ نہ تم پر ظلم کیا جائے گا، نہ تمھیں ظلم کرنے دیا جائے گا۔

۱۳۔ تم سے کسی کے خلاف کسی دوسرے کے جرم میں کوئی مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔[15]

۱۴۔ اس معاہدے کے بعد جس نے فساد پھیلانے کی کوشش کی، وہ میری ضمانت سے خارج ہے۔[16]

اس معاہدے کی اور اس طرح کے دوسرے معاہدوں کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد گرامی میں، اور خلفائے راشدین کے زمانے میں پوری پوری تعمیل کی جاتی رہی۔ ان میں کسی طرح کا تغیر اور تبدل نہیں کیا گیا، نہ انھیں منسوخ کیا گیا۔

ایک نسطوری کی تحریر: اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بطریق نسطوری سوم (یشویاب) Yesu Yabh (از ۶۴۷ء تا ۶۵۸ء) اپنے فرقہ کی سرداری پر عثمانؓ اور علیؓ کے عہد میں برابر قائم رہا۔ اس نے لکھا ہے:

"عربوں کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی حکومت سونپی ہے۔ یہ لوگ نصرانیت کے دشمن نہیں ہیں بلکہ ہمارے دین اور مذہب کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔

ہمارے رہبروں "پادریوں اور کاہنوں کی عزت و تکریم میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتے، ہمارے دیار و کنیسے ان کی امداد و اعانت کے مرہونِ منت ہیں۔"

ایک اور اس نسطوری قائد کی تحریر ہے جس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں اسقفوں کو مکمل اختیارات اپنے دینی، قومی اور نجی معاملات میں حاصل تھے۔ وہ بغیر کسی خوف اور اندیشے کے اپنے اعمال مذہبی انجام دیتے تھے[۱۷]۔

"کیا اس اسلامی اسیکولرازم کا مقابلہ آج بھی دنیا کی کوئی سیکولر حکومت کر سکتی ہے؟"

ماخذ :

۱ سورۂ توبہ، رکوع ۱، آیت ۶ ۲ احکام القرآن (جصاص) طبع مصر، ج ۳، ص ۱۰۳، ۱۰۴
۳ ۴ سورۂ بقرہ، رکوع ۳۴، آیت ۲۵۸
۵ احکام القرآن، (جصاص) طبع مصر، ج ۱، ص ۵۳۶، ۶ سورۂ مائدہ رکوع ۷، آیت ۴۶۔
۷ احکام القرآن (جصاص)، ج ۱، ص ۱۶۴، ۸ سورۂ قیامت، رکوع ۱، آیت ۹، پارہ ۲۹۔
۹ احکام القرآن (جصاص) طبع مصر، ج ۱، ص ۵۴۸۔
۱۰ سورۂ نساء، پارہ ۴، رکوع ۱۶، آیت ۱۰۶، ۱۱ احکام القرآن (جصاص)، ج ۲، ص ۳۴۴، طبع مصر
۱۲ سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، (ذکر فتح مکہ) ۱۳ تاریخ الخلفاء (سیوطی) ص ۹۷۔
۱۴ سیرۃ ابن ہشام، ج ۱، ص ۱۷۸،
۱۵ فتوح البلدان (بلاذری) ج ۱، ص ۱۰۳-۱۰۵۔
۱۶ یعقوبی، ج ۲، ص ۶۳
۱۷ تاریخ خوارج (عمر ابو النصر) طبع بیروت، ص ۴۹

(۱۶)

حاکمیتِ عوام اور مسئولیتِ حاکم

اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:

"وما کان ربک لیھلک القریٰ بظلم و اھلھا مصلحون ہ" یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی بستی کے باشندے نیکوکاروں اور صالحین پر مشتمل ہوں، اور تمہارا رب انھیں از راہِ ظلم ہلاک کر دے۔[1]"

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

"ان الارض یرثھا عبادی الصالحون ہ" یعنی زمین کی ملکیت میرے نیک بندوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔[2]

ان دونوں آیتوں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جن بستیوں کو خدا کے حکم سے برباد اور جہاں کے باشندوں کو ہلاک کیا گیا، وہ نیکوکار نہیں رہ گئے تھے، نیز یہ کہ خدا کی اس زمین پر حکومت اور فرماں روائی کا حق اللہ کے انہی بندوں کو ہے جو نیک اور صالح ہوں، یعنی ظلم و جور سے مجتنب رہتے ہوں، اور انسانی ضابطۂ اخلاق اور آدابِ حیات کے حدود و شرائط پر عامل ہوں، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ نہ ظالم ہوں، نہ مظلوم!

ظالم ہونے کے معنے یہ ہیں کہ دوسروں کا حق ماریں۔ اور مظلومیت سے مراد یہ ہے کہ ظلم برداشت کریں۔ اور ان دونوں میں سے کوئی بات بھی بارگاہِ الٰہی میں پسندیدہ نہیں!

حقوق عامہ کی نگہداری اور پاسبانی: پس ظالم اور مظلوم نہ بننے کی صورت یہ ٹھہری کہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل پذیر ہو، جو ظلم و تعدی کو نابود کر دے۔ اور یہ معاشرہ ایسی حکومت قائم کرے، جہاں کوئی کسی پہ زیادتی نہ کر سکے جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ نے مسند خلافت پہ متمکن ہونے کے بعد اپنے پہلے خطبے میں ارشاد فرمایا تھا:

اس طرح کا معاشرہ صرف اسی طرح عالم وجود میں آسکتا ہے اور اس طرح کی مثالی حکومت صرف اسی طرح قائم ہو سکتی ہے کہ حاکم اور محکوم، راعی اور رعایا، عوام اور حکمران کے مابین ایسا رشتہ قائم ہو جائے جو ایک دوسرے کے حقوق و حدود کی نگہداری اور پاسبانی کرے۔ اور کسی کو بھی حدود سے متجاوز نہ ہونے دے اور یہ رشتہ اسی صورت قائم ہو سکتا اور استوار رہ سکتا ہے، جب عوام کی حاکمیت ایک مسلمہ حقیقت ہو اور حاکم اپنے آپ کو مسئول اور جوابدہ سمجھتا رہے۔ ان دونوں میں سے اگر کوئی ایک چیز نہیں ہے تو پھر سمجھ لینا چاہیے کہ حاکم اور محکوم کے مابین بعد پیدا ہو چکا ہے اور یہ کسی وقت بھی کوئی المناک رُخ اختیار کر سکتا ہے۔

عوام کی حاکمیت اور حاکم کی مسئولیت: اسلام کا جہاں تک تعلق ہے، اس نے دنیا میں سب سے پہلی مرتبہ عوام کی حاکمیت اور حاکم کی مسئولیت تسلیم کی ہے۔ قرآن کریم میں شوریٰ کا جو حکم دیا گیا ہے اور احادیث نبوی میں سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کو افضل جہاد سے جو تعبیر کیا گیا ہے وہ ہمارے اس دعوے کی روشن بُرہان ہے۔

قرآن و سنت کے علاوہ اسوۂ خلفائے راشدین سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اس حق کو تسلیم کرتے تھے، حضرت ابو بکرؓ کے بارے میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ انھوں نے خلیفۂ رسولؐ بننے کے بعد اپنی پہلی تقریر میں حاضرین سے فرمایا تھا:

"اگر میں راہِ راست سے ہٹ جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو!"

حضرت عمرؓ جیسی با جبروت شخصیت کے بارے میں بھی ہماری نظر سے

گذر چکا ہے کہ ان سے ایک بدّو نے کہا تھا:-

"اگر تم سیدھے رستے نہ چلے تو ہم تم کو تکلے کی طرح سیدھا کر دیں گے!"

اور اس پر حضرت عمرؓ نے خفا ہونے کے بجائے خدا کا شکر ادا کیا تھا، کہ اُمّتِ محمدیہ میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو اپنے سربراہ کو تکلے کی طرح سیدھا کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔

حضرت عثمان کے عہد میں اگرچہ کئی باتیں ایسی ہوئیں جو محلِ بحث و گفتگو بن سکتی ہیں، لیکن یہ حقیقت بالکل واضح اور نمایاں ہے کہ انھوں نے مسئولیتِ حاکم، اور حاکمیتِ عوام کا اصول اپنے قول و عمل سے ہمیشہ تسلیم کیا، اور اس سے کبھی منحرف نہیں ہوئے۔ حضرت علیؓ کے بارے میں بھی معلوم ہے کہ انھوں نے اس اصول کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس پر عمل پیرا بھی رہے۔ قتلِ عثمانؓ کے بعد جب ان سے خلافت قبول کرنے کی استدعا کی گئی تو انھوں نے تین دن تک صرف اس لیے یہ گراں بار ذمے داری کو قبول نہیں کیا کہ عوام کا رجحانِ طبع اچھی طرح معلوم کر لیں، جب دیکھا کہ لوگ ان کے سوا کسی طرف رُخ نہیں کر رہے ہیں، تب کہیں جا کر خلیفہ بننا منظور کیا۔ میں تو واقعۂ تحکیم کو بھی اسی روشنی میں دیکھتا ہوں اگر حضرت علیؓ حاکمیتِ عوام کو تسلیم نہ کرتے ہوتے تو اپنی رائے اور مرضی کے خلاف نہ تحکیم کا اصول قبول کرتے، نہ ابو موسیٰ اشعریؓ کو حکم بنانے پر راضی ہوتے۔

طبری کی روایت: حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں طبری نے لکھا ہے کہ: "ابو حنیفہؒ سے مروی ہے کہ جب تک اہلِ یمن کی بیعت کی اطلاع نہیں آگئی۔ اور اس اطلاع کے آنے میں چھ مہینے لگے، اس وقت تک حضرت ابوبکرؓ نے حقوقِ خلافت کا باقاعدہ استعمال نہیں فرمایا![۹۳]"

اس میں مصلحت یہ تھی کہ جملہ اقطاع سے خلافت کی توثیق ہو جائے اور سب لوگ اسے تسلیم کر لیں۔ بایں ہمہ آپ کے دورِ خلافت میں آپ پر نکتہ چینیاں بھی ہوئیں۔ ردّ و کد بھی ہوئی اور آپؓ نے کسی چیز کا بُرا نہیں مانا، بلکہ خوش دلی

اور فراخ حوصلگی کے ساتھ ان چیزوں کو برداشت کیا، آپؓ نکتہ چینی اور اختلاف و احتساب کو جانشین رسولؐ کی حیثیت سے روک نہیں سکتے تھے، کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ بھی یہی تھا، اور شاید یہی وجہ ہے کہ احتساب کو، اُمت کے لیے۔ بعض ائمہ نے فرض کفایہ قرار دیا ہے[۱۴]

حضرت عمرؓ کا مسلک: حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ نے خلافت کو زینت دی، حاکمیت عوام اور مسئولیت حاکم کے نظریے پر وہ بھی عامل رہے انھوں نے اپنی تقریر میں خود فرمایا تھا: "عام لوگ اس شخص کے تابع ہیں جسے انھوں نے والی حکومت قرار دیا ہے، اور جسے وہ پسند کرتے ہیں، اور جو والیٔ حکومت ہے، وہ ذی رائے اصحاب کا تابع ہے[۱۵]!"

ان الفاظ کی معنویت پر بطور خاص غور کرنا چاہیئے۔

حضرت عمرؓ جیسی ہستی کے منہ سے ان الفاظ کا نکلنا غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے اس ارشاد کا مطلب اس کے سوا اور کیا لیا جا سکتا ہے کہ خلیفہ مطلق العنان نہیں ہوتا۔ وہ نہ صرف شوریٰ پر مجبور ہے بلکہ اصحاب شوریٰ کے فیصلے کے آگے سر جھکانے پر بھی مجبور ہے۔ عوام اگر امور معروفہ میں اس کے "تابع" ہیں۔ تو وہ بھی اصحاب شوریٰ کا "تابع" ہے۔ اس دوہری تابعیت کا پیکر خلافت ہے۔

عمر ابوالنصر نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے جہاں اور باتیں لکھی ہیں، وہاں ایک ایک بات بڑی نتیجہ خیز اور اہم بھی لکھی ہے:

عوام کے افکار و آرا کا اثر تشکیل حکومت پر: "قتل عثمانؓ نے اس مسئلے کا فیصلہ کر دیا، کہ عوام کے سیاسی افکار و آرا، حکومت کی تشکیل میں کافی اثر رکھتے ہیں، یہ ایک ایسا جدید سیاسی نظام تھا، جو ان جماعتوں کی نفسیات سے بہت قریب تھا، جو اسلام میں داخل ہوتی تھیں۔ کیونکہ جمہوری نظام ہی انھیں ایک نظام نظر آیا جس میں ان کے حقوق محفوظ رہ سکتے تھے اور اُن کے افرادِ قبیلہ اور خاندان کی

تمیز تخصیص کے بغیر مسندِ خلافت پر پہنچ سکتے تھے۔ اس نظامِ جدید کی رُو کوئی مسلمان بھی خلافت کا امیدوار اور سزاوار قرار دیا جا سکتا تھا، جس طرح رائے عامہ کسی خلیفہ کو معزول کر سکتی تھی، اسی طرح رائے عامہ کے بل پر خلیفہ بن بھی سکتا تھا[۶]۔

لیکن خوارج کی یہ صرف اپج نہ تھی، بلکہ ان کی یہ روش اسلام سے قریب تر بھی تھی۔ دوسرے معاملات میں خوارج نے خواہ کتنی ہی ٹھوکریں کھائی ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے منصبِ خلافت کے لیے خاندان اور قوم کی تخصیص مٹا کر ایک بہت بڑا اسلامی فریضہ انجام دیا تھا، اسے یقیناً ان کا وسیع ترین کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

امام ابو یوسفؒ کا خطاب ہارون رشید سے: امام ابو یوسفؒ نے جو امام ابو حنیفہؒ کے اجل تلامذہ میں تھے اپنی کتاب میں خلیفہ ہارون رشید کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ اپنے ملک کا مالک نہیں، بلکہ مالک تو صرف خدا ہے، اور وہ محض خدا کا خلیفہ ہے[۷]!

اور ظاہر ہے خلیفہ یا نائب بطورِ خود کچھ نہیں کر سکتا، اس کی پالیسی، اس کا نظم و نسق، اس کا اصولِ حکومت، اس کا طریقِ کار، غرض ہر چیز وہی ہوگی، جو اصل مالک کے منشا اور مرضی کے مطابق ہو، اور اگر اس کے خلاف ہوگی تو وہ اپنے منصب کا استحقاق کھو بیٹھے گا، پس خلیفہ جب خدا کا خلیفہ ٹھہرا تو وہ ان احکام و حدود سے رُوگرداں اور منحرف نہیں ہو سکتا، جو خدائے بزرگ و برتر نے نازل فرمائے ہیں۔ جب تک ٹھیک ٹھیک وہ ان پر عمل کرتا ہے، سمع و طاعت، سب کا فرض ہے لیکن اگر اس راہِ صواب سے سرِ مو بھی منحرف ہوتا ہے تو اس کا احتساب بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر وہ اپنی غلط کاری پر مُصر رہے تو معزول بھی کیا جا سکتا ہے!

حالات کی تبدیلی کے ساتھ نظام و دستور کی تبدیلی: البتہ یہ ضرور ہے کہ حالات بدلتے رہتے ہیں اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ نظام و

دستور میں بھی تبدیلی ناگزیر ہے۔ اسلام میں اس چیز کو بہ طریقِ احسن پیشِ نظر رکھا گیا ہے، اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اصولی اور بنیادی باتیں تو بتادی ہیں، لیکن اجمال کی تفصیل خود امت پر چھوڑ دی ہے کہ حالات و مقتضیات زمانہ کے مطابق اسی خاکے میں وہ خود رنگ بھر لے۔

علامہ عبدالوہاب خلاف نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے یہی خیال ظاہر کیا ہے، چنانچہ شوریٰ کے موضوع کو زیرِ بحث لاتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"خدا نے شوریٰ کا حکم دیا ہے، لیکن اس کی تفصیل کے بارے میں خاموشی اختیار فرمائی ہے، تاکہ ہر امت کے ارباب کار اپنے احوال و ماحول کی مناسبت سے اسے خود مرتب کریں، چنانچہ اس اصول کی رُو سے انھیں حق ہے کہ وہ اپنے آدمیوں کے لیے ایک نظامِ انتخاب قائم کریں۔ اس کے شرائط لازمہ طے کریں کہ کون منتخب ہوگا، کس طرح منتخب ہوگا، انتخاب کی صورت اور نوعیت کیا ہوگی؟ وغیرہ وغیرہ۔

نظامِ مسئولیت: یہی حال نظام مسئولیت کا ہے، حاکمِ اعلیٰ امت کے سامنے مسئول اور جواب دہ ہے، لیکن اس مسئولیت کی تفصیل نہیں فرمائی گئی ہے، یہ تفصیل چھوڑ دی گئی ہے، یہ بھی اس لیے کہ ہر امت خود اپنے حالات و ماحول کے مطابق اسے وضع کرے[۵۸]

لیکن اپنے حالات اور ماحول کے مطابق، شوریٰ کی جو تفصیل وہ مرتب کرے گی، ظاہر ہے لازمی طور پر وہ کتاب و سنت کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتی کہ حرفِ آخر کی حیثیت اسی کو حاصل ہے:

طاعت "حق" کے ساتھ محصور ہے! تعمیل حکم یعنی مسئلہ طاعت کو اسی لیے شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے "حق" کے ساتھ محصور کر دیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرے بعد تم پر حکام متعین ہوں گے، نیک اپنی نیکی کے ساتھ، اور بد اپنی بدی کے

ساتھ، مگر تم لوگ ان کے اس حکم کی جو "حق" کے موافق ہو، تعمیل کرو[۹]!

حاکمیت عوام کی شرعی و دینی حیثیت کا اندازہ حضرت خالدؓ کے ایک قول سے ہو سکتا ہے۔

خالدؓ بن ولید کا استغاثہ عامۂ مسلمین کی عدالت میں: حضرت عمرؓ نے جب حضرت خالدؓ سیف اللہ کو معزول کیا تو گو انھوں نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنے منصب سے علیحدگی اختیار کر لی، لیکن جب مدینۂ منورہ تشریف لائے اور حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی، تو صاف الفاظ میں رو در رو فرما دیا گیا:

"جو سلوک تم نے میرے ساتھ کیا، وہ حق و انصاف سے دور ہے، بہ خدا میں عامۂ مسلمین کے سامنے اس مسئلے کو پیش کروں گا! اور ان سے اس تعدی کا مداوا چاہوں گا![۱۰]"

اور کوئی شبہ نہیں، حضرت خالدؓ کو اس کا حق تھا!

ماوردی کے نزدیک خلیفہ کو غالب ترین اکثریت کا معتمد ہونا چاہیے: اور یہ حق اس خلیفہ کے خلاف ہے جسے متفقہ طور پر یا غالب اکثریت سے عامۂ مسلمین نے یہ منصب سونپا ہو۔ کیونکہ جب تک یہ صورت نہ ہو، نہ امامت مکمل ہوتی ہے نہ خلافت، جیسا کہ علامہ ماوردی نے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے وضاحت اور صراحت کے ساتھ تحریر فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"امیر یا خلیفہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ متفقہ یا (کم از کم) بہت بڑی اکثریت کا معتمد ہو۔

علماء کا ایک گروہ کہتا ہے کہ جب تک ہر شہر کے ارباب حل و عقد اسے اختیار نہ کریں، امام نہیں ہو سکتا، اس شرط کو وہ اس لیے ضروری سمجھتا ہے۔ تاکہ اس کی امامت کو سب لوگ پسند کریں، اور متفقہ طور پر امامت کو اس کے سپرد کر دیں[۱۱]"

حاکمیت عوام اور مسئولیت حاکم کی ایک مثال حضرت عثمانؓ ذو النورین

کا عہدِ خلافت بھی ہے :۔

حضرت عثمان رض کی فکر و رائے پر جب مروان وغیرہ نے غلبہ حاصل کر کے معاملات کو زیادہ سے زیادہ ابتر کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا تو مسلمانوں میں بے چینی پھیلی، اور وہ بار بار سختی اور درشتی کے ساتھ ان کی حکومت کے خلاف تنقید کرنے لگے، حضرت عثمان رض نے کبھی کسی کا حق تنقید نہیں چھینا، بلکہ ہر نکتہ چینی کا جواب اپنے نقطۂ نظر سے دے کر لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ جب معاملات نے زیادہ تکلیف دہ اور خطرناک صورت اختیار کر لی تو ایک سے زائد بار انھوں نے حضرت علی رض کو واسطہ بنایا، اور عوام کے مطالبات خلوص اور سچائی کے ساتھ بادیدۂ پر نم تسلیم کر لیے۔ ظاہر ہے، اس کے بعد کسی اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن مروان نے اس طرح کی مساعی جمیلہ کو ہمیشہ ناکام بنا دیا، جب بھی حضرت عثمان رض ایک بات طے کر لیتے تھے تو مروان کو اس میں اپنا مفاد مجروح ہوتا نظر آتا تھا، اور کبھی وہ انھیں فریب دے کر، کبھی غلط فہمی میں مبتلا کر کے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا کرتا تھا۔

حضرت عثمان حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور عمرو بن العاص: یاد ہوگا حضرت عثمان رض کی خلافت تمام تر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی مرہون منت تھی۔ اگر حضرت علی رض نے ان سے کتاب و سنت کے ساتھ ساتھ اسوۂ شیخین رض پر چلنے کا وعدہ کر لیا ہوتا تو وہ بیعت کے لیے ہاتھ بڑھا ہی چکے تھے، فوراً کر لیتے۔ لیکن جب حضرت علی رض نے صرف کتاب و سنت اور اسوۂ شیخین کے ساتھ اپنے اجتہاد پر اصرار کیا تو عبدالرحمٰن رض بن عوف نے یہی سوال ——— تفصیل گذر چکی ہے ——— حضرت عثمان رض سے کیا۔ انھوں نے بے تامل وعدہ کر لیا۔ عبدالرحمٰن رح بن عوف نے اور ان کے فوراً بعد حضرت علی رض اور دوسرے اکابر صحابہ رض اور شہریانِ مدینہ نے بیعت کر لی۔ لیکن جب عبدالرحمٰن رض بن عوف کے کانوں تک حضرت عثمان رض کی شکایتیں پہنچیں، اور انھیں مروان

کے واقعات بھی معلوم ہوتے، اور خود ان پر لوگ اعتراض کرنے لگے کہ یہ سب کچھ آپ ہی کی وجہ سے ہو رہا ہے تو وہ حضرت عثمان رضؓ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے سختی کے ساتھ باز پرس کی اور زندگی بھر کے لیے ان سے قطع تعلق کر لیا۔ حد یہ ہے کہ جب مرض الموت میں مبتلا ہوتے، اور حضرت عثمان رضؓ بطور عیادت تشریف لے گئے، تب بھی نہ آنکھ ملائی، نہ رُخ ان کی طرف کیا، نہ گفتگو کی، اس لیے کہ مروان نے نظام خلافت میں جو ابتری پھیلائی تھی، اس کا ذمے دار کسی نہ کسی درجے میں وہ حضرت عثمان رضؓ کو بھی سمجھتے تھے۔۱۲؎

اسی طرح عمرو رضؓ بن العاص ــــ جو بعد میں امیر معاویہ رضؓ کے دست راست بن گئے ــــ نے بھی حد درجہ تند و تلخ لب و لہجہ میں حضرت عثمان رضؓ سے گفتگو کی، اور بہ الفاظ واضح انھیں مشورہ دیا کہ یا تو وہ حالات سازگار بنائیں، یا پھر منصب خلافت سے دست بردار ہو جائیں۔۱۳؎

اُوپر جو واقعات پیش کیے گئے ہیں، ان سے یہ بات اچھی طرح صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ عوام کی حاکمیت اور بالادستی، اور حاکم کی مسئولیت اور جواب دہی ایک اٹل حقیقت اور مسلّمہ امر ہے، جسے اگر اسلام کی روح کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ایسی روح جس پر اسلام کی عمارت استوار ہے!

ماخذ:

۱؎ سورۂ ہود، پارہ ۱۲، رکوع ۱۰، آیت ۸۸

۲؎ سورۂ انبیاء، رکوع ۵، آیت ۸۲

۳؎ الطبری، ج ۱، ۴، ص ۲۴۴۰

۴؎ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۳۱۵)

۵؎ الطبری ج ۱، ج ۴ (واقعات سنہ ۳۴ھ)

ے۶ تاریخ خوارج (عمر ابوالنصر) طبع بیروت، ص ۵۹،

ے۷ کتاب الخراج (امام ابویوسفؒ) طبع مصر، ص ۵ -

ے۸ السیاسۃ الشرعیہ (علامہ خلاف) طبع مصر، ص ۹۰، ۹۱ -

ے۹ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۱۴ -

ے۱۰ الطبری، ج ۱، ۴ (واقعات عہد عمرؓ)

ے۱۱ الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۱۴ -

ے۱۲ عقد الفرید، ج ۳، ص ۷۶ -

ے۱۳ طبقات ابن سعد، ج ۷، ص ۱۶۷ ؛

(۱۷)

پاکستان: ایک اسلامی جمہوریت!

قائد اعظم کے ارشادات کی روشنی میں!

قائد اعظم کی فکری دیانت اپنی مثال آپ تھی۔ اُن کے افکار و خیالات سے بعض لوگوں نے اختلاف کیا، لیکن بدترین مخالف کو بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ اُن پر سیاسی منافقت کا الزام لگا سکتا۔ اُن کی زبان سے وہی بات نکلتی تھی جو واقعی اُن کے دل میں آتی تھی، اور جو کچھ وہ کہہ دیتے تھے اس پر ثابت قدمی کے ساتھ قائم رہتے تھے۔ اصول کی خاطر ہر دل عزیزی، مقبولیتِ عامہ اور قیادت کے تاجِ زریں کو بھی داؤں پر لگا دینے میں ذرا نہ ہچکچاتے تھے۔ بہ ظاہر وہ اسلام سے بیگانہ اور اسلامی اقدار سے ناواقف تھے ــــ یہ بات اس زمانے کی ہے جب انھوں نے سیاسی میدان میں پہلے پہل قدم رکھا تھا ــــ لیکن اسلامی عصبیت اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھی، اور اسی نے ان کا خاتمہ بالخیر کیا، اور وہ دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک کے خالق اور معمار بن گئے۔

ایک اسلامی تجویز یعنی وقف علی الاولاد: امپریل اسمبلی میں ان کی پہلی تقریر اسی کی حمایت میں تھی اور بالآخر وقف علی الاولاد کو قانونی شکل دینے کا کام بھی انہی کے ہاتھ سے سر انجام پایا۔ بعد ازاں ان کی اسلامی عصبیت کا سب سے بڑا ثبوت لکھنؤ ہے اور کانگریس کے چوٹی کے لیڈر تھے، فرقہ پرستی سے بہت بلند تھے۔ سروجنی نائیڈو کے الفاظ میں سفیر صلح تھے، لیکن ملّتِ اسلامیہ کی انفرادیت سے

دست بردار ہونے کو کبھی اور کسی حالت میں تیار نہیں ہوتے۔

ہندو مسلم اتحاد: اور وحدتِ ہند برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے غیر معمولی جدوجہد کی، لیکن نہرو رپورٹ کے بعد انھیں یقین ہو گیا کہ مسلمانوں پر ہندو اکثریت اپنی بالادستی مسلّط کرنے پر تل گئی ہے، اور اس بات کو گوارا کر لینا اُن کے اسلامی ذہن اور مزاج کے بالکل خلاف تھا۔ وہ مسلمانوں کی انفرادیت کے تحفظ کے لیے آمادۂ جہد و عمل ہو گئے۔ انھوں نے ۲۷ء میں جو چودہ نکات مولانا محمد علی کے مشورے سے پیش کیے تھے وہ ہندو مسلم قضیے کا بہترین حل تھا۔ اس وقت کے صدر کانگرس سری نواس آئنگر نے بھی انھیں قبول کر لیا تھا، لیکن موتی لال نے اپنی رپورٹ میں ان نکات کو یکسر مسترد کر دیا۔ اور جب موتی لال نے مرکزی اسمبلی میں حکومت کو متنبہ کیا کہ وہ اس دستور اساسی کو اگر قبول نہیں کرتی تو جنگ کے لیے اسے تیار ہو جانا چاہیے، قائدِ اعظم فوراً اُٹھے اور انھوں نے موتی لال کو ٹوکا، یہ متفقہ دستور نہیں ہے، مسلمان اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔

پھر ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس منعقدۂ لندن میں انھوں نے حالات کو رہ براہ کرنے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکے، آخر دل برداشتہ ہو کر وطن کی اقامت ترک کر کے لندن کے مکین بن گئے۔ مسلمانوں نے انھیں وہاں رہنے نہ دیا۔ اصرار کر کے بلایا، اور قیادتِ عظمیٰ کی مسند پر متمکن کر دیا۔

۱۹۳۵ء میں قائدِ اعظم نے مسلم لیگ کا احیاء کیا، اور ایک مرتبہ پھر کوشش کی کہ کانگرس مسلمانوں کے مطالبات مان لے، اور ہندوستان کی یہ دونوں بڑی قومیں امن و عافیت کی زندگی بسر کرنے کی خوگر ہو جائیں۔ وہ مسلمانوں کو اقلیت ماننے پر کسی طرح تیار نہیں تھے۔ وہ ایک مستقل قوم کو جو اپنا مخصوص دستور حیات اور نظامِ زندگی رکھتی تھی کس طرح اقلیت مان لیتے؟ بات یہیں سے بڑھی اور مطالبہ پاکستان پر ختم ہوئی۔

قائدِ اعظم نہ عالمِ دین تھے، نہ مورخ اسلام، نہ صوفی باصفا تھے، نہ مبلّغ

دین متین، وہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ایک فرد تھے، اور اس طبقے کی اکثریت کا دینی رجحان رکھنے والے طبقات و عناصر سے کوئی ربط ضبط نہیں تھا، لہٰذا بہ ظاہر پاکستان کے بارے میں ان کا تصور بھی یہی ہو سکتا تھا کہ وہ ایک ایسا آزاد ملک ہوگا جہاں رائج الوقت سیاسی نظام نافذ ہوگا، یعنی قیصر الگ اور کلیسا الگ جہاں مذہب ایک ذاتی اور نجی چیز ہوگی، اور نظام سیاست کی بالادستی عمومی، اور اجتماعی طور پر نافذ ہوگی۔

لیکن جیسا کہ ابھی اوپر عرض کیا گیا قائداعظم مذہبی آدمی نہ ہونے کے باوجود مذہبی عصبیت سے بھرپور تھے۔ انھوں نے جب مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کا خاکہ اپنے ذہن میں تیار کیا تو بہت جلد محسوس کر لیا کہ اس مجوزہ مملکت کی صلاح و فلاح صرف اسی طرح ممکن ہے کہ اس کی بنیاد اسلام اور صرف اسلام پر ہو۔

لیکن اسلام کیا ہے؟ اس کی تعلیم کیا ہے؟ اس کی روایات کیا ہیں؟ اس کی تاریخ کیا ہے؟ اس کے قائم کیے ہوئے اقدار کیا ہیں۔ ان چیزوں پر ابھی تک انھوں نے پورے طور پر غور نہیں کیا تھا، چنانچہ ان کی ابتدائی تقریروں میں ابہام زیادہ ہے تشریح کم۔ وہ نعرے کے طور پر، یا سیاسی اسٹنٹ کے طور پر اس لفظ کو استعمال کرنا نہیں چاہتے تھے۔ رفتہ رفتہ جب اسلام سے متعلق ان کی معلومات وسیع ہوئے اور وہ اس کی تاریخ اور روایات سے آشنا ہو گئے تو انھوں نے صاف، واضح اور غیر مشتبہ الفاظ میں اعلان کیا کہ پاکستان میں جو جمہوریت نافذ ہوگی، وہ خالص اسلامی ہوگی۔ یہ ایک ایسا اعلان تھا جس کی جرأت عالم اسلام میں سے کسی ملک نے اب تک نہیں کی تھی، کئی اسلامی ممالک میں جمہوریت تو رائج تھی لیکن "اسلامی جمہوریت" تو کہیں بھی نافذ نہیں — اس اعلان نے قدرۃً ہندوؤں اور بعض تہذیب جدید کے پرستار نیشنلسٹ مسلمانوں کو اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کر دیا۔ ان کی طرف سے تابڑ توڑ حملے ہوتے، اعتراضات کیے گئے، مذاق اڑایا گیا لیکن وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پہ جمے رہے۔ وہ ٹوٹ سکتے تھے، لچک نہیں

سکتے تھے، اُن کی آن کا یہ عالم تھا کہ گلاب کا پھول توڑنے کے لیے بھی وہ جھک نہیں سکتے تھے، اسی آن کے ساتھ وہ اپنے اعلان پر قائم رہے، اور وقتاً فوقتاً اسلامی جمہوریت کی تصریح و توضیح کرتے رہے۔ وہ مغربی نظام جمہوریت کے سخت مخالف تھے۔ دنیا کے دکھ کا، اور خاص طور پر اپنے ملی دکھ کا مداوا انھیں صرف اسلامی جمہوریت ہی کی صورت میں نظر آتا تھا۔

رائج الوقت جمہوریت، تمام تر مادی عناصر پر قائم ہے۔ روحانی عناصر کا اس میں فقدان ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں نفاق بھی ہے، دروغ بھی، تشدد بھی، خود غرضی بھی، دوسروں کے مفاد سے بے نیازی بھی۔ اس کے برعکس اسلامی جمہوریت، ایک مقدس اور طاہر و طیب نظام ہے جو ظلم کا روادار نہیں، جو جبر کا خوگر نہیں، جو اقلیت کو وہ تمام شہری حقوق عطا کرتا ہے، جو اپنے افراد قوم کو دیتا ہے۔ وہ عہد شکنی نہیں کرتا، دروغ مصلحت آمیز کو شعار نہیں بناتا۔ اس کی بنیاد صرف راستی پر ہے، حق و صداقت سے وہ کبھی اور کسی حالت میں منحرف نہیں ہو سکتا۔ قائداعظم پر جیسے جیسے یہ حقیقت منکشف ہوتی گئی۔ اسلامی جمہوریت پر اُن کا ایمان پختہ ہو گیا۔ وہ زیادہ جوش اور عزم کے ساتھ، اسلامی جمہوریت کا پرچم بلند کرنے لگے۔

اپریل ۱۹۴۱ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس مدارس کا خطبۂ صدارت ارشاد کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

"ہم مسلمان دنیا کی کسی مہذب حکومت سے پیچھے نہ ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ جب وقت آئے گا تو ہمارے منطقے کی اقلیتیں دیکھیں گی کہ مسلمان عام نہ صرف منصف ہیں بلکہ فیاض بھی، اور ایسا کیوں نہ ہو، اسلام کے روایات ہی ایسے ہیں، اسلام یہی سکھاتا ہے، اور اس نے اپنے پیروؤں کو ایسی ہی وراثت دی ہے۔"

۱۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی مسلم کنونشن میں ایک حلف نامے پر قائداعظم،

اور دوسرے مسلم لیگی رہنماؤں نے دستخط کیے۔ اس حلف نامے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قائد اعظم کا تصور پاکستان دنیاوی تھا یا دینی؟ حلف نامہ یوں شروع ہوتا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین o "میں اپنے اس پختہ عقیدہ کا اعلان کرتا ہوں کہ برکوچک ہند میں بسنے والی مسلم قوم کی نجات اس کی سلامتی، اس کا تحفظ، اور اس کا مستقبل صرف حصول پاکستان میں مضمر ہے۔ میں بہ صمیم قلب اقرار کرتا ہوں کہ اس مقصد عزیز یعنی پاکستان کو حاصل کرنے کے لیے اس راہ میں جو خطرات اور آزمائشیں پیش آئیں گی، اور جن قربانیوں کا مطالبہ ہوگا انھیں برداشت کروں گا۔ ربنا افرغ علینا صبرا و ثبت اقدامنا و انصرنا علی الکافرین"۔

یہ حلف نامہ کیا کسی دنیاوی حکومت کے لیے ہو سکتا ہے؟ جس کی ابتدا اور انتہا آیات قرآنی سے ہو، ظاہر ہے اس کا منتہائے نظر صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے۔

۱۱ر نومبر ۱۹۴۶ء کو مسلمانان بہار کے قتل عام سے متاثر ہو کر قائد اعظم نے ایک بیان دیا، یہ بیان ایک سیاسی مدبر کا نہیں، ایک مرد مومن کا ہے۔ فرمایا:۔

"مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں، ان سے ہمارا کلیجہ چھلنی ہو رہا ہے۔ مگر ہم مسلم اکثریت والے صوبوں میں بے گناہ ہندوؤں کو مار کر اپنا دل ٹھنڈا نہیں کریں گے۔ پاکستان میں غیر مسلم اپنی جان و مال اور عزت کی حفاظت خود مسلمانوں سے بڑھ کر پائیں گے۔ میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ جہاں کہیں اکثریت میں ہوں غیر مسلموں کی حفاظت جان و مال کے لیے جو کچھ بھی ممکن ہو کریں"۔

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اختیارات حکومت پاکستان کی نئی حکومت کو منتقل کیے تو پاکستان کے گورنر جنرل قائد اعظم سے مخاطب ہوتے ہوئے انھیں شہنشاہ اکبر کے روادارانہ نقش قدم پر چلنے کی تلقین کی۔ اس کا جواب اسلامی حکومت کے سربراہ نے ان الفاظ میں دیا:

"شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس خیرسگالی اور رواداری کا برتاؤ کیا۔ اس کی ابتداء آج سے تیرہ سو سال پہلے ہی ہمارے رسولؐ نے کر دی تھی۔ انھوں نے زبان ہی سے نہیں بلکہ عمل سے بھی، یہود و نصاریٰ پر فتح حاصل کرنے کے بعد نہایت اچھا سلوک کیا۔ ان کے ساتھ رواداری برتی، اور ان کے قائدین کا احترام کیا مسلمان جہاں کہیں بھی حکمران رہے۔ انھوں نے اس طرح حکومت کی، ان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور عظیم المرتبت اصولوں سے معمور ملے گی جن کی ہم سب کو تقلید کرنی چاہیئے!"

جس سربراہِ مملکت کے یہ خیالات ہوں وہ اسلامی حکومت کے سوا اور کسی طرح کی حکومت قائم کرنے کا تصوّر بھی کر سکتا تھا؟

۲۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو قائدِ اعظم نے ہندوستان کے فسادات اور مسلمانوں کی ہلاکت سے متاثر ہو کر ایک بیان دیا۔ جسے اگر عہد آفرین کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ انھوں نے ارشاد فرمایا:

"میں پاکستان کے ہر مسلمان مرد اور عورت سے کہتا ہوں کہ وہ موجودہ غم و اندوہ کے سیلاب میں نہ بہ جائیں۔ انھوں نے اپنی قومی حکومت قائم کرنے کے لیے بہت دکھ اٹھائے ہیں، اور قربانیاں دی ہیں۔ اب یہ انھی کا کام ہے کہ اس کی تعمیر کریں۔ صرف اسی صورت میں ہم اس قتل و غارت گری کا جو ہمارے بھائیوں کے ساتھ دوسری طرف کی جا رہی ہے بہترین بدلہ لے سکتے ہیں۔!"

۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو افسرانِ حکومت سے خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے پاکستان کے نظامِ حکومت کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے فرمایا:

"اپنے لیے ایک مملکت قائم کرنا ہی ہمارا مقصد نہیں تھا، بلکہ یہ ذریعہ تھا حصولِ مقصد کا۔ ہم ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں ہم اپنے روایات اور ثقافتی خصوصیات کے مطابق ترقی کر سکیں، جہاں اسلام کے عدل و انصاف اور مساوات کے اصولوں کو آزادی کے ساتھ بروئے عمل آنے کا موقعہ ہو۔!"

۱۴ر فروری ۱۹۴۸ء کو سبّی دربار (بلوچستان) میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے بات بالکل صاف کردی، انھوں نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اسوۂ حسنہ پہ چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے نبیؐ نے ہمارے لیے بنایا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں!"

پھر ۲۱ر فروری ۱۹۴۸ء کو افواج پاکستان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"فاشیت کے خطرات سے دنیا کو بچانے کی خاطر کرۂ ارض کے دُور دراز حصّوں میں جاکر آپ نے دادِ شجاعت دی ہے۔ مگر اب آپ کو اپنے ہی وطن عزیز کی سرزمین پر اسلامی جمہوریت، اسلامی معاشرتی عدل و مساوات اور اسلامی اصولوں کی پاسبانی کرنی ہے!"

یہی اسلامی جمہوریت تھی جس کے لیے قائداعظم کے بعد قائدِ ملّت سرگرم کار رہے۔ اور اب موجودہ صدر مملکت ساعی ہیں کہ پاکستان کی ترقی اور فلاح صرف اسی میں مضمر ہے!

(۲) قائدِ ملّت کی تصریحات کی روشنی میں! قائدِ ملّت لیاقت علی خان صحیح معنوں میں قائداعظم کے جانشین تھے، ان کا خلوص، تدبر، جذبۂ ایثار، مقصد کے لیے مر مٹنے کا جذبہ، یہ ساری چیزیں شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔

قائدِ ملّت اسی نقش قدم پر چلے، جو قائداعظم چھوڑ گئے تھے۔ پاکستان کو ایک جمہوری اور اسلامی ملک بنانے کی وہی دھن اور لگن ان میں بھی تھی جو قائداعظم میں پائی جاتی تھی۔ مادیت کے اس دَور میں روحانیت کا پیام، نام نہاد سہی، لیکن سیکولرازم کی حکومت مطلقہ کے اس عہد میں اسلامی حکومت کی تشکیل و تعمیر کا علی الاعلان اظہار بغیر کسی جھجک اور ندامت کے، بلکہ فخر و نازش کے ساتھ لیاقت علی خان ہی کا حصہ تھا۔

۷ مارچ ۱۹۴۹ء کو لیاقت علی خان نے پاکستان کی مجلس دستور ساز کے سامنے قرارداد مقاصد پیش کی۔ یہ تجویز بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی، اس نے ایک طرف تو پاکستان میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ دوسری طرف بھارت میں تہلکہ ڈال دیا، تیسری طرف فرنگی حکومتیں بھی یہ غیر متوقع اور نامانوس آواز سن کر چونک پڑیں۔

قرارداد کا متن: قرارداد کا متن یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی تمام کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے، اور اسی نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو حکمرانی کا اختیار اپنے مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمایا ہے۔ اور چونکہ یہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت ہے۔ لہٰذا:

جمہور پاکستان کی نمائندہ یہ مجلس دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد خود مختار مملکت پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کیا جائے جس کی رو سے جملہ حقوق اور اختیارات حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ استعمال کیے جائیں گے اس دستور میں جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصول کی جس طرح اسلام نے تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے گا۔ جس کی رو سے لازماً مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات ومقتضیات جو کتاب وسنت میں متعین ہیں ترتیب دے سکیں، جس کی رو سے اس امر کا قرار واقعی انتظام کیا جائے گا کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی عقائد پر قائم رہ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافت کو ترقی دے سکیں۔

جس کی رو سے وہ علاقے جو اب پاکستان میں داخل ہیں یا شامل ہو گئے ہیں، اور ایسے دیگر علاقے جو آئندہ پاکستان میں داخل یا شامل ہو جائیں ایک وفاق بنائیں جس کے ارکان مقرر کردہ حدود اربعہ اور معینہ اختیارات کے ساتھ داخلی طور پر خود مختار ہوں۔

جس کی رُو سے بنیادی حقوق کی ضمانت کی جائے اور ان حقوق میں قانون و اخلاق عامہ کے تحت مساوات حیثیت و مواقع، قانون کی نظر میں برابری، عمرانی، اقتصادی اور سیاسی اظہار خیال، اظہار عقائد، عبادات اور اجتماع کی آزادی شامل ہو۔

جس کی رُو سے اقلیتوں اور پس ماندہ پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے۔

جس کی رُو سے نظام عدل کی آزادی کامل طور پر محفوظ ہو۔

جس کی رُو سے وفاقی علاقوں کی سالمیت آزادی اور اُن جملہ حقوق کا جن میں اس بحر و بر اور فضا پر سیادت کے حقوق شامل ہیں تحفظ کیا جائے۔

تاکہ اہل پاکستان فلاح و خوش حالی کی زندگی بسر کر سکیں۔ اقوام عالم کی صف میں اپنا جائز اور ممتاز مقام حاصل کر سکیں، اور امن عالم کے قیام اور بنی نوع انسان کی ترقی و بہبود میں کماحقہٗ حصہ لے سکیں۔

تمہیدی تقریر: قرارداد مقاصد پیش کرتے ہوئے لیاقت علی خاں نے ایک منجھی اور سلجھی ہوئی تقریر کی ضروری ہے کہ اس کے اہم اجزا بھی پیش نظر رہیں۔

"میں اس موقع کو ملک کی زندگی میں بہت اہم سمجھتا ہوں، باعتبار اہمیت صرف حصول آزادی ہی سے ہمیں یہ موقع ملا کہ ہم ایک مملکت کی تعمیر اور اس کے نظام سیاست کی تشکیل اپنے نصب العین کے مطابق کر سکیں۔ میں ایوان کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ بابائے ملت قائداعظم نے اس مسئلے کے متعلق اپنے جذبات کا متعدد موقعوں پر اظہار کیا تھا۔ اور قوم نے ان کی تائید غیر مبہم الفاظ میں کی تھی، پاکستان اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ اس برصغیر کے مسلمان اپنی زندگی کی تعمیر اسلامی تعلیمات و روایات کے مطابق کرنا چاہتے تھے، اس لیے کہ وہ دنیا پر عملاً واضح کر دینا چاہتے تھے کہ آج حیات انسانی کو جو بیماریاں لگ گئی ہیں، ان سب کے لیے اسلام اکسیر اعظم کا حکم رکھتا ہے۔!"

اس معرکۃ الآرا تقریر میں لیاقت علی خان نے آگے چل کر ایک مومن کی شان اور ایک سپاہی کی آن کے ساتھ فرمایا:

"انسانی دماغ نے سائنسی ترقی اور ایجادات کی شکل میں جو جن اپنے اوپر مستولی کر لیا ہے اس سے نہ صرف انسانی معاشرے کے سارے نظام اور اس کے مادی ماحول کی تباہی کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے بلکہ اس مسکنِ خاکی یعنی دنیا کے بھی تباہ ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔

محض وجود باری کا احساس انسانیت کو تباہی سے بچا سکتا ہے جس کا منشا یہ ہے کہ انسان کو جو قوتیں حاصل ہیں ان سب کو ایسے اخلاقی معیاروں کے مطابق استعمال کرنا لازم ہے جو وحی سے فیضیاب ہونے والے ان معلموں نے متعین کئے ہیں جنھیں ہم مختلف مذاہب کے جلیل القدر پیغمبر سمجھتے ہیں!"

اور پھر اس کے بعد لیاقت علی خاں کے منہ سے وہ بول نکلے جو اُن جیسے مردِ مومن ہی کی زبان سے نکل سکتے تھے۔ فرمایا:

"ہم پاکستانی ہوتے ہوئے اس بات پر شرمندہ نہیں ہیں کہ ہماری غالب اکثریت مسلمان ہے اور ہمارا اعتقاد ہے کہ ہم اپنے ایمان اور مذہب پر قائم رہ کر ہی دنیا کی فوز و فلاح میں حقیقی اضافہ کر سکتے ہیں، ہم پاکستانیوں میں اتنی جرأتِ ایمان ہے کہ ہم اعلان کر دیں کہ تمام اقتدار اسلام کے قائم کردہ معیار کے مطابق استعمال کیا جائے، تاکہ اس کا غلط استعمال نہ ہو سکے۔!"

بادشاہت اور ملائیت کی نفی: اسی تقریر میں لیاقت علی خاں نے مزید ارشاد فرمایا:

"میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس سے ہماری ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ ہم حکمران اور بادشاہوں کے ظلِ الٰہی ہونے کے فرسودہ نظریے کو پھر سے زندہ کریں۔ خدا نے اختیارات سوا جمہور کے کسی اور کو تفویض نہیں کیے ہیں اور اس کا فیصلہ جمہور ہی کو کرنا ہو گا کہ یہ اقتدار کن لوگوں کے ذریعہ استعمال کیا جائے گا۔!"

اصطلاح میں تھیوکریسی کلیسائی حکومت کو کہتے ہیں یعنی برگزیدہ پادریوں کی حکومت میں اس امر پر جتنا بھی زور دوں کم ہوگا کہ یہ تصور اسلام سے قطعاً بعید ہے۔ اسلام ملائیت یا کسی حکومت مشائخ کو تسلیم نہیں کرتا، اس لیے اسلام میں تھیوکریسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص اب بھی پاکستان کے نظام حکومت کے ضمن میں تھیوکریسی کا ذکر کرتا ہے تو یا وہ شدید غلط فہمی کا شکار ہے، یا شرارت سے ہمیں بدنام کرنا چاہتا ہے۔

ہم جمہوریت کا لفظ جس وقت اس کے اسلامی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جمہوریت ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کا اعلان جتنا ہمارے نظام حکومت پر ہے اتنا ہی ہمارے معاشرے پر بھی ہے، کیونکہ اسلام نے دنیا کو جن عظیم الشان انعامات سے مالا مال کیا ہے ان میں ایک اہم انعام انسانی مساوات بھی ہے!"

اسلام کا احسان: اس کے بعد لیاقت علی خان نے اسلام کے ایک ایک اور احسانِ عظیم کا ذکر کیا ہے:

"اسلام نسل، رنگ اور نسب کے امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا، اسی طرح ہماری رواداری کی روایات بھی عظیم الشان ہیں، کیونکہ قرونِ وسطیٰ میں اقلیتوں کو کسی نظامِ حکومت کے تحت وہ مراعات حاصل نہیں ہوئیں جو مسلمان ملکوں میں انھیں حاصل تھیں۔

جس زمانے میں کلیسا سے اختلاف رکھنے والے مسیحیوں اور محکوم مسلمانوں کو اذیتیں دی جاتی تھیں اور انھیں گھروں سے نکالا جاتا تھا، اور جب انھیں جانوروں کی طرح شکار کیا جاتا تھا، اور مذہبی مجرم قرار دے کر زندہ جلا دیا جاتا تھا؛ اسلامی حکومتیں ان سب کا مأمن و ملجا ثابت ہوئیں جو تنگ آکر بھاگ نکلنے پر مجبور ہوئے تھے۔ تاریخ کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ جب سامیوں سے نفرت کے سبب بہت سے یہودیوں کو یورپ کے ممالک سے نکال دیا گیا تو سلطنت عثمانیہ (ترکیہ) نے انھیں

اپنے ہاں پناہ دی۔

مسلمانوں کی رواداری : مزید فرمایا: "ہندوستان کے اس برصغیر میں جہاں کبھی مسلمانوں کو لامحدود اختیارات حاصل تھے غیر مسلموں کے حقوق کا بطور خاص پاس ولحاظ رکھا گیا، اور ان کا ہمیشہ تحفظ کیا گیا۔

مسلمانوں ہی کی سرپرستی میں ہندوستان کی بہت سی زبانوں کو فروغ حاصل ہوا میرے بنگال سے آنے والے دوستوں کو یاد ہوگا کہ یہ صرف مسلمان حکمرانوں کی حوصلہ افزائی ہی کا نتیجہ تھا کہ سب سے پہلے ہندوؤں کی مقدس کتابوں کا ترجمہ سنسکرت سے بنگالی میں کیا گیا۔

عدلِ عمرانی : اس اہم موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لیاقت علی خان نے کہا:

"جہاں تک عدل عمرانی کا تعلق ہے میں کہوں گا کہ اسلام اس میں نمایاں اضافہ کرتا ہے۔ اسلام ایک ایسے معاشرے کے قیام کا حامی ہے جس میں عدل عمرانی کا تصوّر نہ خیرات پر مبنی ہے نہ تشدد پر، اسلام جو عمرانی عدل قائم کرنا چاہتا ہے وہ ان بنیادی ضابطوں اور تصورات پر مبنی ہے جو انسان کی زندگی کو احتیاج سے پاک رکھنے کے ضامن ہیں۔

اسلام اور مسلم حکومت : لیاقت علی خان کی یہ تقریر ایک ایسی دستاویز ہے جو ہمیشہ رہنما کا کام دے گی۔ اسی تقریر میں انھوں نے فرمایا:

"اس قرارداد کی ایک دفعہ یہ ہے کہ لازماً مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو کتاب وسنت میں متعین ہیں ترتیب دے سکیں۔

اگر مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی زندگی اپنے مذہب کے قالب میں ڈھال لیں تو اس پر کسی غیر مسلم کو اعتراض نہ ہونا چاہیے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ قائداعظم نے ہمیشہ واضح اور غیر مبہم اعلانات کیے کہ قیام

پاکستان کا مطالبہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ مسلمانوں کے ہاں اپنا خاص طریق زندگی اور ضابطۂ اخلاق موجود ہے، اسلام ذاتی عقائد اور اخلاق کا نام نہیں ہے بلکہ وہ اپنے پیرؤوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کریں جس کا مقصدِ حیات صالح ہو۔ اسلام نے صالح زندگی کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی اساس روحانی اقدار پر قائم ہے۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں ہو سکتا جس کا اس پر ایمان نہ ہو کہ کلام اللہ اور اسوۂ رسول ہی اس کے روحانی فیضان کے بنیادی سرچشمے ہیں۔

غیر مسلموں کے حقوق: ضروری تھا کہ اسلامی جمہوریت میں غیر مسلموں کے حقوق کی بھی ذمہ دارانہ طور پر وضاحت کر دی جاتی، چنانچہ لیاقت علی خان نے یہ فریضہ انجام دیا۔ انھوں نے کہا:

"ایک اسلامی معاشرہ تعمیر کرنے کے مقصد میں ہم نے غیر مسلموں کے حقوق کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اگر ہم اقلیتوں کی آزادی میں مداخلت کی کوشش کرتے تو یہ ایک غیر اسلامی فعل ہوتا، اقلیتوں کو اپنے مذہب پر چلنے، اس کی حفاظت کرنے یا اپنی ثقافت کو فروغ دینے سے کسی طرح روکا نہیں جائے گا۔"

بنیادی حقوق: بنیادی حقوق کے مسئلے پر بھی لیاقت علی خان نے اظہارِ خیال کیا:

"بنیادی حقوق کے تحفظ کا یقین دلانا بھی ایک رسم سی ہو گئی ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ ہم ایک ہاتھ سے حقوق دیں۔ اور دوسرے سے واپس لے لیں۔

ہم بار بار اعلان کر چکے ہیں کہ پاکستان مفاد پرستوں اور دولت مندوں کے لیے نہیں بنا ہے۔ ہمارا مقصد اقتصادی نظام کو اسلام کے بنیادی اصولوں پر تعمیر کرنا ہے، کیونکہ یہ دولت کی بہتر تقسیم اور ناداری کو یکسر رفع کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

لذّت تقریر: لیاقت علی خان کی اس تقریر کو پڑھیے۔ آپ محسوس کریں گے کہ یہ آواز ایک آنریبل پرائم منسٹر سے زیادہ ایک مبلغ اسلام کی ہے۔ یہ آواز بازگشت ہے اس نعرۂ مستانہ کی جو محمد علی جیسے مردِ قلندر نے بلند کیا تھا، جسے اقبال کے شعروں نے دنیا کے بام و در تک پہنچایا تھا، جسے ابوالکلام کے الہلال نے ایک نقش لازوال بنا کر قلب مسلمان میں مرتسم کر دیا تھا۔

نکتہ چینیاں اور ان کا جواب: اس تقریر پر جہاں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے جذبات تبریک و ستائش پیش کیے، وہاں چند مسلم، اور اکثر غیر مسلم ممبروں نے حقیقت حال کو سمجھے بغیر نہایت تند الفاظ میں اس پر نکتہ چینیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا، خاص طور پر ہندو ممبروں بہت زیادہ احتجاج کیا۔

۲۱ مارچ ۱۹۴۹ء کو لیاقت علی خان نے قرارداد مقاصد کے متعلق اپنی آخری اور جوابی تقریر میں فرمایا:

"میں اپنے معزز دوست لیڈر کانگرس پارٹی[۱] کی تقریر کامل توجہ سے سنی۔ میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں جو کچھ کہوں گا وہ کامل احساس، ذمے داری اور مکمل خلوص کے ساتھ کہوں گا۔"

علماء کا ذکر: "میرے معزز دوست لیڈر کانگرس پارٹی نے چند علماء سے ملاقات فرمائی لیکن، موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ علمائے مذکور، موصوف سے استفادہ علمی کرنے آئے تھے، یا موصوف خود اس غرض سے ان علماء کے پاس تشریف لے گئے تھے؟

چلیے میں مان لیتا ہوں کہ حسب بیان موصوف لاہور سے چند علماء بطور خود ان سے ملنے آئے تھے، اور اپنے کچھ مطبوعات انھیں دیے گئے، جنھیں دیکھ کر شاید میرے محترم دوست گھبرا گئے۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ یہ ملاقات کیوں کی گئی اور یہ لٹریچر انھیں کیوں دیا گیا، یہ نام نہاد علماء آپ سے اس لیے

---

[۱] مسٹر سرِش چندر چٹوپادھیا، لیڈر کانگرس پارٹی۔

ملنے آئے تھے کہ آپ کے دل میں مسلمانوں کی نیک نیتی کے متعلق شبہات پیدا کردیں خدارا ایسے شرانگیز پراپیگنڈے کی طرف قطعی توجہ نہ دیجیے، مَیں اس تخریبی عنصر کو جو پاکستان کی بربادی پر تلا ہوا ہے متنبہ کردینا چاہتا ہوں کہ ہم اب ان کی حرکات کو ہرگز برداشت نہ کریں گے۔ انھوں نے آپ کے سامنے اسلام کے صحیح نظریے کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے اگرچہ وہ اسلام کے دوست اور حامی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن حقیقتاً اسلام کے دشمن ہیں۔!

مساوات: میرے معزز دوست نے فرمایا کہ ہم مساوات کا ذکر کرتے ہیں، اور مساوات کے بارے میں بھی ان نام نہاد علما نے ان کو بہکایا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ موصوف ایک پرانے تجربہ کار انسان ہونے کے باوجود مذکورہ شخصیتوں کی باتوں پر تو نہایت آسانی سے یقین کرلیتے ہیں اور نہیں سچ سمجھتے تو ان باتوں کو جو ہم اور مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے فاضل عالمِ اسلام کے متعلق ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

موصوف نے قرارداد کی ترجمانی نہایت نامناسب طور پر کی ہے۔ انھوں نے اس مملکت کے غیرمسلم باشندوں کو یہ بتانا چاہا کہ اگر موجودہ قرارداد منظور ہوگئی تو اُن کے لیے پاکستان میں کوئی جگہ نہ ہوگی، مَیں اپنے معزز دوست کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ غیرمسلموں کے حقوق کی سب سے بڑی ضمانت اگر کوئی ہوسکتی ہے تو محض اس قرارداد کے تحت ہوسکتی ہے۔!

جب ہم زبان سے عدلِ عمرانی کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا مقصد عدل عمرانی ہی ہوتا ہے، اور جب ہم جمہوریت کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری مراد واقعی جمہوریت سے ہوتی ہے۔ اگرچہ میرے دوست کا نظریہ الگ ہے جیسا کہ انھوں نے مذکورہ نام نہاد علما کے حوالے سے بیان کیا کہ اسلام کو جمہوریت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام کے بڑے سے بڑے مخالف نے بھی ایسی حیرت انگیز بات نہیں کہی۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ساری دنیا کے غیرمسلموں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ صرف اسلامی معاشرہ ہی ایسا ہے جہاں صحیح معنوں میں جمہوریت موجود ہے۔!"

لیاقت علی خاں کی یہ تقریر بہت طویل تھی اور ہونی بھی چاہیئے تھے، لہٰذا اس کے اقتباسات کو بھی حد درجہ سعی اختصار کے باوجود کسی حد تک طویل ہونے سے میں نہ بچا سکا، لیکن لیاقت علی خاں کی اس تقریر نے صورت مسئلہ کی ایسی تنقیح کردی کہ صورت احوال آئینہ کی طرح واضح ہوگئی۔

اب مختصر طور پر لیاقت علی خان کے دورۂ امریکہ پر بھی میں روشنی ڈالوں گا، کیونکہ وہاں بھی انھوں اسلام کو اس کے صحیح آب و رنگ کے ساتھ پیش کرنے کا فریضہ بڑی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔

۲۹ راپریل ۱۹۵۰ء کو لیاقت علی خان امریکہ روانہ ہوئے۔

امریکہ میں لیاقت علی خان کا پُرتپاک استقبال ہوا، امریکہ نے انھیں یہ اعزاز بھی دیا کہ کانگریس کے سامنے تقریر کا موقع دیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا:

"اسلامی اصولوں کے مطابق جمہوریت، آزادی اور مساوات ہمارا مطمح نظر ہے، اسلام آزادیٔ ضمیر کا درس دیتا ہے اور مساوات کا علمبردار ہے۔ ایمانداری کے ساتھ ہر شخص کو اس کی صلاحیت اور دیانت داری کے مطابق اس کا صلہ دیتا ہے۔ اسلام ذاتی ملکیت کا قائل ہے، لیکن وہ ارتکاز زر کو پسند نہیں کرتا، غیر مساوی تقسیم دولت کا بھی وہ قائل نہیں۔ وہ ذات پات کا مخالف ہے، ہمارے ہاں پاپائیت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔!"

نیشنل پریس کلب کے اجتماع میں ایک ہزار سے زیادہ صحافیوں اور اخبار نویسوں کو لیاقت علی خاں نے مخاطب کیا، انھوں نے فرمایا:

"پاکستان میں ۸ کروڑ افراد کی اکثریت مسلمان ہے اور یہ اکثریت اسلامی طرزِ زندگی گذارنا چاہتی ہے۔ اسلام میں شہریت اور جمہوریت کے بنیادی اصول موجود ہیں۔!"

شکاگو کونسل برائے تعلقات خارجہ اور شکاگو کی مجلس صنعت و تجارت کے اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے لیاقت علی خان نے کہا:

"پاکستان کے عوام نے تہیہ کر لیا ہے کہ اسلام کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق اپنی زندگی گزاریں گے۔ اسلام کوئی نیا نظریہ اور اصول نہیں ہے، اس کی بنیاد چودہ سو برس پہلے رکھی گئی ہے۔ ہم جس عقیدے پر عامل ہیں، اگر دنیا اُس پر گامزن ہو جائے تو یقیناً آج گری ہوئی انسانیت پھر زندہ ہو جائے گی۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا انسان کی شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ نیز یہ کہ دنیا کا ہر انسان برابر ہے۔ ہمارا مذہب کسی دوسرے عقیدے کے لوگوں پر دباؤ نہیں ڈالتا، بلکہ صاف کہتا ہے۔" لکم دینکم ولی دین"

لاس اینجلز کے ایوان تجارت میں بھی لیاقت علی خان نے ایک اثر انگیز اور حیات آفرین تقریر میں اسلام کی ترجمانی کی۔ اس موقع پر لاس اینجلز کے میئر فیچر براؤن نے دو سو سرکردہ تاجروں، صناعوں، بینکرز، ماہرین زراعت اور ارباب ثروت سے لیاقت علی خان کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

"دنیا کی بہت سی ممتاز ہستیوں، شہزادوں، بادشاہوں، فرماں رواؤں، اور صدروں کا آپ حضرات سے تعارف کرانے کا شرف مجھے حاصل رہا ہے، لیکن مَیں نے آج تک اتنا فخر کبھی محسوس نہیں کیا، جتنا مسٹر لیاقت علی خاں کو آپ سے متعارف کرانے میں کر رہا ہوں، یہ بات دنیا کی نئی قوموں کی تاریخ میں بہت زیادہ نمایاں حیثیت رکھتی ہے، اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ نئی قوم جس کا طرز زندگی خود اپنا ہے۔ دنیا میں سچی آزادی اور جمہوریت کو قائم کر کے رہے گی۔!"

۵ مئی ۱۹۴۹ء کو امریکہ کے وزیر خارجہ مسٹر ڈین ایچی سن نے لیاقت علی خان کو ایک شاندار عشائیہ دیا۔ اس موقعہ پر دوسرے ممالک کے سفراء اور امریکہ کی سر برآوردہ ہستیاں موجود تھیں، لیاقت علی خاں کا جام صحت نوش کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

وزیر اعظم نے امریکہ میں جو نمایاں کامیابی لوگوں کا دل لبھا کر حاصل کی ہے میں اس کا عشر عشیر بھی حاصل کر لیتا، تو یہ سال میرے لیے فتح مبین کا سال ہوتا۔ امریکی اپنے آپ

کو قائد خیال کرتے ہیں، لیکن صحیح معنوں میں قیادت کا حق مسٹر لیاقت علی خاں کو ہے جو روز اول سے اپنی نئی قوم کو کامیاب و کامران بنانے کے لیے شبانہ روز جدوجہد میں مصروف ہیں، لیاقت علی خان ان مشکل ترین مسائل کو حل کر رہے ہیں جن کا احساس تو درکنار سمجھنا بھی مشکل ہے!"

اس تقریر کے ایک ایک لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک غیر اور بہت بڑے ملک کے وزیر خارجہ نے لیاقت علی خان کی فراست، سیاست، معاملہ فہمی، اور اسلام و جمہوریت کی ترجمانی کے بارے میں کتنی جچی تُلی رائے قائم کی اور کتنے شاندار الفاظ میں انھیں خراج تحسین پیش کیا۔

(۳) صدر ایوب کی "خود نوشت" میں جمہوری اور اسلامی تصوّرات کی جھلک : کسی ملک میں جب فوجی انقلاب آتا ہے تو سب سے پہلے جس چیز پر زد پڑتی ہے وہ جمہوریت ہوتی ہے۔ جمہوریت اور آمریت میں کوئی چیز بھی مابہ الاشتراک نہیں ہے۔ جمہوریت عبارت ہے عوام کی حاکمیت سے۔ اور آمریت عبارت ہے غیر مسئول بالادستی سے، جس طرح آگ اور پانی میں میل نہیں ہوسکتا، اسی طرح آمریت اور جمہوریت کے مابین اتحاد و اتفاق کی کوئی بنیاد تلاش نہیں کی جاسکتی۔

پاکستان کو بھی فوجی انقلاب سے دوچار ہونا پڑا جس کا لازمی نتیجہ آمریت مطلقہ اور جمہوری اقدار کی تخریبی صورت میں رونما ہو چاہیئے تھا، لیکن یہ بات حیرت انگیز اور میرے نزدیک تو قابل فخر بھی ہے کہ اس انقلاب کا قائد ایک لمحہ کے لیے بھی جمہوری اقدار سے منحرف نہیں ہوا، اور اس کے دل و دماغ میں جمہوریت کا تصوّر ہمیشہ کارفرما رہا، چنانچہ اس انقلاب سے تین سال پہلے لندن کے ایک ہوسٹل میں پاکستان میں غلط لوگوں کے ہاتھوں جمہوریت کو تباہ ہوتے دیکھ کر اس نے مستقبل کے پاکستان کا ایک دستوری خاکہ ۴ر اکتوبر ۵۴ء کو سرسری طور پر تیار کیا اور اسے قلمبند بھی کر لیا، اس خاکے میں اور برسر اقتدار آنے کے بعد عملی اقدامات

میں جمہوریت سے متعلق اختیار کردہ اصول و آئین کے اشکالی پہلوؤں سے قطع نظر کر کے اور بعض مزید غور طلب گوشوں کو نظر انداز کر کے اگر دیکھا جائے تو اس خوشگوار حقیقت کا احساس کیا گیا، حتیٰ کہ مذکورہ خاکے میں جو کسی کے مشورے کے بغیر محض ذاتی خیالات و تصوّرات کا آئینہ دار تھا، ہم یہ الفاظ دیکھتے ہیں:

"اس بات کو جتا دینا مناسب ہو گا کہ ہمارا مقصد بہر صورت پاکستان میں جمہوریت کا قیام ہونا چاہیے۔!"

پھر آگے چل کر اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مجلس قانون ساز کابینہ کو چُنے گی، کابینہ کی کارروائیوں پر گورنر قابو رکھے گا اور گورنر پر ملک کا سربراہ یعنی صدر قابو رکھے گا۔" (ص - ۳۱۱)

کسی خالص جمہوری ملک میں بھی جمہوریت کا آب و رنگ کچھ اسی قسم کا ہوا کرتا ہے۔

اس کے بعد حق رائے دہی کا سوال سامنے آتا ہے جو جمہوریت کا کلیدی اور اساسی نکتہ ہے، اس سلسلے میں لکھا ہے:

"ہمہ گیر حق رائے دہی (یعنی بالغ حق رائے دہی) کا جو قاعدہ بن چکا ہے اس سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔!" (ص ۳۱۲)

ایک ملک کا کمانڈر انچیف، اگر اپنے ذہن میں جمہوریت کا خاکہ اس طرح کا تیار کرتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اسے جمہوریت کی خوش بختی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر قائداعظم سے لے کر قائد ملّت تک وفاقی نظام کو فروغ جمہوریت کے لیے لازمی قرار دیتے رہے ہیں۔ اس خاکے میں یہ چیز اور زیادہ فیاضی کے ساتھ نظر آتی ہے:

"صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دی جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جن محکموں کے اختیارات انھیں پہلے سے حاصل ہیں ان میں مواصلات

صنعت و حرفت، تجارت، صحت وغیرہ کا اور اضافہ کیا جائے۔ دفاع، امور خارجہ اور کرنسی مرکزی حکومت کے پاس رہے۔!" (ص ۳۱۴)

اور اس خاکے کا خالق جب برسر اقتدار آیا تو اس نے اس پر عمل بھی کر دکھایا۔ حالانکہ عام طور پر اقتدار اور اختیارات حاصل کرنے کے بعد، پچھلے نظریات فرسودہ ہو جایا کرتے ہیں۔

تحریک پاکستان کے وقت سے قیام پاکستان تک جو نعرہ زبان زدِ خاص و عام رہا، اور جو وعدے اس تحریک کے رہنماؤں نے ملّت سے کیے، نیز تواتر اور تسلسل کے ساتھ جس وعدے کا اعادہ کیا وہ یہ تھا کہ پاکستان کی جمہوریت "اسلامی" ہوگی، اس لیے کہ پاکستان کی بنیاد و اساس یہی چیز تھی۔ فوجی لوگ عام طور پر اپنے راستے میں کسی کو آڑے نہیں دیتے نہ کہ اسلام کو، جو قدم قدم پر احتساب اور مواخذہ کرتا رہتا ہے، لیکن اس خاکے میں جو بالکل نجی حیثیت میں ذاتی طور پر تیار کیا گیا تھا اور جس میں سیاست کی ایچ پیچ نہ تھی بلکہ قلب و ضمیر کی آواز کارفرما تھی ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں:

"ہر شخص یہ کہتا رہا کہ ملک میں اسلامی جمہوریت رائج کی جائے، مگر یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اس کی نوعیت کیا ہوگی، اور وہ عام جمہوریت سے کن باتوں سے مختلف ہوگی تو پھر کیا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ کوئی بھی جمہوریت جس پر قرآن کی روح کے مطابق عمل کیا جائے اسلامی ہو سکتی ہے، ہم جمہوریت کا یہ تصوّر قبول کر لیں تو شاید بہتر ہو اور ہم بہت سی اونچ نیچ سے بچے رہیں۔ (ص ۳۱۵)

ایک سرسری خاکے میں "اسلامی جمہوریت" کو اصولی طور پر قبول کر لینا یقیناً اسلامی ذہن و دماغ کا عکاس ہے۔

مذکورہ خاکہ کی آخری سطریں یہ ہیں:

"دعا کی جائے کہ اس آئین پر قرآن کی روح کے مطابق عمل کیا جا سکے، اگر ایسا ہوا تو ہماری یک جہتی اور طاقت ــــ اور ہمارا مستقبل شاندار ہوگا۔!" (ص ۳۱۷)

یہ آخری سطریں اپنے اندر معنویت کے ساتھ ساتھ خلوص کا جوہر بھی رکھتی ہیں۔

اس خاکے کا مصنّف تین سال کے بعد یعنی اکتوبر ۱۹۵۷ء میں، فوجی انقلاب کے قائد کی حیثیت سے سربراہِ مملکت بن گیا، بالعموم ہوتا یہ ہے کہ برسرِ اقتدار آنے سے پہلے اور برسرِ اقتدار آنے کے بعد پچھلے تصورات وخیالات و طاقِ نسیاں ہوجایا کرتے ہیں، اور قوت، کا نشہ ہر نطق و کلام کو آئین اور قانون بنا دیتا ہے۔ مگر فوجی انقلاب کے اس قائد نے ایسا نہیں کیا، وہ پچھلے خیالات و تصورات سے نہ صرف یک سرِ مو منحرف نہیں ہوا، بلکہ ان میں اور زیادہ جِلا پیدا کردی۔ نہ جمہوریت کسی مرحلے پر اس کی نظر سے اوجھل ہونے پائی، نہ اسلامیت، ان دونوں کو سمو کر اس نے اپنے لیے راہِ عمل متعین کی، چنانچہ اس کی خود نوشت میں لکھتے ہیں:

"جس قدر ارفع و اعلیٰ نظریۂ حیات ہوگا، افراد اور معاشرے کا کردار بھی اتنا ہی بلند ہوگا۔ ہمیں ایک ایسا ہی نظریۂ حیات حاصل ہے، اور وہ اسلام ہے، اسی بنیاد پر ہم نے پاکستان کے لیے جد و جہد کی، اور اسے حاصل کیا، لیکن پاکستان کے حصول کے بعد ہم اپنی زندگی اس کے مطابق ڈھال نہیں سکے۔!" (ص ۳۲۵)

ایسا کیوں ہوا؟ اس کی حقیقت آفرین تشریح بھی سُن لیجیے:

"اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے اس نظریۂ حیات کو سادہ اور عام فہم انداز میں پیش نہ کرسکے، اس کے ساتھ ہی ہم اپنی لاعلمی کے باعث اسلامی نظریۂ حیات کو تعصّب اور ملائیت کا ہم معنیٰ تصوّر کرنے لگے اور ہمیں در پردہ اس سے حجاب آنے لگا!"

پھر آگے چل کر تشریح مزید بایں الفاظ:

"اسلام کے نظریۂ حیات کی وضاحت کے لیے، نیز زمانہ حال کے کوائف بالخصوص پاکستان کے کوائف پر اس کا اطلاق کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے مختصر نکات کو وضاحت کے ساتھ پیش کردیا جائے"

(الف) توحیدِ الٰہی: انسان کے فکر و عمل کے ذریعہ خدائی محبت کے اظہار

کا جذبہ۔

(ب) سب انسان خدا کی نظر میں برابر ہیں۔

(ج) اگر مذہب کے لازمی اجزا یہی ہیں تو مذہب کو دنیوی اور دینی دونوں معاملوں میں دخل ہوگا۔

(د) یہ دنیا اس لیے نہیں ہے کہ اس سے حذر کیا جائے، لہٰذا اپنی تخلیقی قوتوں کی نشو و نما کے لیے علوم جدیدہ کی تعلیم ہماری لازمی ضرورت ہے۔

(ھ) ریاست اور فرد کے فرائض کی وضاحت کی جائے، مومن کی تعریف بیان کی جائے۔

(و) فرد کے بنیادی حقوق بیان کیے جائیں۔

(ز) موجودہ اور آئندہ نسلوں کو اس فرض سے روشناس کرانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔''

ان نکات کا ذکر کرنے کے بعد:

''اس کام کا ذمہ کون لیتا؟ مجھے تو اس کی ہمت نہ پڑ سکتی تھی کیونکہ مجھے اپنی کوتاہیوں کا احساس تھا، ہمارے لیے لازمی تھا کہ تقاضائے ایمان اور تقاضائے وقت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کریں۔

ہر شخص متفق تھا کہ ملک کا آئین جمہوری ہونا چاہیئے، ایک ایسا آئین جس کی مدد سے قوم اسلام کے لازمی اصول و ضوابط کے مطابق اپنی تنظیم کر سکے، سوال یہ تھا کہ آئین کے جمہوری لوازم کا فیصلہ اور اسلام کے ضروری اصول و ضوابط کی تشریح کس کو کرنی چاہیے؟''

یہ بڑا، اہم اور نازک سوال تھا، اس کا جواب انتہائی تدبّر، معاملہ فہمی، دُور اندیشی اور خالص اسلامی ذہنیت کے ساتھ یہ دیا گیا ہے:

''ملک کے آئین کو اسلامی حیثیت دینے کے بارے میں، میں نے جو لازمی فیصلہ کیا وہ یہ تھا کہ ان اصول و ضوابط کے تعین کی ذمے داری قوم ہی کو سونپ

دینی چاہیے، آئین ایک ایسا ڈھانچہ مہیا کرے جس کی بنیاد اسلامی تاریخ اور تجربے پر ہو۔ لیکن اس ڈھانچے میں رہ کر قوم کو پوری آزادی ہو کہ وہ اپنے لیے کتاب و سنت سے اصول اور ضابطے اخذ کر سکے، اور ان اصول و ضوابط کو برتنے کے طریقے خود اصول جمہوریت اور اصول اسلام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی بھی ایک صورت تھی۔!" (ص ۳۲۵-۳۲۸)

بلاشبہ یہ اصول خالص جمہوری بھی ہے اور خالص اسلامی بھی۔ کسی نقطۂ نظر سے اس پر اعتراض وارد نہیں کیا جا سکتا۔

آگے چل کر ایک اور نہایت اہم اور فکر آفرین بات اس خود نوشت میں ملتی ہے:

"زمانۂ حال میں متعدد اسلامی ملکوں نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق آئین وضع کیے، لیکن یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ آئین اسلامی ہیں جنھیں تمام اسلامی ملک اپنا سکتے ہیں، مجھ پر یہ بات واضح تھی کہ پاکستان کو اسلام کے اصول و ضوابط کا اپنے حالات کے مطابق اطلاق کرنا ہی ہوگا۔ نیز یہ بات بھی کہ یہ کام مسلمہ جمہوری اصول کی حدود میں ہونا چاہیے، جن میں سے ایک نہایت اہم اصول ملکی معاملات میں عوام کی شرکت ہے۔ ملک کے کاروبار کو چلانے میں مجموعی حیثیت سے عوام کے حق کو نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے، اور نہ اس میں تخفیف ہو سکتی ہے کسی شخص یا گروہ کو خواہ وہ کتنا ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہو، یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ پوری قوم کی مرضی کے خلاف فتویٰ دے دے جس کا اظہار قوم نے اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعہ کیا ہو اس سے مقننہ کی برتری مسلم ہو جاتی ہے اور یہ امر بھی مسلم ہو جاتا ہے کہ قوم کو اپنی مرضی کے مطابق اپنے نمائندوں، اور ارکان حکومت کو چننے کی آزادی ہونی چاہیئے، اس بات کے اطمینان کے لیے کہ عاملہ اور منتظمہ اپنے اپنے فرائض آئین کے اصول کے مطابق انجام دے رہی ہیں۔ ایک آزاد عدلیہ کا وجود لازم آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انتظامات کے اس تمام منصوبے میں علمائے دین کی کسی

جماعت اعلیٰ کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی جو مقننہ اور عدلیہ پر ویٹو کی طاقت استعمال کر سکے۔

"ان امور میں، میں نے اجماع کے مسئلے سے استفادہ کیا ہے جو اسلام کا ایک خاص اصول ہے، چنانچہ میں نے جو آئینی انتظامات کیے ان میں یہ بات قوم کے نمائندوں پر چھوڑ دی کہ وہ کتاب و سنت سے تعلق رکھنے والے معاملات میں اپنی رائے کس طرح قائم کریں گے۔ میں نے ضروری سمجھا کہ مقننہ کے مشورے کے لیے ایک اسلامی مشاورتی کونسل بنائی جائے جس کی پشت پر تحقیقات اسلامی کا ادارہ ہوگا جو مقننہ کو اسلامی نظریوں کی بنیاد پر قوانین وضع کرنے میں مدد دے سکے اس کونسل میں صرف عالمانِ دین ہی کو شامل نہیں کیا گیا بلکہ ایسے اشخاص کو بھی جو ملک کے اقتصادی، سیاسی، قانونی اور مالی مسائل کی سوجھ بوجھ رکھتے ہوں؛ تاکہ اسلام کے مطالبوں اور وقت کے حالات کے تقاضوں میں مطابقت پیدا کی جا سکے۔!" (ص ۳۲۸ — ۳۳۰)

آگے چل کر اس خود نوشت میں بعض دوسرے متعلقہ امور و مسائل پر نتیجہ خیز اور تاریخی گفتگو کرنے کے بعد ہمیں وہ بات ملتی ہے جو صرف اسلامی ذہن ہی میں ابھر سکتی ہے:

"تمام حاکمیت اللہ ہی کو حاصل ہے لیکن اس کے فضل و کرم سے ایک اسلامی ریاست کے عوام کو یہ توفیق حاصل ہے کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق اپنے معاملات کا انتظام و انصرام کر سکیں، ان کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے نمائندوں کے ذریعہ منظم طریق پر رفاہ عامہ کے لیے قوانین وضع کر سکیں، اور اُن کے پاس مناسب منتظمہ ہونی چاہیئے جو ان قوانین کو نافذ کرا سکے، نیز ایک آزاد عدلیہ جو حکم لگا سکے کہ مقننہ اور منتظمہ اپنے اپنے فرائض آئین کے مندرجات کے مطابق دے رہے ہیں یا نہیں؟

(ص ۳۳۶)

حقیقت یہ ہے کہ اس خود نوشت کے بعض مندرجات ممکن ہے بعض مکاتب

فکر کے لیے کسی حد تک بحث طلب ہوں، لیکن جہاں تک جمہوری اور اسلامی تصورات کا تعلق ہے - وہ قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں، خالی الذہن ہو کر، اور جماعتی تعصّب سے بے نیاز ہو کر اگر ان پر غور کیا جائے تو یہ ہر اس ملک کے لیے جو اسلامی آئین بنانا چاہتا ہو دلیل راہ، اور سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں -

چند مزید مباحث کے بعد، خود نوشت میں کہا گیا ہے:

"تاریخ اسلام اور مختلف اسلامی ممالک کے آئین کے مطالعہ سے دو باتیں ظاہر ہوئیں، اوّل یہ کہ اسلام میں بادشاہت کی کوئی گنجائش نہیں - اور جانشینی میراث کی بنیاد پر متعین نہیں کی جا سکتی - دوسرے یہ کہ عوام کو من حیث القوم اپنا سربراہ چننے کا اور خود اسے برطرف کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیئے تاریخ اسلام کی رُو سے ایک اور تسلیم شدہ امر یہ ہے کہ جب قوم اپنا سردار چن لے تو اسے معقول اختیار حاصل ہو کہ وہ حکومت کے کاروبار میں ہم آہنگی پیدا کر سکے!

(ص ۲۳۷)

مذکورہ بالا سطور میں جو تین باتیں پیش کی گئی ہیں، وہ تاریخ اسلام کی ایک مسلمہ حقیقت ہیں - ان کی اہمیّت اور حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا! اسلامی جمہوریت میں بس یہی تین باتیں ہیں - اگر کسی دستور اور آئین میں یہ امور سہ گانہ موجود ہیں تو اسے اسلامی دستور کے سوا کسی اور نام سے یاد نہیں کیا جا سکتا -

مَیں نے اپنی کتاب جب لکھی تھی، اس وقت تک اس خود نوشت کا کوئی چرچا نہیں تھا - کتاب کی تکمیل کے چھ ماہ بعد، یہ خود نوشت منظرِ عام پر آئی - اور مجھے یہ دیکھ بے انتہا مسرت ہوئی کہ آئین پاکستان کی اسلامیت اور جمہوریت کے بارے میں صدر مملکت نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان کے پیش نظر اگر میں یہ کہوں کہ میری کتاب خود نوشت کے اجمال کی تاریخی استناد کے ساتھ تفصیل ہے تو شاید یہ نہ مبالغہ ہوگا، نہ خود ستائی! ٭

---

(۱۸)

پاکستان کا دستوری ارتقاء

جمہوریت اور اسلامیت کے ساتھ ساتھ!

۱۹۴۷ء میں قانون آزادی Independence Act کے مطابق دو حکومتیں عالم وجود میں آ گئیں:

۱- بھارت ۲- پاکستان

اسی قانون کے مطابق غیر منقسم ہندوستان کی مجلس دستور ساز کی تقسیم بھی عمل میں آئی۔ جو ممبر پاکستانی علاقے سے تعلق رکھتے تھے، اُن پر مشتمل پاکستان کی مجلس دستور ساز قائم ہو گئی۔

پاکستان کی مجلس دستور ساز نے تشکیل دستور کے سلسلے میں دو سال تک کوئی خاص کامیابی نہیں حاصل کی۔ البتہ مارچ ۱۹۴۹ء میں اس نے قرارداد مقاصد منظور کی۔ اس قرارداد میں واضح کیا گیا تھا کہ:

۱- حاکمیت صرف خدا کی ہے۔

۲- جس پر عمل درآمد کتاب و سنت کی روشنی میں کیا جائے گا۔

۳- پاکستانی حکومت کا نظم و نسق اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہو گا جنھیں عوام نے منتخب کیا ہو گا۔

۴- اقلیتوں کو مکمل شہری حقوق حاصل ہوں گے۔

۵- پس ماندہ اور پست Backward Depressed Class طبقات کے جائز مفادات کا تحفظ کیا جائے گا۔

۶ - عدلیہ پورے طور آزاد ہوگی -

۲۱ نومبر کو بنیادی اصولوں کی سب کمیٹی نے عبوری رپورٹ Interim Report پیش کی، جس میں سفارش کی گئی تھی کہ :

۱ - سربراہِ مملکت کا انتخاب پاکستان کے دونوں ایوان کریں گے -

۲ - کابینہ مرکزی ایوان کے سامنے جواب دہ ہوگی -

۳ - سربراہ مملکت جزئی یا کلی پر ہنگامی حالات میں دستور کو معطل کر سکتا ہے -

۴ - یہ ضروری نہیں ہے کہ سربراہِ مسلمان ہی ہو، غیر مسلم بھی ہو سکتا ہے -

۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو خواجہ ناظم الدین نے جو اب لیاقت علی خاں کی جگہ پاکستان کے وزیر اعظم تھے، دستور ساز اسمبلی کے سامنے بنیادی اصولوں Basic principles کی رپورٹ رکھی، اس رپورٹ میں سفارش کی گئی تھی کہ :

۱ - پاکستان کی حکومت دو ایوانوں —— ایوانِ زیریں اور ایوان بالا —— پر مشتمل ہوگی لیکن وہ صرف ایوان زیریں کے سامنے جواب دہ ہوگی -

۲ - علماء کا ایک بورڈ قائم کیا جائے جس کا فریضہ یہ ہوگا کہ اس امر پہ نظر رکھے کہ مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کی طرف سے جو قوانین منظور ہوں وہ اسلام کے اصولوں یعنی کتاب وسنت کے منافی نہ ہوں -

اسی اثناء میں گورنر جنرل نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت برطرف کردی - اور مسٹر محمد علی بوگرا کو وزیر اعظم بنادیا -

۳ - مسٹر محمد علی بوگرا نے مغربی اور مشرقی پاکستان کے مابین مساوات کا اصول تسلیم کر دیا -

۴ - نیا انتخاب کرایا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کو زبردست شکست سے دوچار ہونا پڑا، اور نتیجۃً خود مسٹر محمد علی بوگرا کی وزارت عظمیٰ بھی بہت جلد ختم ہوگئی -

۵۔ مشرقی پاکستان کے جدید ممبروں نے دستوریہ کے قدیم ممبران دستوریہ کی نمائندہ حیثیت پر اعتراض کیا، اور مطالبہ کیا کہ یا تو دستوریہ منسوخ کر دی جائے یا کم از کم مشرقی پاکستان سے دستوریہ کے نئے ممبر لیے جائیں۔

۶۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۵۴ء کو اس امر کے پیشِ نظر کہ گورنر جنرل کو دستوری معاملات میں مداخلت کا موقعہ نہ مل سکے مسٹر اے کے بروہی نے ایک مسودہ قانون The Constitution Amendment Act پیش کیا۔ جس میں تجویز کی گئی تھی کہ جہاں تک دستور سازی کا تعلق ہے۔ دستوریہ مکمل طور پر آزاد اور خود مختار ہے۔ پاکستان کی تمام عدالتوں اور وفاقی عدالت Federal Court کو مجاز قرار دیا گیا کہ دستوریہ کا بنایا ہوا دستور اگر کسی اقدام سے متاثر ہوتا نظر آئے تو اس کی جواب طلبی کر سکیں، یا اسے غیر قانونی قرار دے سکیں۔

۷۔ دستوریہ نے اور بھی کئی قوانین گورنر جنرل کے خصوصی اختیارات کو زیادہ سے زیادہ محدود کرنے کے لیے وضع کیے۔

۸۔ ان مراحل سے فراغت کے بعد دستوریہ نے بنیادی اصولوں کی رپورٹ ——— جس کا ذکر آ چکا ہے ——— ۲۹ فروری سے منظور کر لی۔

۹۔ وزیر اعظم نے دستوریہ میں اعلان کیا کہ ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء سے پہلے پہلے مجوزہ دستور کے مسودے پر بحث و مباحثہ ختم ہو جائے گا، اور نیا دستور قائد اعظم کی سالگرہ کے دن منظور کر لیا جائے گا۔ یہ اعلان بھی کیا کہ یکم جنوری ۱۹۵۵ء کو پاکستان ری پبلک بن جائے گا۔

۱۰۔ بعد ازاں ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء تک کے لیے دستوریہ برخاست ہو گئی، بنیادی اصولوں کی رپورٹ، ماہرین دستور آئین پر مشتمل Drafting Committee کو بھیج دی گئی۔

۱۱۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو دستور کا مسودہ طباعت کے لیے بھیج دیا گیا تاکہ

۲۷ دسمبر کے اجلاس دستوریہ کے موقع پر وہ ممبران کے ہاتھوں میں ہو۔
یہ تھا، پاکستان کے دستوری ارتقاء کا پہلا روز!

مولا بالا تفصیلات سے جہاں ممبران دستوریہ اور گورنر جنرل کی باہمی نزاع و تصادم کی اندوہناک حقیقت نظر کے سامنے آتی ہے وہاں اس طوفانِ گرد و باد میں چند ایسی حقیقتیں ہیں جو کسی طرح بھی نظر سے اوجھل نہیں ہو سکتیں، ایسی حقیقتیں اگر متوازن ہوں تو انھیں عین مقتضائے جمہوریت کہنا ذرا مبالغہ نہیں ہوگا۔ وہ حقیقتیں یہ ہیں:

۱۔ حالات کے ساتھ ساتھ ایوانِ نمائندگان کے کلّی یا کچھ ممبران کی نمائندہ حیثیت میں تبدیلی، اور اس تبدیلی کے پیش نظر نئے اقدامات کا مطالبہ۔

۲۔ اقلیتوں کے لیے ان تمام حقوق کا تحفظ جو پاکستان کے تمام شہریوں کو یکساں طور پر حاصل ہوں گے۔

۳۔ عدلیہ کی آزادی کا احترام۔

۴۔ کتاب و سنت کی روشنی میں، صوبائی اور مرکزی مجالس قانون ساز کے قوانین کی ایک مجلس (بورڈ) علما کی طرف سے جانچ پڑتال۔

۵۔ دستوریہ کی مکمل آزادی اور خود مختاری کی سعی و کوشش۔

پاکستان کے دستوری ارتقاء کا دوسرا دور، ۲۴ راکتوبر ۱۹۵۴ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب گورنر جنرل نے پرانی دستوریہ کو منسوخ کر دیا، اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ:

۱۔ "مجلس دستور ساز عوامی اعتماد سے محروم ہو چکی ہے۔ لہذا نئے انتخابات، ناگزیر ہیں۔

۲۔ نئی وزارت میں اسکندر مرزا، ڈاکٹر خان صاحب اور سہروردی بھی شریک کر لیے گئے۔

۳۔ مولوی تمیز الدین خان نے جو منسوخ دستوریہ کے اسپیکر تھے چیف کورٹ

میں گورنر جنرل کے اعلامیہ کی قانونی حیثیت کو چیلنج کیا۔ سندھ چیف کورٹ کے فل بنچ نے متفقہ طور پر مولوی تمیز الدین کے حق میں، اور حکومت کے خلاف فیصلہ دیا۔ حکومت نے فیڈرل کورٹ میں اپیل کی جسے اس نے منظور کر لیا۔

۴۔ گورنر جنرل نے ایک نامزد مجلس آئین ساز بلانے کا فیصلہ کیا، لیکن فیڈرل کورٹ کی ہدایت پر یہ فیصلہ واپس لے کر ۲۸ مئی ۱۹۵۵ء کو دوسری دستور کے لیے ممبروں کے انتخاب کے احکام صادر کیے۔

۵۔ اس انتخاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی دستور یہ میں مسلم لیگ کو صرف ۲۵ نشستیں حاصل ہوئیں، ۱۶ نشستیں متحدہ محاذ کو ملیں، اور ۱۳ عوامی لیگ کو اقلیتوں نے ۱۱ نشستیں حاصل کیں، ۷ ممبروں نے آزادانہ انتخاب جیتا۔

۶۔ دستور یہ کا پہلا اجلاس جولائی ۱۹۵۵ء میں بمقام مری منعقد ہوا لیکن بعض وجوہ سے ملتوی ہو گیا۔ دوسرا اجلاس اگست میں ہوا۔ ۸ جنوری ۱۹۵۶ء کو حکومت نے مجوزہ مسودۂ دستور شائع کر دیا۔ دستور یہ میں اسے وزیر قانون مسٹر چندریگر نے پیش کیا۔ ۲۹ فروری ۱۹۵۶ء کو دستور منظور کر لیا گیا، طے یہ ہوا کہ اس کا نفاذ ۲۳ مارچ کو یوم پاکستان کے موقع پر کیا جائے، اور ۲۳ مارچ کو یہ نافذ ہو گیا۔

اس دستور کے خصوصیات کیا تھے؟ ایک سرسری نظر اس پر بھی ڈال لی جائے:

۱۔ دستور میں وضاحت کر دی گئی کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔ پاکستانی قوم اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعہ اس امانت کو بروئے کار لائے گی۔ اور تمام باشندگان پاکستان کو مساوی انسانی حقوق حاصل ہوں گے۔

۲۔ ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ کو دستور کا محافظ اور ترجمان Guardian and interpreter of constitution قرار دیا گیا۔ انھیں "رٹ" کی سماعت کا اختیار دیا گیا، اور یہ حق دیا گیا کہ مرکزی یا صوبائی اسمبلی کے کسی قانون یا اقدام کو اگر خلاف دستور پائیں تو اس کے ناجائز ہونے کا اعلان کر دیں۔

۳۔ بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی۔

پاکستان کے دستوری ارتقاء کا یہ دوسرا دور بھی اس حقیقت کا غماز ہے کہ امرِ الٰہی کی بالادستی، عوام کے منتخب نمائندوں کا ہر معاملے میں حق توثیق و تنسیخ مجلس قانون ساز کے سامنے وزارت کی جواب دہی حکومت کے ہر اقدام کے خلاف عدالت عالیہ میں "رٹ" کا حق نہایت واضح الفاظ میں تسلیم کیا گیا تھا۔ یعنی اسلامیت اور جمہوریت اس دستور کی بھی خصوصیت تھی۔

اب پاکستان کے دستوری ارتقاء کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔

۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو صدر مملکت میجر جنرل اسکندر مرزا نے مجالس قانون ساز کو برخاست کر دیا۔ مرکزی اور صوبائی وزارتوں کو برطرف کر دیا، اور سارے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا، اور فیلڈ مارشل ایوب خان کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، اور وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ ۲۷ اکتوبر کو وہ اپنے منصب سے دست بردار ہو گئے اور فیلڈ مارشل ایوب خاں نے صدر مملکت کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔

۱۷ فروری ۱۹۶۰ء کو نئے صدر مملکت نے سر شہاب الدین سابق چیف جسٹس آف پاکستان کی سرکردگی میں ایک کمیشن قائم کیا، جسے پاکستان کے نئے دستور سے متعلق سفارشات پیش کرنے کا کام سونپ گیا۔

کمیشن نے ۲۹ اپریل ۱۹۶۱ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی، جس کے بعد پاکستان کے نئے دستور کا مسودہ تیار کیا گیا، اور ۸ جون ۱۹۶۲ء کو اسے نافذ کر دیا گیا۔

چونکہ یہ پاکستان کا سب سے آخری دستور ہے۔ اس لیے اس کے اہم حصص ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اسلامیت اور جمہوریت کے بنیادی اصولوں کو اس دستور میں بھی پورے طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ابتدائیہ قابل ملاحظہ ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

"چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلا شرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور جمہور کا اختیار ایک مقدس امانت ہے۔

اور چونکہ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے جمہور کی منشاء کا اظہار کرتے

ہوئے اعلان فرمایا تھا کہ پاکستان عدل عمرانی کے اسلامی اصولوں پر مبنی ایک جمہوری مملکت ہوگی۔

اور چونکہ پاکستان کے جمہور کا منشا ہے کہ:

(۱) مملکت اپنے اختیارات اقتدار جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ استعمال کرے۔

(ب) جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصولوں کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے پاکستان میں پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

(ج) پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی اسلامی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق ترتیب دینے کے قابل بنایا جائے۔

(د) پاکستان کی اقلیتوں کے جائز حقوق کا — بہ شمول ان کے مذہبی اور ثقافتی حقوق کے — قرار واقعی تحفظ کیا جائے۔

(ھ) بنیادی انسانی حقوق کا — بہ شمول قانون کی نظر میں مساوات، خیال، اظہار رائے، عقیدے اور مذہب اور اجتماع کی آزادی اور سماجی اقتصادی اور سیاسی مساوات کے حقوق کے مملکت کی سلامتی کا عوام کے مفاد، اور اخلاقی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تحفظ کیا جائے۔ اور

(و) عدلیہ کی آزادی کا تحفظ کیا جائے۔

اس کے بعد اصلی دستور شروع ہوتا ہے۔ اس دستور کی پہلی ہی دفعہ پاکستان کی جمہوریت کا آئینہ دار ہے چنانچہ پہلی دفعہ کے الفاظ یہ ہیں:

"مملکت پاکستان ایک جمہوریہ ہوگی جس کا نام جمہوریہ پاکستان ہوگا!"

جمہوریت کی ایک ضرب لازم یہ ہے کہ سب کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کیا جائے اور قانون میں کسی کے لیے امتیاز روا نہ ہو، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں دوسری دفعہ کے الفاظ یہ ہیں:

"ہر شہری کا خواہ وہ کہیں بھی ہو، اور ہر اس شخص کا جو فی الوقت پاکستان میں

میں موجود ہو، یہ ذاتی حق ہے، اس کو قانون کی حفاظت حاصل ہو، اور "قانون" اور محض قانون کے مطابق حاصل ہو، اس کے ساتھ سلوک کیا جائے۔

اس دستور میں قانون سازی کے اصول بھی بتائے گئے ہیں اور وہ اس درجہ صاف اور واضح ہیں جو ہر طرح کے شک اور شبہے سے ماورا ہیں۔

صدیوں کے تجربے اور مشاہدے کے بعد قانون سازی کے جو اصول دنیا نے بنائے ہیں وہ اسلام نے ۱۴ سو برس پہلے وضع کر دیئے تھے۔ پاکستان کے دستور میں انہی اصولوں کو سختی اور شدت کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا ہے، اور جمہوریت و اسلامیت کا اس خوبی کے ساتھ امتزاج کیا گیا ہے کہ دونوں میں سے کسی کا بھی دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ مثلاً:

"کوئی قانون اسلام کے خلاف نہ ہوگا" (دفعہ ۱۔ قانون سازی کے اصول)

اس کے علاوہ:

"ہر شہری قانون کی نظر میں برابر ہوگا، ہر ایک کو قانونی تحفظ حاصل ہوگا، اور ہر ایک کے ساتھ ہر لحاظ سے مساوی سلوک کیا جائے گا" (دفعہ ۲)

ساتھ ہی ساتھ:

"کوئی قانون کسی شہری کی اظہار خیال کی آزادی پر کوئی پابندی نہیں عائد کرے گا۔ (دفعہ ۳)

نیز: "کوئی قانون شہریوں کے پُرامن اور غیر مسلح ہونے پر یا انجمنیں اور یونینیں بنانے کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرے گا" (دفعہ ۱۴)

علاوہ ازیں:

"کوئی قانون کسی شہری کے کسی جگہ آنے جانے کی یا پاکستان کے کسی حصہ میں سکونت اختیار کرنے یا آباد ہونے کی، یا پاکستان کے کسی حصے میں املاک حاصل کرنے، اپنے قبضے میں رکھنے یا فروخت کرنے کی آزادی پر کوئی پابندی عائد نہیں کرے گا (دفعہ ۱۵)

مندرجہ بالا امور کے علاوہ :
"کوئی قانون کسی شہری کی کوئی پیشہ، حرفہ، تجارت، کاروبار یا ملازمت اختیار کرنے یا اپنی مرضی کا کوئی اور کام کرنے کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں عائد کرے گا۔ (دفعہ ۶)

ماسوا امور بالا کے :
: "کسی مذہبی فرقے یا گروہ کے افراد کو اپنے مذہب پر عقیدہ رکھنے، اس پر عمل کرنے یا اس کی تبلیغ کرنے یا اس کی تعلیم دینے سے یا اپنی مذہبی اغراض کے لیے، یا اپنے مذہب سے متعلق ادارے قائم کرنے سے نہیں روکے گا۔"
: کسی شخص کو ایسی مذہبی تعلیم حاصل کرنے یا ایسی مذہبی تقریب یا عبادت میں شریک ہونے پر مجبور نہیں کرے گا جو اس کے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب سے تعلق رکھتی ہو۔
کسی شخص پر کوئی ایسا ٹیکس نہیں لگائے گا جس کی آمدنی اس کے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب یا فرقے پر صرف کی جائے۔
: کسی ٹیکس سے مستثنیٰ کرنے یا مراعات دینے کے لیے مذہبی اداروں کے درمیان کوئی امتیاز قائم نہ کرے گا۔
: سرکاری رقوم کو کسی خاص مذہبی فرقے یا گروہ کے مفاد کے لیے صرف کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ ماسوا ان رقوم کے جو اسی مقصد کے لیے حاصل کی گئی ہوں۔(دفعہ ۷)۔

علاوہ بریں :
" جو قانون افراد کی نظر بندی یا گرفتاری کا اختیار دیتا ہو اس میں اس امر کا التزام رکھا جائے گا کہ اس قانون کے تحت جو شخص گرفتار یا نظر بند کیا جائے۔
: اسے گرفتار یا نظر بند کرتے وقت یا اس کے بعد جلد از جلد اس کی گرفتاری یا نظر بندی کی وجوہات اسے بتادی جائیں۔
: گرفتار یا نظر بند کرنے کے بعد چوبیس گھنٹے کے اندر اندر قریبی مجسٹریٹ کے

سامنے پیش کیا جائے۔

مذکورہ میعاد ختم ہونے کے بعد اسے رہائی دیا جائے، تاوقتیکہ کوئی مجسٹریٹ اس کی حراست کی میعاد میں مزید توسیع کا اختیار نہ دے دے۔

: اسے اپنی مرضی کے وکیل سے مشورہ لینے اور اپنا مختار بنانے اور اس سے مقدمے کی پیروی کرانے کی (دفعہ ۱۸)

اور یہ بھی کہ:

کسی شخص کو ایسے فعل یا ترک فعل کی سزا کا مستوجب نہ قرار دے گا جو اس جرم کے ارتکاب کے وقت کسی قانون کے تحت قابل سزا نہ تھا۔

: کسی شخص کو کسی جرم کی ایسی سزا کا مستوجب قرار نہ دے گا جو اس جرم کے ارتکاب کے وقت کسی قانون کی رو سے مقررکردہ سزا سے زیادہ سخت ہو یا اس سے مختلف ہو۔ (دفعہ ۹)

اور: "کوئی قانون سرکاری اغراض کے سوا کسی املاک کے جبری حصول یا قبضے میں لینے کا اختیار نہ دے گا۔

: جو قانون کسی املاک کے جبری حصول یا قبضے کا اختیار دے گا، اس میں املاک کے معاوضے کی ادائیگی کے احکام ہوں گے اور باقی معاوضے کی رقم کا تعین اور توضیح، یا ان اصولوں کے اور قاعدوں کی صراحت کر دی جائے جن کی بنا پر معاوضے کا تعین کیا جائے گا۔ (دفعہ ۱۰)

چند اور باتیں:

: کوئی قانون کسی صورت میں جبری مشقت کو جائز قرار نہیں دے گا۔ (دفعہ ۱۱)

: کوئی قانون کسی شہری کو نسل کے مذہب، ذات پات، یا جائے پیدائش کی بنا پر ایسے تعلیمی ادارے میں حصول تعلیم کے حق سے محروم نہ کر دے گا، جسے سرکاری محاصل سے امداد ملتی ہو۔ (دفعہ ۱۲)

: کوئی قانون قوم کے کسی طبقے کو اس کی اپنی مخصوص زبان اور رسم الخط کے استعمال

سے یا ثقافت سے محروم نہیں کرے گا۔ (دفعہ ۱۴)

: کوئی قانون پاکستان میں غلامی کی اجازت یا اس کے لیے کسی قسم کی سہولت نہیں دے گا۔ (دفعہ ۱۵)

: کوئی قانون پاکستان میں چھوت چھات کی اجازت یا اس کے لیے کسی قسم کی سہولت نہیں دے گا۔ (دفعہ ۱۶)

دستور پاکستان میں پالیسی کے جو اصول وضع کیے گئے ہیں، اُن سب پر بحث وگفتگو تو ممکن نہیں، لیکن چند اگر پیش نظر رہیں تو اچھا ہے:

۱۔ "پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی زندگی اسلام کے اصولوں اور تصورات کے مطابق ڈھال سکیں، اور انھیں ایسی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں جن کی مدد سے وہ ان اصولوں اور تصورات کے مطابق زندگی گذارنے کا مفہوم سمجھ لیں۔

۲۔ پاکستان کے مسلمانوں کے لیے قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔

۳۔ پاکستان کے مسلمانوں میں اتحاد اور اسلام کے اخلاقی معیار کو روبہ عمل لانے کی مساعی کو فروغ دیا جائے۔

۴۔ زکوٰۃ، اوقاف اور مساجد کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔"!

کسی قوم کی ترقی اور عروج سے ہمکنار کرنے کے لیے ازبس ضروری ہے کہ اس میں تعلیم کو عام کیا جائے، اور قوم کے ہر فرد کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ چنانچہ پاکستان کے دستور نے اس مشکل کو بھی حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً دستور میں وضاحت کے ساتھ کہا گیا ہے:

"ناخواندگی کا خاتمہ کر دیا جائے اور جس قدر جلد ممکن ہو تمام لوگوں کے لیے مفت اور لازمی ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔"!

بنیادی ضروریات کے بارے میں بھی دستور پاکستان خاموش نہیں ہے۔

چنانچہ اس نے تسلیم کیا ہے:

" زندگی کی بنیادی ضروریات - مثلاً روٹی، کپڑا، مکان تعلیم اور علاج کی سہولتیں ان شہریوں کے لیے بلاتفریق ذات و مذہب و نسل فراہم کی جائیں جو کمزوری، بیماری، معذوری یا بے روزگاری کے باعث عارضی یا مستقل طور پر اپنی روزی کمانے کے قابل نہ ہوں - "!

موجودہ زمانے میں سود ایک ایسی ناگزیر ضرورت بن گیا ہے جس سے کسی حالت میں مفر نہیں - ہم لاکھ سود سے نفرت کریں، سود لینے یا دینے سے احتراز کریں لیکن ہمارے علم و اطلاع کے بغیر ہماری ہر استعمالی چیز میں کسی نہ کسی چیز میں کہیں نہ کسی سودے میں، کسی نہ کسی طور پر بالواسطہ یا بلاواسطہ سود شامل ہوتا ہے۔

پاکستان ایک " اسلامی " جمہوریت ہے، ممکن نہ تھا وہ اس مسئلہ کو نظر انداز کر دیتی، یا اسلامی ہونے کے باوجود اسلامی احکام و اوامر سے اعراض کرتی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں، پاکستان کے نئے دستور اساسی نے اس کٹھن مسئلہ پر بھی لب کشائی کی ہے:

" ربا (سود) کا استیصال کیا جائے "

کیا یہ " ہدایت " اطمینان بخش نہیں ہے؟ کامل طور پر اطمینان بخش نہیں ہے؟

اسی طرح: بدکرداری (زنا وغیرہ) اور مسکرات کے استعمال کا مسئلہ بھی ہے چنانچہ دستور میں مرقوم ہے:

" زناکاری، جوئے بازی اور ضرر رساں ادویات کے استعمال سے نفرت دلانا -

شراب پینے سے (بھی) نفرت دلائی جائے - "!

صدارت جمہوریہ کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے - لیاقت علی خان کے زمانے میں دستوریہ نے اس کی گنجائش رکھی تھی کہ غیر مسلم صدر مملکت بن سکتا ہے اور اس پر اعتراض کیا گیا تو مرحوم نے ایک دلچسپ وضاحتی تقریر بھی فرمائی تھی، اور

مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ان کے خیالات کچھ نہ کچھ وزن رکھتے تھے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ اصولوں کو بے لچک ہونا چاہیے۔ اس باب میں خوفِ لومۃ لائم سے بے نیاز ہوکر اس کا اعلان بھی کرنا چاہیے اور ان پر عمل بھی کرنا چاہیے۔

چنانچہ اسلامی جمہوریۂ پاکستان نے یہ بات صاف کردی ہے اور اپنے دستور میں وضاحت کردی ہے کہ:

"پاکستان کا صدر صرف ایسا شخص منتخب کیا جائے گا جو مسلمان ہو!"

از روئے دستور، اس وقت ملک میں دو اسلامی ادارے، سرکاری طور پر قائم ہیں۔ ایک "اسلامی مشاورتی کونسل" اور دوسرا "مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی"۔

اول الذکر کا کام یہ ہے کہ صوبائی یا مرکزی حکومت کو ایسے مسائل میں جن کے اسلامی یا غیر اسلامی امور سے متعلق استصواب کیا جائے، یا اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت طلب کی جائے۔ ایک مدت معینہ کے اندر جسے وہ خود معین کرے گی، حکومت کو اپنے افکار و آراء سے مطلع کر دے گی۔ آخر الذکر کا کام یہ ہے کہ "اسلام اور اسلامی تعلیم کی تحقیق کرے جس سے صحیح اسلامی بنیاد پر مسلم معاشرے کی تشکیل جدید میں مدد ملے۔" اس کی کارگذاری پر تبصرہ کرنا اس کتاب کا موضوع نہیں لیکن بنیاد کے احسن ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

اسلامی مشاورتی کونسل بالکل بے جان ہو جائے گی، اگر اس کے ممبران کو آزادیٔ گفتار نہ حاصل ہو، اور بغیر کسی خوف اور اندیشے کے وہ اپنا نقطۂ نظر نہ پیش کر سکیں۔ دستور نے یہ بات محسوس کی ہے اور اس کے تحفظ کا پورا پورا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ وہ تحفظ یا بندوبست یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ممبران میں سے کسی کا اخراج اگر اس کی روش نامرغوب اور ناپسندیدہ ہو۔ صرف ممبران کونسل ہی کے ہاتھ میں ہے کسی اور کو اس میں ذرا بھی دخل نہ ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں دستور کے الفاظ یہ ہیں:

"اگر کونسل کے ممبران کی کل تعداد کی اکثریت کسی ممبر کو کونسل کی رکنیت سے برطرف کرنے کی قرارداد منظور کرے تو صدر مذکورہ ممبر کو برطرف کر سکتا ہے۔ لیکن کسی دوسری

صورت میں کسی ممبر کو ہرگز برطرف نہ کیا جائے گا۔

یہ باب ختم کرنے سے پہلے میں حلف وفاداری کے الفاظ درج کرنا چاہتا ہوں جو صدر، گورنر، اسپیکر، ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے جج ممبر سروس کمیشن، چیف الیکشن کمشنر اور مرکزی یا صوبائی اسمبلی کے ممبر، نیز آڈیٹر جنرل وغیرہ کو اپنا منصب سنبھالنے سے پہلے اٹھانا پڑتا ہے۔

صدر کے حلف وفاداری کے الفاظ درج ذیل ہیں:

۱۔ "میں مسمی ——— خدا کو حاضر ناظر جان کر حلف اٹھاتا ہوں کہ میں صدق دل سے پاکستان کا حامی اور وفادار رہوں گا۔

۲۔ صدر پاکستان کی حیثیت سے میں ایمان داری کے ساتھ دستور اور قانون کے مطابق حتی المقدور اپنے فرائض ادا کروں گا، اور اپنے کارہائے منصبی انجام دوں گا، اور ہمیشہ پاکستان کے استحکام، سالمیت، خوش حالی اور بہبود کو مدنظر رکھوں گا۔

۳۔ میں اپنے ذاتی مفاد کو اپنے سرکاری کام یا اپنے سرکاری فیصلوں پر ہرگز اثرانداز نہ ہونے دوں گا۔

۴۔ میں دستور ھذا کو برقرار رکھوں گا اور اس کی حفاظت وحمایت کروں گا۔

۵۔ ہر حالت میں ہر شخص کے ساتھ بلاخوف و رعایت اور بلا الفت و عداوت قانون کے مطابق انصاف کروں گا۔

اس حلف میں تین چیزیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اور اگر موجودہ دستور سے پہلے کے دساتیر میں ان پر عمل درآمد ہوتا رہا ہوتا تو شاید کسی انقلاب کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ تین چیزیں جن کا صدر نے حلف اٹھایا ہے یہ ہیں:

۱۔ "خدا کو حاضر ناظر جان کر۔"

اس طرح یہ معاملہ خدا اور بندے کا معاملہ ہو گیا۔

۲- ہر کام کی انجام دہی۔"دستور اور قانون کے مطابق"
اس طرح دوست نوازی، خویش پروری اور غلط بخشی کا دروازہ بند ہو گیا۔
۳- دستور ہذا کی برقراری، اور اس کی حمایت وحفاظت کا عہد!
اس طرح ایوان صدر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سازش اور سرگوشی سے نجات پا گیا۔
ان تین چیزوں کے بعد مملکت کا نظم ونسق اطمینان کے ساتھ چلانا اور برقرار رکھنا، اور اسے ہر طرح کی دراندازیوں اور سازشوں سے محفوظ کر لینا حد درجہ آسان ہو گیا۔

اس دستور نے ملک کو ایک اچھا نظام ہی نہیں دیا ہے بلکہ اس کے تحفظ اور قائم وبرقرار رکھنے کا سروسامان بھی بہم پہنچا دیا ہے۔ پاکستان کو اس چیز کی ضرورت تھی۔ الحمدللہ کہ وہ حاصل ہو گئی۔

صدر کے علاوہ گورنر صوبہ، جج ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ، وزیر، اسپیکر، ڈپٹی اسپیکر، ممبر اسمبلی، ممبر انتخابی ادارہ، چیف الیکشن کمشنر، آڈیٹر جنرل، ممبر پبلک سروس کمیشن وغیرہ کے حلف ناموں کی بھی تقریباً یہی عبارت ہے۔ اور ان سب میں قدر مشترک یہ الفاظ ہیں:

"میں دستور ہذا کو برقرار رکھوں گا، اور اس کی حفاظت وحمایت کروں گا"

استدراک:

گذشتہ دو[2] ابواب میں صراحت اور وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ قائد اعظم سے لے کر صدر ایوب تک جملہ سربراہان مملکت نے خواہ ان کی حیثیت وزیر اعظم کی ہو یا صدر مملکت کی۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اس تصور سے روگردانی نہیں کی، کہ
۱- پاکستان ایک "اسلامی جمہوریہ" ہے۔

۲- جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان کا نظامِ حکومت لازماً اسلامی ہونا چاہیے -
۳- یہاں کتاب و سنت کی حکومت ہوگی -
۴- اور نص کے خلاف کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا -
۵- اگر پہلے سے کوئی قانون وضع ہو چکا ہے، بدل دیا جائے گا -

اسی طرح اب تک پاکستان میں دستور سازی کے تین مراحل ہمارے سامنے ہیں :

۱- عہدِ قائدِ اعظم کی مجلس دستور ساز، جو اپنا کام ختم نہ کر سکی، اور برخاست کر دی گئی -

۲- دوسری مجلس دستور ساز جو فیڈرل کورٹ کے فیصلے کے نتیجے میں وجود پذیر ہوئی اور جس نے ایک دستور مرتب کیا اور اسے نافذ بھی کر دیا -

۳- مارشل لاء کے دور میں صدر کا اپنے رفقاء کار کے مشورے اور تعاون سے منظور کیا ہوا دستور جو اس وقت ملک میں نافذ ہے -

ان تینوں مرحلوں پر ایک نظر غائر ڈالیے تو آپ محسوس کریں گے کہ ہر مرحلے پر، بغیر کسی اختلاف کے جو چیز بالکل طے شدہ سمجھی جاتی رہی، اور جس پر کسی قسم کا اعتراض وارد نہیں کیا گیا، وہ "اسلامیت" ہے

ہر دستور نے اس امر کی ضمانت دی ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہوگا- اور یہاں قرآن و سنت کے مطابق حکومت کی جائے گی - منکرات سے احتراز کیا جائے گا- اور اوامر کی پیروی کی جائے گی-

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ صرف پاکستان کے عوام ہی نہیں خواص بھی اسلام اور اسلامیت سے بیزار اور بیگانہ نہیں ہیں - یہ بہت بڑی بات ہے ، اتنی بڑی جو دوسرے اسلامی ملکوں کے باعثِ رشک ہو سکتی ہے -

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے، اور اس کا نظامِ مملکت کسی حالت میں بھی اسلامیت سے منقطع نہیں ہو سکتا تو کیا وجہ ہے کہ یہاں اسلامیت کی وہ جھلک نظر نہیں آتی جو ایک اسلامی مملکت کا طرۂ امتیاز ہونا چاہیے -

اس کا سیدھا اور صاف جواب تو یہ ہے کہ ہر قوم منزلِ مقصود تک دو مرحلوں میں پہنچا کرتی ہے۔

پہلا مرحلہ ہوتا ہے فکر و نظر کا۔

دوسرا مرحلہ ہوتا ہے اقدام و عمل کا۔

بہت عرصے تک ہم پہلے مرحلے میں داخل رہے اب ہمارا قافلہ دوسرے مرحلے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد اس سلسلے میں کوئی سوال تشنۂ جواب نہیں رہ جائے گا۔ وہ مبارک ساعت کچھ ایسی زیادہ دور نہیں، جس وقت پاکستان کا شمار "خیرِ امت" میں ہو گا، اور جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے کر رہے گی۔

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

فہرست مطبوعات

مجموعۂ تفاسیر ابومسلم اصفہانی از سید نصیر شاہ و محمد رفیع اللہ
گلستانِ حدیث از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی
انتخابِ حدیث از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی
مقامِ سنت از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی
معارف الحدیث از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی
مسئلہ اجتہاد از مولانا محمد حنیف ندوی
اجتہادی مسائل از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی
کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی
مسئلۂ تعدد ازدواج از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی
ازدواجی زندگی کے لیے اہم قانونی تجاویز از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی
چند ازدواجی مسائل از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی
اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی
برصغیر پاک وہند میں علمِ فقہ از مولانا محمد اسحاق بھٹی
فقہ عمر از ابویحییٰ امام خاں نوشہروی
رویتِ ہلال از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی
مقالات از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی
اسلام اور موسیقی از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی
قوانین اسلامی کا نفاذ قرآن وسنت کی روشنی میں۔ از سید یعقوب شاہ
اسلام اور فطرت از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی
دینِ فطرت از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی
اسلام — دین آسان از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی
اسلام کا نظریۂ حیات از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

مقامِ انسانیت از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

عقائد و اعمال از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

اسلام کی بنیادی حقیقتیں از رفقائے ادارہ

مجمع البحرین (شیعہ سنی متفق علیہ احادیث) از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

روحِ اسلام اردو ترجمہ "سپرٹ آف اسلام" (سید امیر علی) از محمد ہادی حسین

اساسیات اسلام از مولانا محمد حنیف ندوی

کلامِ حکیم (مجموعہ کلام ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم) مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

سکھ مسلم تاریخ حقیقت کے آئینے میں از ابوالامان امرتسری

گورو گرنتھ صاحب اور اسلام از ابوالامان امرتسری

اسلام اور مذاہبِ عالم از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

پیغمبر انسانیت از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

حیات محمد از محمد حسین ہیکل - اردو ترجمہ از ابو یحییٰ امام خاں

تاریخ دولتِ فاطمیہ از مولانا رئیس احمد جعفری

زیر دستوں کی آقائی اردو ترجمہ "الوعد الحق" (طہٰ حسین) از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

مآثر لاہور از سید ہاشمی فرید آبادی

اسلام کا نظریۂ تاریخ از مولانا مظہر الدین صدیقی

مسلمانوں کے عقاید و افکار اردو ترجمہ "مقالات الاسلامیین" (امام اشعری) از مولانا محمد حنیف ندوی

حصہ اوّل ، حصہ دوم

تصوراتِ عرب قبل از اسلام از مولانا عبید اللہ قدسی

الفہرست اردو ترجمہ "کتاب الفہرست" (ابن الندیم وراق) از مولانا محمد اسحاق بھٹی

الفخری اردو ترجمہ از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

پاکستانی مسلمانوں کے رسوم و رواج از شاہد حسین رزاقی

اسلام اور رواداری از مولانا رئیس احمد جعفری - جلد دوم

اسلام اور عدل و احسان از مولانا رئیس احمد جعفری

مسلم ثقافت ہندوستان میں از مولانا عبدالمجید سالک

تہذیب و تمدّن اسلامی از مولانا رشید اختر ندوی حصہ اوّل حصہ دوم حصہ سوم

فقہائے ہند جلد اول از مولانا محمد اسحاق بھٹی

اسلام میں حیثیتِ نسواں از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

عقلیات ابن تیمیہ از مولانا محمد حنیف ندوی

سرسیّد اور اصلاحِ معاشرہ از شاہد حسین رزاقی

افکار ابن خلدون از مولانا محمد حنیف ندوی

مشاہیر اسلام از خواجہ عباد اللہ اختر

بیدل از خواجہ عباد اللہ اختر

مقالاتِ حکیم مجموعہ مضامین ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم۔ مرتبہ شاہد حسین رزاقی۔ حصّہ اوّل اسلامیات

حصّہ دوم اقبالیات حصّہ سوم متفرقات

موسیقی کی شرعی حیثیت از سیّد نصیر شاہ و رفیع اللہ

تعلیمات غزالی از مولانا محمد حنیف ندوی

افکارِ غزالی از مولانا محمد حنیف ندوی

سرگزشت غزالی اردو ترجمہ "المنقذ من الضلال" (امام غزالی) از مولانا محمد حنیف ندوی

حکمتِ رومی از ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

تشبیہاتِ رومی از ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

ملفوظاتِ رومی اردو ترجمہ "فیہ مافیہ" از عبد الرشید تبسّم

اقبال کا نظریۂ اخلاق از پروفیسر سعید احمد رفیق

تہافۃ الفلاسفہ از مولانا محمد حنیف ندوی

انڈونیشیا از شاہد حسین رزاقی

اسلام اور تعمیر شخصیت از میاں عبد الرشید

حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق از بشیر احمد ڈار

اسلام کا نظریۂ اخلاق از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

اسلام میں حریت، مساوات، اخوت از خواجہ عباد اللہ اختر

اسلام اور حقوقِ انسانی از خواجہ عباد اللہ اختر

سیاستِ شرعیہ از مولانا رئیس احمد جعفری

تاریخ جمہوریت از شاہد حسین رزاقی

مسلمانوں کے سیاسی افکار از پروفیسر رشید احمد

اسلامی جمہوریت از مولانا رئیس احمد جعفری

چند فکر انگیز مطبوعات

چند معاشی مسائل اور اسلام از سید یعقوب شاہ

فاضل مصنف (سابق آڈیٹر جنرل اور وزیر مالیات حکومت مغربی پاکستان) اقتصادیات کے بھی ماہر ہیں اور دینی علوم سے بھی شغف رکھتے ہیں - اس کتاب میں اُنھوں نے ربٰو، زکوۃ اور بیمہ جیسے زندہ اور اہم مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور کتاب و سنت، تاریخ و عمرانیات اور اقتصادیات کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد اپنے نتائجِ فکر سلیس انداز میں پیش کیے ہیں -

صفحات ۲۵۹ - قیمت اعلیٰ اڈیشن 6/50 روپے

قسم دوم -/5 روپے

مسلمانوں کے عقاید و افکار

یعنی

مقالات الاسلامیین

علامہ ابوالحسن اشعری کی شہرہ آفاق کتاب کے پہلے حصے کا اُردو ترجمہ از مولانا محمد حنیف ندوی مع مقدمہ و مفصل حواشی واشاریہ -

علامہ موصوف چوتھی صدی ہجری کی ایک جلیل القدر شخصیت ہیں - اُنھوں نے مسلسل چالیس برس تک اعتزال و جہمیت کی فتنہ سامانیوں کا شکار رہنے کے باوجود اپنے لیے فکر و تعمق اور اجتہاد و کلام کا ایک علیحدہ اور منفرد دبستان سجایا -

''مقالات الاسلامیین'' علامہ کا وہ علمی شاہکار ہے جس کو افکار و نظریات کا دائرۃ المعارف کہنا چاہیے - اس میں اُنھوں نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے اُن تمام افکار و عقاید کو بغیر کسی تعصب کے بیان کر دیا ہے جو صدیوں سے ہمارے ہاں کے فکری و کلامی مناظروں کا محور بنے رہے - اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے نفسیات، اخلاق اور مادہ و روح کے بارے میں کن کن علمی جواہر پاروں کی تخلیق کی اور یہ حقیقت بھی نکھر کر سامنے آئے گی کہ ماضی میں فکر و نظر کی کجی نے کن کن گمراہیوں کو جنم دیا ہے اور ان گمراہیوں کے مقابلے میں اسلام نے کس معجزانہ انداز سے اپنے وجود کو قائم اور بر قرار رکھا ہے -

صفحات ۴۸ + ۳۷۲ — قیمت -/10 روپے

ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور